
لمحہ لمحہ خوف لمحہ لمحہ موت
فرار ہونے کے بعد
مقبول جہانگیر

چند باتیں

اس مجموعے میں اُن کہانیوں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے جو گزشتہ دس برسوں میں میں نے پاکستان کے مختلف ڈائجسٹوں میں جنگِ عظیم کے موضوع پر انگریزی کتابوں اور رسالوں سے ترجمہ کرکے چھپوائی تھیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے اثرات اس قدر ہمہ گیر، دُور رس، بھیانک اور ولولہ انگیز تھے کہ آج بھی دُنیا بھر میں اس موضوع پر روزانہ نت نئی کتابیں اور مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ اگرچہ اس لٹریچر کی بڑی مقدار فکشن پر مشتمل ہے اور یہ فکشن "اتحادی طاقتوں" کی طرف سے مسلسل شائع کیا جا رہا ہے اور پوری دنیا میں شوق اور دلچسپی سے پڑھا جا رہا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ جو کتاب بھی آپ اُٹھائیں گے، اُس کا موضوع یہی ہوگا کہ اتحادی بڑے چالاک، نہایت ہوشیار اور حد درجہ بہادر اور جری تھے، اس کے برعکس جرمن بڑے مغرور، بڑے کوتاہ اندیش، بہت ظالم، نہایت عیّار اور بے وقوف ثابت ہوئے وغیرہ وغیرہ۔ واقعہ یہ ہے کہ جرمنوں کی دہشت ابھی تک اتحادیوں کے دل و دماغ پر بیٹھی ہوئی ہے اور اِس قسم کا لٹریچر چھاپنے سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ نہیں چاہتے کہ جرمن دوبارہ اُن کے خلاف کبھی اُٹھ کھڑے ہوں؛ چنانچہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر جرمنوں سے خائف ہیں اور اُن کی مخالفت میں کتابیں شائع کر کر کے اپنی تسکین کا سامان بہم پہنچا رہے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں دوسری جنگِ عظیم میں جرمن ہائی کمان کے بعض غلط فیصلوں کے باعث جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور جرمنوں نے جیتی ہوئی بازی ہار دی؛ تاہم دنیا نے دیکھا کہ جرمنوں نے بہرحال اتحادیوں کے چھکے چھڑا دیے۔ اس کتاب میں زیادہ تر وہ ایڈونچر شامل ہیں جن کا تعلق جرمنوں کی قید سے فرار ہونے والے اتحادی سپاہیوں سے ہے۔

میں نے جن انگریزی کتابوں یا رسالوں سے انہیں لیا ہے اُن کا دعویٰ تھا کہ یہ سب واقعات سچے ہیں، ممکن ہے سچے ہی ہوں، چونکہ ہمارے پاس انہیں جھٹلانے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے؛ تاہم ان واقعات کی کامل صداقت پر زور بھی نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ "فکشن" جس رفتار سے لکھا جا رہا ہے اُس نے حقیقت کو بھی افسانہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ خود ہم نے ستمبر ۶۵ء میں بھارت سے جو جنگ لڑی اور ہماری بہادر فوجوں نے سرفروشی اور جاں نثاری کے جو عظیم کارنامے دکھلائے، اُس نے پوری دنیا کو انگشت بدنداں کر دیا تھا۔ اگرچہ بدقسمتی سے بعض "اہلِ قلم" حضرات نے ان سچے واقعات کو بھی افسانہ بنا دینے کی کوشش فرمائی ہے، اور یہ مذموم کوششیں ابھی تک جاری ہیں۔ گزشتہ دنوں مجھ سے خود ایک جنرل صاحب نے تاسف بھرے لہجے میں کہا کہ ہمارے سپاہیوں اور افسروں نے ۶۵ء کی جنگ میں جو کچھ کیا ہے، اگر اس کے سچے واقعات ہی لکھے جائیں تو "فکشن" لکھنے کی ضرورت نہ رہے۔

بہرحال آپ اس کتاب کو "مہم جوئی" کے موضوع سے متعلق ایک کتاب سمجھ کر پڑھیے اور اگر یہ آپ کو دلچسپ نظر آئے تو مترجم کے حق میں دعائے خیر فرمایئے۔

مقبول جہانگیر

عنوانات

اِسی مُصنِف کے قلم سے

آنائی کے آدم خور وحشی

زندہ ممی

ہیبت ناک افسانے

فرار ہونے کے بعد

فن کار قاتل

پاگل خانہ

روسی جرنیل کی پُراسرار موت

عقابوں کی وادی

پانچ خوفناک کہانیاں

سُنہری مکڑی

ناقابلِ فراموش

یہ جنگل یہ درندے

موت کے ساتھی

جانباز جاسوس

ایک خطرناک مہم

۱۸ ستمبر ۱۹۴۲ء کی ایک رات کا ذکر ہے۔ ناروے، سویڈن اور ڈنمارک کے ساحلوں کے درمیان تکونی شکل کا سمندر خاموش اور اداس تھا۔ اگرچہ ساحلی علاقوں پر چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد تھیں، لیکن روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہ دیتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ساحلی علاقے صدیوں سے ویران پڑے ہیں۔ دفعتہً سمندر کے وسطی حصّے میں اونچی اونچی لہریں اٹھنے لگیں اور طوفان کی سی کیفیت نمودار ہوئی۔ آہستہ آہستہ جھاگ کی سفید اور دبیز تہہ پانی پر پھیلتی چلی گئی اور پھر بھاپ کے بادل پانی کی سطح پر ابھرنے لگے۔ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی تاریکی میں جھاگ کی اس سفید اور دبیز تہہ میں سے ایک برطانوی آب دوز "ڈائنٹ لیس" پانی کی سطح پر نمودار ہوئی۔ اس وقت آبدوز سمندر کے متلاطم پانی پر ایک بہت بڑی وھیل مچھلی کی طرح تیر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد آب دوز کے کوننگ ٹاور سے نکل کر تین چار ملّاح اس کے عرشے پر اِدھر اُدھر دوڑنے لگے اور انھوں نے دوربینیں اپنی آنکھوں سے لگالیں۔ وہ نہایت ہوشیاری سے سمندر کا جائزہ لے رہے تھے۔ ہر طرف ہُو کا عالم اور ہولناک تاریکی مسلط تھی۔ فضا بالکل ویران اور اداس اداس —— آسمان کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے بادلوں کے آوارہ ٹکڑے رفتہ رفتہ سمٹتے جا رہے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر میں بارش ہونے والی ہے۔ ملّاحوں کو جب اچھی طرح اطمینان ہوگیا کہ دور دور تک کوئی خطرہ نہیں تو اُن میں سے ایک ملّاح عرشے سے غائب ہوگیا۔ غالباً وہ آب دوز کشتی کے کمانڈر کو اطلاع دینے گیا تھا۔ فی الفور ملّاحوں کا ایک دوسرا دستہ اس فولادی مچھلی کے پُشتے پر بنے ہوئے ایک گنبد نما چبوترے

کی طرف دوڑا۔ ایک ملاح نے اس کی ڈھلوان دیوار میں لگی ہوئی آہنی چرخی کو گھمایا جس سے ہوا بند پٹ خود بخود کھل گئے۔ اور دو ملاحوں نے اس گنبد کے اندر رکھی ہوئی کشتی کو باہر دھکیلا اور پھر اسے گھسیٹتے ہوئے عرشے کے کنارے کی طرف لے گئے۔ چند لمحے بعد وہ اس کشتی کو سمندر میں اتارنے کے لئے آہستہ آہستہ نیچے لٹکا رہے تھے۔ چند منٹ بعد کشتی پانی کے اوپر ہچکولے کھا رہی تھی۔

اتنے میں آب دوز کا اندرونی الارم بجنے لگا اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ عرشے پر آیا اور اس کشتی کو بغور دیکھنے لگا جو مجھے ایک خطرناک ترین اور یادگار مہم پر لے جانے کے لئے عنقریب روانہ ہونے والی تھی۔ کھلی فضا میں سانس لیتے ہی میرے پژمردہ اعصاب میں جیسے جان پڑ گئی۔ تازہ ہوا کے نم دار جھونکوں کی لطافت نے میرے ذہن پر سحر انگیز اثر کیا۔ اور جب میں نے ضروری سامان سے بھرے ہوتے واٹر پروف سیاہ تھیلے کو اپنے کندھے پر رکھ کر سمندر کا جائزہ لیا تو فضا کی بلندی اور سطح آب کی متلاطم وسعت میں پھیلی ہوئی خاموشی اور بھیانک تاریکی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ اگرچہ میں ذہنی و جسمانی طور پر اس مہم کے لئے اچھی طرح تیار تھا لیکن اس کے باوجود خوف کی ایک ہلکی سی جھرجھری محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے اپنے لباس کا جائزہ لیا، بند گلے کا دبیز اونی سویٹر، اس کے اوپر چرمی جیکٹ، بہترین گرم پتلون، جس کے پائنچے میں نے واٹر پروف سیاہ جوتوں میں ٹھونس رکھے تھے۔ یہ لباس پیش آنے والے موسم کے عین مطابق تھا، مگر اس غیر متوقع جھرجھری نے مجھے یہ احساس دلایا کہ یہ لباس بھی ناکافی ہے۔ میں نے اس ناگوار احساس کو ذہن سے نکالنے کے لئے دائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی ملاحی ٹوپی کو اپنی ران پر جھٹکا ہی تھا کہ کسی نے آہستہ سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو آب دوز کا کپتان ڈونلڈ کھڑا مسکرا رہا تھا اوپر سے نیچے تک مجھے بغور دیکھتے ہوئے وہ میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"کھو مکی! سب کچھ لے لیا؟"

"جی ہاں! میں نے تمام ضروری چیزیں لے لی ہیں۔"

"موسم تمہارے سفر کے تقاضوں کے عین مطابق ہے، مگر تم کچھ کھوئے کھوئے سے نظر آتے ہو۔ کیا بات ہے؟"

میں اس کا جواب کیا دیتا؟ ہم دونوں چند لمحے خاموش کھڑے رہے۔ ہمارے قریب سے گذرتے ہوئے ملاحوں کے قدموں کی چاپ سن کر وہ چونکا اور کہنے لگا:

"اچھا اب چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ کپاس وغیرہ تم نے رکھ لی ہوگی" ہم جب عرشے کے کنارے کھڑے تھے تو کپتان نے میرے کندھے کو مشفقانہ انداز سے تھپکی دی اور بولا:

"ہالسوار کلی میکلسن! تمہارا کام انتہائی اہم ہے۔ تمہیں اس کے اندر چھپے ہوئے خطروں اور مصائب کا بھی خوب علم ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ تم اپنے مشن میں کامیاب ہو جاؤ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے فرض سے غافل نہ رہو گے ——— خدا تمہاری مدد کرے ——— میرا خیال ہے کہ ناروے کا ساحل یہاں سے دس درجے جنوب کی طرف کوئی ساٹھ میل دور ہے۔ موسم اگر اسی طرح خوشگوار رہا تو تم بہت جلد منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤ گے۔"

کپتان کے ان الفاظ نے میری بڑی ہمت بندھائی اور جب میں کشتی میں سوار ہونے کے لئے ریلنگ کی فولادی زنجیروں کو پھلانگ رہا تھا تو کپتان نے پھر بلند آواز سے کہا:

"جاؤ میرے عزیز دوست! مادرِ وطن کی سالمیت کے تقاضے تمہاری روانگی کے منتظر ہیں۔" اور کپتان کے ان الفاظ کے ساتھ ہی میں کشتی میں سوار ہو چکا تھا۔ کشتی آبدوز سے علیحدہ کر دی گئی، اور میں اُسے آہستہ آہستہ جنوب کی طرف لے جانے لگا۔ کشتی میں بیٹھتے ہی میری ذہنی یکسوئی کا خاتمہ ہو گیا اور صدہا خیالات میرے دماغ میں گردش کرنے لگے۔ معاً کپتان کی گرج دار آواز میرے کانوں میں آئی۔ وہ آبدوز کو غوطہ لگانے کا حکم دے رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے "ڈانٹ لیس" میری نظروں کے سامنے سے غائب ہو گئی۔ پانی کے اندر جاتے ہی سمندر کی سطح پر بلبلوں اور سفید جھاگ کی دبیز تہہ نمودار ہوئی اور لہروں میں جوش پیدا ہو گیا۔ اب میری کشتی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ چپوؤں کی شپ شپ اور ہوا کی

شائیں شائیں سے میرے ذہن میں اس مہم کے ابتدائی مراحل کی تصویریں گھومنے لگیں۔

۱۹۴۱ء میں جب لام بندی کا آغاز ہوا تو بھرتی کرنے کا ایک خاص فوجی دستہ ریاست واشنگٹن میں واقع ہمارے گاؤں اوکانوگن ہائی لینڈ میں آیا جہاں میں اپنے باپ کے ساتھ کھیتوں پر کام کرتا تھا۔ میری صحت اچھی، قد چھ فٹ تین انچ اور وزن دو سو چونتیس پونڈ تھا، لیکن میں کھیتوں پر کام کرنے سے گھبراتا تھا۔ فوجی بھرتی کی خبر نے میرے دل میں ولولہ اور جوش و خروش بھر دیا۔ میں اگلے ہی روز کیمپ میں گیا اور اپنا نام پیش کر دیا۔ میرے والد مدت ہوئی ناروے سے ہجرت کر کے امریکہ کی اس سرسبز ریاست میں مستقل سکونت اختیار کر چکے تھے۔ وہ مجھے فوجی وردی میں دیکھ کر خوش تو ہوئے، مگر اچھے خاصے صحت مند ہونے کے باوجود وہ اس روز بہت ضعیف نظر آتے تھے۔ بہرحال میں اپنی فوجی زندگی کے سہانے سپنوں میں کھویا ہوا فوجی بھرتی کے خاص دستے کے ساتھ ہو لیا۔

ہیڈکوارٹر میں پہنچتے ہی ہمیں مختلف گروہوں میں بانٹ دیا گیا اور میں نے جلد ہی اپنے آپ کو نئے تقاضوں کے مطابق ڈھال لیا۔ دست بدست لڑائی کا فن میں نے تھوڑے ہی عرصے میں سیکھ لیا اور اشتیاق کے باعث میں نے لڑائی کے اور بہت سے اصول بھی ذہن نشین کر لیے۔ ایک دن ہمیں محاذِ جنگ پر بھیج دیئے جانے کے احکام آ گئے۔ میرا گروپ جزبی کیرولینا میں واقع فورٹ براگ میں متعین ہوا۔

۱۹۴۲ء کی چھ اپریل کا ذکر ہے۔ دن بھر کے معمولات سے برسرِپیکار رہنے کے بعد جب میں اپنی بارک میں آیا تو مجھے کیپٹن میگھی کے روبرو فوراً پیش ہونے کا حکم ملا۔ کیپٹن میگھی تھا تو میرا افسر لیکن مجھے اس کی صورت سے نفرت تھی اور وہ بھی مجھ سے بیزار تھا۔ بہرحال حکم تھا اور اس سے سرتابی کی مجال نہ تھی۔ پس میں ذہن میں کیپٹن میگھی کی منحوس شخصیت پر نفریں کرتا ہوا اُس کے کمرے کی طرف چل دیا۔ اندر داخل ہوتے ہی میں نے جان بوجھ کر خوب زور سے ایڑیاں بجا کر سلیوٹ کیا، مگر اس ہونق نے میری آمد کی ذرہ برابر پروا نہ کی اور میز پر رکھے ہوئے کاغذوں کے پلندے کو مسلسل گھورتا رہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد سر اٹھائے بغیر ہی بولا:

"میرے پاس ایک اہم کام ہے، جس کے لئے رضاکارانہ خدمت کی ضرورت ہے اور میرے خیال میں تم اس کام کے لئے بہت موزوں رہو گے ــــــ" میں اس کام کے لئے موزوں تھا یا نہیں، مگر کیپٹن کے خشک رویئے سے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"نہیں جناب شکریہ ــــــ میں شاید یہ کام نہ کرسکوں!" کام کے بارے میں کچھ پوچھے بغیر ہی میں نے کہہ دیا۔

"اچھا ٹھیک ہے ــــــ تم جا سکتے ہو ــــــ میرا خیال بھی یہی تھا کہ تم یہ کام نہ کرسکو گے ــــــ" اس نے اب بھی میری طرف نہ دیکھا۔ میں اس کی بے نیازی پر جل بھُن کر کوئلہ ہو گیا اور واپس جانے کے لئے مڑا، مگر دروازہ کے پاس پہنچ کر خیال آیا کہ کام کی نوعیت کے بارے میں تو پوچھ لوں۔ یہ سوچ کر میں رُک گیا۔

"آپ نے مجھے کام کی نوعیت سے تو آگاہ ہی نہیں کیا۔" میں نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔

میرے اس سوال پر کیپٹن چونک پڑا۔ کاغذوں کے پلندے کو گھورتے ہوئے بولا:

"جاؤ یہ تمہارے بس کا روگ نہیں ــــــ تم ان خود ساختہ عقلمندوں میں سے ہو جو ویسے تو ہر کٹھن سے کٹھن کام کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں، مگر رضاکارانہ خدمت انجام دینے سے ڈرتے ہیں۔ مجھے ویسے بھی یقین ہے کہ تم یہ کام نہ کرسکو گے، کیونکہ تم ایسے دل و دماغ کے مالک نہیں کہ اس نازک اور اہم ترین مہم کے تقاضوں کو پورا کرسکو، لہٰذا تم جا سکتے ہو۔"

کیپٹن کے ان فقروں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ غصّے سے بل کھا کر میں اس کی طرف بڑھا اور کاغذوں کے اس پلندے کو اُچک لیا۔ میری اس گستاخی پر کیپٹن کا چہرہ تپے ہوئے تانبے کی مانند سرخ ہو گیا، مگر وہ کچھ نہ بولا اور میں سب سے اوپر رکھا ہوا کاغذ پڑھنے لگا جس پر لکھا تھا،

"رضاکار ــــــ نارڈے کی زبان سے بخوبی واقف ہو، قد چھ فٹ تین انچ وزن دو سو تین پونڈ ــــــ بال سنہری اور آنکھیں نیلی ــــــ منسلک تصویر سے کم از کم مشابہت اشد ضروری ہے ــــــ اگر کوئی شخص ان علامات پر پورا اترتا ہے تو اس کے بارے میں فوراً اطلاع دی جائے اور اس شخص کو

تیز ترین ذرائع سے واشنگٹن روانہ کر دیا جاتے ۔"

یہ عبارت پڑھتے ہی یک بارگی میرا دل زور سے دھڑکا ۔ میں نے ورق اُلٹ کر تصویر کا جائزہ لیا ۔ پچکی ہوئی ناک، چہرے کے بگڑے ہوئے آثار اور آنکھیں بند، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سوتے میں اِس شخص کی تصویر اتاری گئی ہے ۔" لیکن مجھے حیرت اِس بات پر تھی کہ یہ تصویر میری شکل سے نہایت مشابہہ تھی ۔

"کمال ہے ۔" میں نے کہا ۔

"کمال کا بچہ ــــ" کیپٹن نے تلملا کر جواب دیا ۔" میں تمہاری اِن حرکتوں سے سخت نالاں ہوں ۔"

"مگر مجھے یہ کام منظور ہے اور میں خوشی سے اپنی خدمات پیش کرتا ہوں ۔" میرا غصہ کافور ہو چکا تھا ۔

"بہت خوب ــــ اب جلدی سے رختِ سفر باندھو اور عین ممکن ہے کہ تم دوبارہ یہاں نہ آسکو ۔ میرا خیال ہے کہ تیز ترین ذرائع سے اُن کی مراد ہوائی جہاز ہے ــــ بہرحال تم جلدی سے تیار ہو جاؤ ۔" یہ کہہ کر وہ خود فون کی طرف بڑھا ۔

اسی روز ہوائی جہاز کے ذریعے مجھے واشنگٹن بھیج دیا گیا ۔ واشنگٹن پہنچتے ہی ایک آرمی میجر نے میرا انٹرویو لیا اور مجھے صرف چند گھنٹے آرام کرنے کی مہلت ملی ۔ میں ابھی اچھی طرح آنکھیں کھولنے بھی نہ پایا تھا کہ میری روانگی کے احکام صادر ہو گئے اور بی ــــ ۱۲ کے طیارے میں مجھے سوار کر دیا گیا ۔ طیارے کا پہلا اسٹاپ بلیو ویسٹ، دوسرا نارتھ آئی لینڈ اور تیسرا اور آخری اسٹاپ لندن تھا ــــ ہوائی اڈے پر ایک کار میرا انتظار کر رہی تھی ۔ مجھے جلدی سے اِس کار میں بٹھایا گیا اور کار فراٹے بھرتی ہوئی روانہ ہو گئی ۔ کار کی رفتار اور ڈرائیور کی مستعدی سے دِل خوش ہو گیا ۔ لیکن ڈرائیور کی خاموشی بڑی اعصاب شکن تھی اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لوگ مجھے اغوا کر کے کہیں لے جا رہے ہیں ۔

جب ہم برٹش آرمی انٹیلی جنس کے ہیڈ کوارٹر کی یورپین شاخ میں پہنچے تو میری جان میں جان آئی ۔ دکٹورین مینشن میں واقع اس شاخ کے دفاتر سر ونسٹن چرچل کے قول "یورپ کو دہکا دو"

کے تحت دہشت انگیزی پھیلانے کا کام کرتے تھے، اور اتفاق سے یہ اسی مشہورِ زمانہ بیکر اسٹریٹ میں واقع تھے جسے سر آرتھر کینن ڈائل کے شرلاک ہومز نے شہرتِ دوام بخشی تھی۔ اپنی دہشت انگیز سرگرمیوں کی بنا پر اس شاخ کو "کمپنی" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس کا فرانسیسی حصہ بہت وسیع تھا، لیکن نارویجین حصہ سب سے اہم، کیوں کہ اس میں ناروے کا جلا وطن بادشاہ اپنی کابینہ سمیت ٹھہرا ہوا تھا۔ اس ملک بدر بادشاہ کو جو مراعات حاصل تھیں، وہ ان سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا تھا اور ناروے میں زیرِ زمین سرگرمیوں کے تمام اداروں سے آزادانہ رابطہ قائم رکھتا اور نظم ونسق کے بارے میں بھی فیصلے جاری کرتا۔ کمپنی کا خاص تعاون بھی اُسے حاصل تھا، چنانچہ جب بھی اِس نارویجین جلا وطن حکومت کو کسی خاص نارویجین آدمی کی ضرورت پڑتی تو وہ "کمپنی" سے رجوع کرتی۔

میری سکونت اِن دفاتر سے تھوڑے فاصلہ پر جارج اِسٹریٹ میں تھی اور وہیں میری تربیت بھی مکمل ہوئی۔ سب سے پہلے جو ملاقاتی میرے پاس آیا وہ بڑی عجیب وغریب شخصیت کا مالک تھا۔ سُتا ہوا چہرہ، دراز قد، سڈول جسم، سیاہ سوٹ میں ملبوس، ہاتھ میں موڑ کل لیے جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوا، تو میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا نام ہک تھا اور وہ دنیا کی بہت سی قدیم وجدید زبانیں بولنے پر قادر تھا۔ رسمی تعارف کے بعد وہ مجھ سے کہنے لگا:

"تمہیں یہاں بہت کچھ سیکھنا ہے —— بہت کچھ۔" پھر سرگوشی کے انداز میں بولا: "اس مہم کے مقاصد کی تکمیل اور تمہاری زندگی کا دارومدار تمام تر تمہاری نجی قابلیت پر ہے۔ اس لیے تم زیادہ سے زیادہ معلومات ذہن نشین کرلو اور ساتھ ساتھ اُن کی مشق بھی کرتے جاؤ۔"

میں حیرت سے منہ کھولے اُس کی باتیں سُن رہا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اس پُراسرار شخص کی باتیں سُن کر مجھے پہلی بار اس مہم کی نزاکت کا کچھ اندازہ ہوا۔ جسے دیکھو ایک مبہم انداز میں رٹ لگائے جا رہا ہے، "مہم —— مہم —— مہم ——" مجھے اس لفظ سے اب چڑ سی ہونے لگی اور قریب تھا کہ میں اپنی بیزاری کا اظہار مسٹر ہک سے کردوں کہ اس نے فوراً میری دلی کیفیت

کا اندازہ کر لیا اور کہنے لگا:

"گھبراؤ نہیں ——— میں سب کچھ تمہیں بتاؤں گا۔ مگر فی الحال تم میری باتیں غور سے سنو۔ یہ آخری موقع ہے کہ میں انگریزی بول رہا ہوں اور تم بھی اس کے بعد مجھ سے انگریزی میں بات چیت نہ کرنا، بلکہ تم ابھی سے اپنے تمام انداز و اطوار اور چال ڈھال کو ناروین تہذیب کے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دو۔ ابھی تک تو تم امریکن ہو، لیکن تھوڑی دیر بعد تم ناروے کے باشندے بن جاؤ گے۔" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اور یاد رکھو کہ تمہیں بہت کچھ سیکھنا ہے۔ بہت کچھ ——"

شروع شروع میں تو اس ساری سرپھٹول سے میں یہی نتیجہ اخذ کر سکا کہ مجھے ایک جواں سال ناروین شخص "بجورن بجورنسن" کا روپ دھارنا ہے۔ یہ وہی شخص تھا جس کی تصویر میں نے ووزٹ براگ میں دیکھی تھی۔ انہوں نے مجھے کام کی اصلیت کے بارے میں اگرچہ کچھ نہ بتایا تھا مگر میں جلد ہی محسوس کرنے لگا کہ اس شخص "بجورن" کا بھیس بدلنا میرے لئے آسان کام نہیں۔ اس زمانے میں ناروے کی آبادی صرف تیس لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ یہ تیس لاکھ افراد حیرت انگیز طور پر ایک دوسرے کے قریبی رشتے دار تھے۔ آپ کوئی بھی ہوں اور ناروے کے کسی حصے سے آئے ہوں، کہیں بھی جا رہے ہوں، آپ کو کوئی نہ کوئی ایسا ناروین مل جاتے گا جو آپ سے اپنے پہلے، دوسرے، تیسرے اور پھر چوتھے عم زاد کے بارے میں ضرور پوچھے گا یا پھر وہ اپنے کسی پرانے دوست کے بارے ہی میں پوچھے گا۔ اُف میرے خدا۔ میرا سر چکرا گیا۔ کتنا مشکل کام ہے۔ اپنی تربیت کے اس مشکل ترین مرحلے پر غور کرتے ہوئے میرے اعصاب شل ہو جاتے اور پیشانی پر پسینے کے قطرے پھوٹنے لگتے۔

سب سے پہلے مجھے "بجورن بجورنسن" کے آبائی گاؤں "گرونگ" کے محل وقوع اور اس کے باسیوں کے حالات ذہن نشین کرنے پڑے، پھر ان سب کی شناخت، ان کے دوستوں اور واقف کاروں کے حالات ازبر کرنے پڑے۔ اس کے بعد مجھے "ممسوس، منسا سایملہس اور ٹرونڈہم نامی شہروں میں بجورن کے دوستوں اور آشناؤں کے بارے میں معلومات کا ایک ناقابلِ برداشت مواد اپنے ذہن میں بند کرنا پڑا اور سب سے مشکل کام ٹرونڈہم کا محل وقوع اور

اس کے تمام گلی کوچوں میں آنکھیں بند کر کے گھوم جانے کی تفصیل ذہن نشین کرتا تھا۔ آپ ذرا اندازہ کیجیے کہ معلومات کے اس بحرِ بے کراں کو ہضم کرنا کس قدر دشوار کام تھا۔ اس سے تو وہی کاشتکاری لاکھ درجے اچھی تھی۔ فوجی زندگی تو نرا عذاب ہے۔ مگر میں مجبور تھا۔ اس عذاب سے چھٹکارا پانے کا میرے پاس اب کوئی راستہ نہ تھا۔ بخدا اگر یہ مہم قومی نوعیت کی نہ ہوتی تو کون کم بخت تھا جو اپنی جان یوں جوکھوں میں ڈالتا۔ میں اب اس منحوس وقت کو کوستا تھا جب بھرتی کے لیے کیمپ میں خوشی خوشی گیا تھا۔ اب اس مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا یا جان دے دینا ہی میرا فرض تھا۔

کاشتکاری، اسکیٹنگ، مجسمہ سازی اور مچھلی کا شکار میرے مشاغل تھے مگر اب یہ ضروری تھا کہ اُن کے امریکی انداز کو نارڈین انداز میں بدل لوں۔ یہ کام نسبتاً آسان تھا۔ پھر مجھے نارڈین اندازِ فکر، طرزِ تکلم اور رہن سہن کے طریقوں کو اپنانا تھا۔ ان تمام خرافات کو ذہن نشین کرنے میں مرتا کھپتا میں کامیاب تو ہو ہی رہا تھا مگر حیرانی اِس بات کی تھی کہ مسٹر ہک نے یہ ساری باتیں نہ جانے کتنے جنم لے کر سیکھی ہوں گی۔

بہرحال اپنے فرض کی اہمیت کے پیشِ نظر میں اس اَن تھک اور محنت کش مسٹر ہک کے ساتھ روزانہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتا اور صرف کھانا کھانے کے وقت ہی اِس مشقت سے چند لمحوں کے لیے نجات ملتی۔ میں اکثر محسوس کرتا کہ میرا سر درد کی شدت سے بس پھٹنے ہی والا ہے۔ میری فوجی معلومات کا بھرم تو اُسی دن کھل گیا تھا جب ہک کہنے لگا: "اِس ساری دماغ سوزی کے پسِ پشت ہماری جنگی کاوشوں کی تکمیل کا مقصد کام کر رہا ہے۔" یہ سُن کر میں بھونچکا رہ گیا لیکن میرے تحیر کو خاطر میں لاتے بغیر ہک کہہ رہا تھا۔ "اور تم جانتے ہو کہ مرمانسک تک رسد اور کمک کی ترسیل کی راہ میں صرف نارڈے ہی نقطۂ مزاحمت ہے، جہاں نازی قابض ہیں مگر یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہماری بھیجی ہوئی رسد و کمک صحیح سالم روس پہنچ جائے لیکن بدقسمتی سے رسد کا دو تہائی حصہ نازیوں کی آب دوزوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ذرا غور تو کرو کہ ہمیں مرمانسک تک ایک ٹینک پہنچانے کے لیے مختلف جہازوں کے ذریعے تین ٹینک ارسال کرنے پڑتے ہیں۔" اُس نے میز کی دراز میں سے ایک رنگین نقشہ نکال کر فرش پر پھیلا دیا۔

"دیکھو۔" اس نے نقشے پر ایک ساحلی علاقے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ تمام

ساحل اور اس پر جا بجا شگافوں اور چٹانوں کا لامتناہی سلسلہ ملا کر اس کی لمبائی بارہ ہزار میل ہوتی ہے' ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سارے ساحلی علاقے سے بھی زیادہ۔ ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ نازی آب دوزوں کی کمین گاہ کہاں ہے' مگر ہے یہ ناروے ہی کے کسی نامعلوم مقام پر' اور ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ آب دوزوں کا یہ اڈہ "گردنگ" کے بالکل نزدیک "منسوس" میں ہے۔ اس تمام علاقے کی سختی سے حفاظت کی جاتی ہے۔ ہم نے اپنے ہزاروں ایجنٹ بھیجے' مگر ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ پھر ہم نے وہاں کے مچھیروں کی خدمات حاصل کرنے کی سر توڑ کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ اس ناکامی کا ہمیں اعتراف ہے مگر ہم اپنی ترسیل رسد پر یہ دباؤ برداشت نہیں کر سکتے اور نہ اپنی ناکامی کو خاطر میں لائیں گے۔ ہمیں احساس ہے کہ ابھی مزید نقصان اٹھانا ہوں گے' حتیٰ کہ منسوس کے چٹانی دروں میں گھرے ہوئے سمندر میں واقع نازیوں کا یہ اڈہ تم دریافت نہ کر لو۔" اُس نے رنگین نقشے کو دیوار پر آویزاں کرتے ہوتے کہا۔ "یہ ہے تمہاری مہم۔"

"گویا آب دوزوں کے صرف ایک اڈے کو دریافت کرنے کے لئے یہ پاپڑ بیلے جا رہے ہیں۔ فرض کیجئے یہ اڈہ میں دریافت کر لیتا ہوں تو کیا اسے تباہ کرنا بھی میرے فرائض میں داخل ہوگا؟"

"نہیں نہیں۔" مسٹر ہک کو جیسے جھٹکا لگا۔ "تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ اس اڈے کا سراغ لگاؤ' اور وہاں سے فوراً نکل جاؤ' اور جس طرح بھی ممکن ہو اپنی دریافت کی مکمل رپورٹ ہمیں بھیج دو۔ پھر آر اے ایف جانے اور اس کا کام۔"

"بہت اچھا۔" میں نے کہا۔ "اب میں دو چار سوال آپ۔"

"ٹھہرو۔" اس نے مجھے روک دیا' پھر اپنا بیگ کھول کر ایک تصویر نکال کر میری جانب بڑھائی۔ "تم نے اسے پہلے دیکھا ہے؟"

"جی ہاں۔ یہ بجورن بجورنسن کی تصویر ہے اور میری شکل و صورت کے مشابہہ ہے۔"

"غلط' بالکل غلط۔ تمہاری اور اس تصویر کی کوئی مشابہت نہیں ہے' بلکہ یہ تو تم خود ہو۔ سمجھے؟ اس بات کو اب کبھی فراموش نہ کرنا۔" اور پھر اس نے تمام ضروری باتیں دہرائیں۔ "ہمیشہ

یاد رکھو کہ تم ایک ناروین کسان کے بیٹے ہو، جو نارِک کے مقام پر لڑائی میں شدید زخمی ہو گیا تھا اور پھر قیدیوں کے ساتھ انگلستان لایا گیا اور یہاں زخموں کی تاب نہ لا کر مر گیا۔ یہ تصویر تمہاری ٹوفات پر لی گئی تھی، لیکن نازیوں کو اس بات کا قطعاً علم نہیں کہ تم مر چکے ہو۔ لہٰذا وہ تمہارے دوبارہ وطن آنے پر معترض نہ ہوں گے۔"

"مگر وطن واپس جانے کا یہ انداز کتنا مضحکہ خیز ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بہت خوب، بلکہ ایک اہم ترین بات اور یاد رکھو۔ نازیوں کو یقین ہے کہ ایک ناروین اپنے دماغ میں کچھ بٹھالے تو اسے نکالنا آسان کام نہیں اور یہ جس قدر مضحکہ خیز انداز سے رونما ہوگا، وہ اسی قدر بآسانی اس پر یقین کریں گے۔"

"خیر چھوڑیئے اس بات کو۔ مجھے یہ بتایئے کہ جب اتنے ایجنٹ ناکام رہے تو میری دال وہاں کیسے گلے گی؟"

"بھئی وہ سب کے سب اجنبی تھے۔" ہک نے جواب دیا۔ "لیکن تم تو آبائی طور پر ناروے ہی کے باشندے ہو اور بحیثیت ہجونسن ہونے کی وجہ سے تمہیں وہاں جانے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ وہاں کے لوگ تمہارے دوست اور تم ان کی سوسائٹی کے ایک اہم فرد ہو۔ پھر تمہیں کس بات کا ڈر ہے؟"

جون کے آخر میں مجھے سینٹ تھامس ہسپتال میں اسی سرجن کے روبرو پیش کیا گیا جس نے آں جہانی ہجونسن کا علاج کیا تھا۔ سرجن اور اس کے مددگار ڈاکٹر نے مل کر ہجونسن کی تصویر کے ساتھ میرے چہرہ کا مقابلہ کیا، پھر اطمینان سے میری ناک کا بانسہ پکڑتے ہوئے بولا:

"ہم ٹھیک اس جگہ سے اسے توڑ سکتے ہیں، جس سے ناک مڑ جائے گی مگر اس کے گالوں پر آپریشن ذرا مشکل کام ہے۔"

"ایک منٹ جناب!" میں بیچ میں بول پڑا۔ "اس سے پہلے کہ آپ حضرات مجھ پر مشق ستم فرمائیں، اس بات کا خیال رکھیئے کہ مجھے زیادہ تکلیف نہ پہنچے اور زخم حتی الامکان وہیں لگایئے گا جہاں ہجونسن کے آیا تھا۔"

"آپ فکرمند نہ ہوں۔" سرجن نے جواب دیا۔ "بجورنسن کی کھوپڑی میں گولی کچھ اس انداز سے لگی تھی کہ اس کا بھیجا پاش پاش ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اس کا بچنا ناممکن بات تھی۔"

"آہ!" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا اور بے اختیار میں اپنے چہرے کا آئینے میں جائزہ لینے لگا۔ چہرہ انسان کے کردار کا آئینہ اور اس کے جسم کا اہم ترین حصّہ ہوتا ہے۔ اس کے بگڑ جانے یا بگاڑ دیئے جانے سے ذہن میں فتور پیدا ہو جاتا ہے۔ میں یہ مہم سر کرنے کے لیئے جسمانی، نفسیاتی اور اعصابی طور پر بالکل تیّار تھا مگر میرے جذبات اب بھی بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔ آخر میں نے سوال کیا:

"کیا آپ میرے مسخ شدہ چہرے کو دوبارہ ٹھیک کر سکیں گے؟"

"ہاں۔ ہاں۔" سرجن نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "ہمیں تھوڑی سی دِقّت ضرور پیش آئے گی، مگر ہم آپ کے چہرے کو دوبارہ ٹھیک کر دیں گے۔"

دوسرا سرجن جس نے اب تک زبان نہ کھولی تھی بجورنسن اور میرے چہرے کو مختلف زاویوں سے گھورے جا رہا تھا ایکایک کہنے لگا:

"آپ ہمیں صرف ایک رات کی مہلت دیجیئے تاکہ ہم آپریشن کی پوری تیاری کر لیں۔ اب آپ اپنے کمرے میں جا کر آرام کر سکتے ہیں، ہم کل صبح آپریشن شروع کر دیں گے۔"

لیکن جب اگلے روز مجھے ہوش آیا تو میرا سارا جسم درد سے ٹوٹ رہا تھا۔ اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میرے جسم کے اندر ہزاروں سوئیاں بھونک دی گئی ہیں۔ پیٹ کے بل لیٹا ہوا میں بڑی مشکل سے سانس لے رہا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ میری رگ رگ میں سے جان نکلی جا رہی تھی۔ میرے چہرے اور سر پر بندھی ہوئی پٹیوں کے باعث جان لیوا کھنچاؤ پیدا ہو رہا تھا۔ آنکھیں سوج چکی تھیں اور مجھے قریب رکھی ہوئی چیزیں بھی دکھائی نہ دیتی تھیں۔

ابھی میں اس ناگہانی مصیبت کے بارے میں اچھّی طرح کچھ سوچنے بھی نہ پایا تھا کہ کانوں میں ایک جانی پہچانی آواز آئی:

"مسٹر ملّی! کیا تم سخت تکلیف محسوس کر رہے ہو؟" بک مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ کب سے میرے پلنگ کے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے جب بھرپور کوشش سے آنکھیں کھولیں

تو وہ بڑی بے نیازی سے اپنی یک چشمی عینک صاف کرتا دکھائی دیا۔

ہاں مسٹر ٹِک! یہ سخت تکلیف ہی نہیں، بلکہ ناقابلِ برداشت عذاب ہے۔" یہ کہتے کہتے میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل ہی گئی۔

"بہت خوب۔ اب موقع ہے کہ میں تمہیں اُس تکلیف میں بھی سوچنے کی تربیت دوں تاکہ تم ہر طرح کے تشدد میں بھی اپنے ذہنی قویٰ بحال رکھ سکو۔ ہاں شاباش، اب میرے ہر سوال کا جواب دو اور ذرا جلدی۔"

مسٹر ٹِک کے سوالات اور میرے جوابات کیا تھے، یہ میں نہیں بتا سکتا، بس یوں سمجھ لیجئے کہ جیسے کوئی شخص پوری قوت سے میرے سر پر ہتھوڑا بجا رہا تھا۔ نس نس فریاد کر رہی تھی، میں دل ہی دل میں مسٹر ٹِک اور اپنے شوقِ مہم جوئی کو کوس رہا تھا۔

میری ناک اور کھوپڑی کے زخم ابھی تازہ ہی تھے کہ مجھے آرمی کیمپوں کے معائنے کے لئے "ہل" کے مقام پر لے جایا گیا جہاں چند کیمپ زیرِ تعمیر تھے اور جہاں میں یعنی نقلی بجورنسن تھوڑا عرصہ پہلے کام کر چکا تھا اور جسے فرار ہونے کے جرم میں گولی ماری گئی تھی۔

۸ ستمبر ۱۹۴۲ء کو مسٹر ٹِک میرے پاس آیا اور رازدارانہ انداز میں کہنے لگا۔ "تمہاری تعلیم و تربیت ختم ہو چکی۔ اب تم منزل پر جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ "سکاپا فلو" کے ساحل پر شاہی بحریہ تمہاری منتظر ہے۔"

"آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں مہم پر روانہ ہونے کے لیے ہر لحاظ سے تیار ہو چکا ہوں۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں تم میری جانب سے مکمل تربیت پا چکے ہو۔ اب آئندہ تمہاری کامیابی اور ناکامی کا دارو مدار تمہاری بصیرت، فیصلے اور حوصلہ مندی پر ہے۔ ناروے میں زیرِ زمین سرگرمیوں کے اڈے بھی تمہیں خود ہی تلاش کرنے ہوں گے۔ اگر میں نے ان میں سے کسی ایک اڈے کا مقام یا کسی رکن کا نام تمہیں بتا دیا تو تم یقیناً دھوکہ کھا جاؤ گے۔ کیونکہ نازیوں نے اتحادی جاسوسوں کو پھانسنے کا بڑا وسیع جال پھیلا رکھا ہے۔ وہ تمہیں دھوکہ دے کر تمہارے مشن کو آسانی سے ناکام بنا سکتے ہیں۔ اس خطرے کے پیشِ نظر میں یہ ذمہ داری نہیں لے سکتا۔ تاہم وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تم کامیاب واپس

آؤ گے۔ تربیت کے دوران مجھے تمہاری قوتِ برداشت اور جواں مردی کی صلاحیتوں کا احساس ہوا ہے۔ بلاشبہ ابتدا میں تم نے بہت سی غلطیاں کی تھیں مگر وہ غلطیاں میری ذات ہی تک محدود تھیں۔ اب خدا کے لیے نازیوں کے ساتھ کوئی غلطی نہ کر بیٹھنا ورنہ ——" اس نے فقرہ نامکمل ہی چھوڑ دیا، لیکن میں جانتا تھا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔

ہر طرف گہری تاریکی مسلّط تھی۔ سمندر میں طوفان کی آمد آمد تھی۔ آسمان پر بھی بادل گرج رہے تھے اور جب بجلی کوندتی تو سمندر کی لہریں مہیب اژدہوں کی مانند میری کشتی کے گرد بڑھتی دکھائی دیتیں۔ تربیت کے مراحل کا احساس کرتے ہوئے میرے ذہن میں کامیابی کی مسرت انگیز کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ کشتی میں رکھی ہوئی ریڈیم ڈائل کی کمپاس خوب چمک رہی تھی۔ اس کی سوئی ظاہر کرتی تھی کہ میری کشتی صحیح سمت میں سرگرم سفر ہے۔

ساری رات طوفانِ برق و باراں اپنی حشر سامانی کے ساتھ جاری رہا۔ بپھری ہوئی موجوں نے میری کشتی کو نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ کئی مرتبہ تو میں غرق ہوتے ہوتے بچا۔ میں نے اپنے آپ کو قدرت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ صبح کاذب کے دھندلکے جب صبح صادق میں بدل رہے تھے تو طوفان کے جوش و خروش میں کچھ کمی ہوئی اور میں نے ہوش میں آ کر اِدھر اُدھر دیکھا میری کشتی ایک ویران جزیرے کے قریب سے گذر رہی تھی جس کے چاروں طرف اونچی اونچی چٹانیں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ دفعتہً ان چٹانوں سے تیز سفید روشنی کا ایک سیلاب پھوٹ نکلا اور اس نے میلوں تک سمندر کو روشن کر دیا۔ یہ روشنی اتنی تیز تھی کہ آنکھیں چندھیانے لگیں۔ میں نہایت طاقتور سرچ لائٹ کی زد میں آ چکا تھا۔

اس کے چند لمحے بعد ہی بارش کی طرح گولیاں میری کشتی کے اوپر سے گذرنے لگیں۔ میں دَم سادھے پڑا رہا۔ فوراً ہی میں نے موٹر بوٹ کے انجن کی پرشور آواز سنی جو آہستہ آہستہ میرے قریب آتی جا رہی تھی۔ صبح کی خاموش اور پرسکون فضا میں اس کی آواز ایک مسلسل ہیبت ناک چیخ کی مانند سنائی دیتی تھی۔ جب موٹر بوٹ میرے قریب آ گئی تو میں نے گردن کو جنبش دے کر دیکھا۔ اس میں تین نازی سپاہی ہاتھوں میں رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ

اُٹھا لیئے۔ فوراً ہی ایک سپاہی نے میری جانب رسّی پھینکی جس کا سرا میں نے اپنی کشتی کے اگلے حصّے پر باندھ دیا اور پھر انہوں نے مجھے کشتی سمیت ہی موٹر بوٹ پر گھسیٹ لیا۔ کشتی موٹر بوٹ سے باندھ کر وہ میری طرف متوجّہ ہوتے اور رائفلوں کی زد پر رکھ کر دھکّے دیتے ہوئے کیبن کی طرف لے چلے۔ کیبن کے اندر بحری کمانڈر کی وردی میں ملبوس ایک نازی افسر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اس نے گھور کر میری جانب دیکھا اور جرمن زبان میں کچھ کہا جسے میں سمجھ نہ سکا۔ وہ غالباً مجھ سے یہ پوچھ رہا تھا کہ میں کون ہوں اور اس طرح مشتبہ حالت میں سمندر کے قریب کیوں گھوم رہا تھا۔ میں نے جب نفی میں سر ہلا کر اسے سمجھانا چاہا کہ میں اس کی بولی نہیں جانتا تو وہ ایک دم غصّے سے بھر گیا اور میرے گردن ہلانے سے یہ گمان کیا کہ میں اسے کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ وہ گھونسہ تان کر میری طرف بڑھا تو میں خوف سے چلّایا:

"میں جرمن زبان نہیں جانتا —— میں ناروے کا باشندہ ہوں۔"

یہ سُن کر اس نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا اور شکستہ نارویجن زبان میں بولا:

"اپنے شناختی کاغذات دکھاؤ۔"

"ابھی دکھاتا ہوں جناب۔"

میں نے اپنی پتلون کی جیب میں سے چرمی بٹوا نکال کر اُس کے حوالے کیا۔ اس نے کسی وحشی جانور کی طرح بٹوہ میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ نہایت بدتمیزی سے کاغذ نکالے اور ان پر سرسری سی نظر ڈالتے ہی غصّے سے بے قابو ہو کر چلّایا:

"برطانوی —— انگریز —— جاسوس ——"

اس کے یہ الفاظ پگھلے ہوئے سیسے کی مانند میرے کانوں میں اتر گئے، اور موت کا فرشتہ اپنے سامنے کھڑا دکھائی دیا۔ اُس کا چہرہ نفرت و حقارت کے جذبات سے سُرخ ہو گیا اور وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے خون برس رہا تھا۔ یہ رنگ دیکھ کر میرا لہو خشک ہو گیا۔ میں نے نہایت عاجزی اور خوشامد سے کہنا شروع کیا:

"جناب والا! میں انگریز نہیں اور نہ ان کا جاسوس ہوں۔ میں تو ناروے کا بڑا پرانا باشندہ ہوں ـــــ میں آپ سے سچ کہتا ہوں۔ میں تو ان شیطان انگریزوں پر لعنت"

اتنی تقریر ہی کر پایا تھا کہ اس نے کاغذ میرے منہ پر دے مارے اور مڑ کر اپنے ماتحتوں سے کرخت جرمن زبان میں کچھ کہا۔ انہوں نے فوراً مجھے ایک دوسری موٹر بوٹ میں سوار کیا اور کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہو گئے۔ دوپہر کے وقت ہم "اوسلیو فیورڈ" پہنچے۔ یہاں موٹر بوٹ رو کی گئی اور مجھے دوسرے نازی سپاہیوں کے حوالے کر کے جدھر سے آتے تھے اُدھر لوٹ گئے۔

"اوسلو" کسی لحاظ سے بھی قابلِ ذکر اور خوب صورت بندرگاہ نہ تھی۔ یہاں بنی ہوئی عمارتیں بے ڈھنگی اور بھدّی بھدّی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کو تعمیر کرتے ہوئے کوئی معیاری اصول پیشِ نظر نہیں رکھا گیا اور نہ نقشے بنانے کی زحمت ہی گوارا کی گئی۔ پوری بندرگاہ میں صرف ایک عمارت ڈھنگ کی دکھائی دی جو اس وقت زیرِ تعمیر تھی۔ آج کل اس عمارت سے اوسلو کے سٹی ہال کا کام لیا جا رہا ہے۔ ان عمارتوں سے لکڑی کا سارا سامان دروازے اور کھڑکیاں وغیرہ نہ جانے کس بنا پر نکال لیا گیا تھا۔ میں اِدھر اُدھر دیکھتا بھالتا چلا جا رہا تھا کہ میرے محافظوں نے رائفلوں کے کندے مار کر مجھے اشارہ کیا کہ گردن جھکا کر چلو۔ گویا میری نگاہوں کو بھی خطرناک سمجھا گیا۔

چلتے چلتے آخرِ کار ہم ایک کھنڈر نما عمارت کے اندر داخل ہوئے جس کے اوپر سواسٹیکا (نازی جھنڈا) لہرا رہا تھا۔ یہ عمارت کیا تھی، کوئی کباڑخانہ تھا جس کے اندر بحری فوج کا ساز و سامان، سپاہیوں اور افسروں کی پھٹی پرانی ان گنت وردیاں، ٹیلی فون اور وائرلیس کے آلات، ٹائپ مشینیں اور اسی طرح کی دوسری بہت سی چیزیں اچھی یا بُری حالت میں بکھری پڑی تھیں۔

ایک مختصر سے اندھیرے کمرے میں لے جاتے ہی وہ مجھ پر پل پڑے اور میرے بدن سے ایک ایک کپڑا اتار لیا اور پھر ان کپڑوں کی اچھی طرح تلاشی لی۔ میرے پاس سوائے کھانے پینے کی چیزوں اور شناختی کاغذات کے دھرا ہی کیا تھا۔ خوب دیکھ بھال کے بعد

انہوں نے مجھے دوبارہ کپڑے پہننے کی اجازت دے دی۔ میرے کاغذ اور سیاہ تھیلا بھی واپس کر دیا۔ اس کے بعد ایک شخص دوسرے کمرے میں گیا اور چند چھپے ہوئے فارم لے کر آیا اور مجھ سے کہا کہ میں انہیں پُر کروں۔ یہ فارم جرمن زبان میں تھے۔ میں نے کہا پہلے یہ بتایا جائے کہ ان فارموں پر لکھا کیا ہے؟ یہ سن کر وہ ایک دم مشتعل ہو گئے اور لگے میری مرمت کرنے۔ مار سے بچنے کے لیے میں فوراً فرش پر گرا اور تھوڑی دیر تڑپنے کے بعد بے ہوش ہو گیا۔ یہ دیکھ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئے اور دروازہ باہر سے مقفل کر دیا۔ اُن کے وہاں ہوتے ہی میں اُٹھا اور ایک گوشے میں جا کر بیٹھ گیا۔ جاتے ہوئے کم بخت کھانے کی چیزیں بھی اُٹھا کر لے گئے۔ بھوک اور پیاس سے میری جان لبوں پر آ گئی۔ کھانے کی کوئی شے پانے کی امید میں میں نے کمرے کی تلاشی لی تو ایک الماری میں بسکٹوں کا ڈبا اور شہد سے بھری ہوئی بوتل دکھائی دی۔ سوکھے دھانوں میں جیسے پانی پڑ گیا۔ ندیدوں کی طرح بسکٹوں پر شہد لگا لگا کر جلدی جلدی پیٹ بھر لیا۔ تھوڑے سے بسکٹ جیبوں میں بھی بھر لیے۔ اس کے بعد دیر تک اپنے آئندہ پروگراموں اور تدابیر پر غور کرتا رہا اور نہ جانے کب نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

آنکھ کھلی تو کمرے میں گھُپ اندھیرا تھا۔ مجھے وقت کا بھی کوئی اندازہ نہ تھا۔ اُٹھ کر ابھی دروازے سے زور آزمائی کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ راہداری میں بھاری جوتوں کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے ایک گوشے میں لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ چند ثانیے بعد دروازہ کھُلا، میں نے نیم باز آنکھوں سے دیکھا، ٹارچ کی روشنی کمرے میں پھیلتی ہوئی آئی اور مجھ پر رک گئی۔ دو سپاہی دروازے پر کھڑے تھے۔ اُن کے پاس اس وقت رائفلیں نہیں تھیں۔ ایک سپاہی مجھے سویا ہوا پا کر جرمن زبان میں غالباً گالیاں بکتا ہوا میری طرف آیا۔ اور آتے ہی میرے پیٹ میں ٹھوکر مارنے کے ارادے سے پیر اُٹھایا ہی تھا کہ میں نے لپک کر اس کی ٹانگ پکڑ لی اور اس زور سے جھٹکا دیا کہ وہ منہ کے بل میری طرف گرا۔ میں نے دو تین ہی گھونسوں میں اس کی طبیعت صاف کر دی۔ اپنے ساتھی کو پٹتے دیکھ کر ٹارچ والا سپاہی مجھ پر حملہ آور ہوا، لیکن میری لات کی ایک ہی ضرب میں وہ لڑھکنیاں کھاتا ہوا دور جا گرا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی اور ٹارچ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ میں نے فوراً ٹارچ پر قبضہ کر لیا اور اسے بند کر دیا۔ دونوں

سپاہی بے ہوش پڑے تھے۔ چند لمحوں کے اندر اندر میں نے اپنے حواس درست کیئے، کمرے کا دروازہ بند کیا اور ٹارچ روشن کر کے سپاہیوں کا جائزہ لیا۔ ایک کا سر پھٹ گیا تھا اور دوسرے کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ ٹارچ بجھا کر میں نے دروازہ کھولا اور دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل آیا۔

راہداری تاریک اور سنسان پڑی تھی۔ میں ایک گوشے میں کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ کدھر جاؤں۔ فرار ہو جانے سے سارا منصوبہ خاک میں مل جانے کا خدشہ تھا کیونکہ بندرگاہ اوسلو اتنی وسیع جگہ نہ تھی جہاں میں زیادہ عرصہ تک نازیوں کی نگاہوں سے محفوظ رہ سکتا۔ وہ مجھے یقیناً ڈھونڈ نکالتے اور پھر جاسوس ہونے کے جرم میں رائفل کی گولی میری کھوپڑی میں اُتار دی جاتی۔ اب پہلی بار مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ میں نے جرمن سپاہیوں سے لڑ کر کتنی بڑی غلطی کی۔

ابھی میں اس حماقت کی تلافی کی تدابیر سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے سے تین چار سپاہی آتے دکھائی دیئے۔ میں نے موقع غنیمت سمجھا اور جلدی سے ٹارچ ایک طرف پھینک کر وہیں لیٹ گیا اور یوں کراہنے لگا جیسے دم لبوں پر ہے۔ میری آواز سُن کر وہ دوڑتے ہوئے آئے اور میرے گرد کھڑے ہو گئے اور پھر ان میں سے ایک نے اپنی ٹارچ روشن کر کے میرا چہرہ جھک کر دیکھا اور جرمن زبان میں اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا۔ اب انہوں نے بھی باری باری میرا معائنہ کیا۔ میں نے اشارے سے کہا کہ پانی پلاؤ مگر وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ کچھ دیر تک تیزی سے گفتگو کرنے کے بعد کسی فیصلے پر پہنچ کر انہوں نے میرے ہاتھ پاؤں پکڑے اور تین چار برآمدے اور راہداریاں عبور کرتے ہوئے ایک وسیع و عریض کمرے میں داخل ہوئے جہاں فوجی وردیاں پہنے دو جرمن آفیسر بیٹھے تھے۔ مجھے فرش پر پھینک کر سپاہیوں نے آفیسروں سے کچھ کہا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ میں اتنی دیر میں "بے ہوش" ہو چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان میں سے ایک شخص میرے قریب آ کر مجھے بغور دیکھ رہا ہے۔ پھر اس نے اپنے ساتھی سے جرمن زبان میں کچھ کہا اور پھر دونوں نے قہقہہ لگایا۔ اس کے چند لمحے بعد یکایک پانی کا ایک بھرا ہوا جگ میرے سر پر انڈیل دیا گیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور اٹھنے کی کوشش کی مگر لڑکھڑا کر گر پڑا۔ ان دونوں نے مجھے اٹھایا اور ایک کرسی پر بٹھایا۔ اب میں نے اچھی طرح

ہوش میں آکر آنکھیں کھولیں اور اٹھنے کی کوشش کی۔ کمرے میں صرف دو موم بتیاں جل رہی تھیں جن کی کانپتی ہوئی زرد روشنی میں میں نے اپنے حریفوں کا جائزہ لیا۔ ان میں سے ایک دبلا پتلا اور طویل القامت تھا جس کی آنکھیں چھوٹی اور بھنچے ہوئے پتلے لب ظاہر کرتے تھے کہ حد درجے سفاک اور ظالم شخص ہے۔ دوسرا اس سے قطعی مختلف تھا، پستہ قد اور خشکیزے کی طرح پھولا ہوا پیٹ، چوڑا چکلا چہرہ، بڑی بڑی اور باہر ابلی ہوئی سرخ آنکھیں، ٹھوڑی کے نیچے ڈھلکا ہوا گوشت اور چھوٹے چھوٹے بازو۔ وہ اس وقت شراب کے نشے میں دھت تھا۔ ان کی وردیوں سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہ تھا کہ وہ دونوں میجر ہیں۔

ان میں سے لمبے میجر نے جس کا نام پلیسل تھا، خلاف توقع سختی کا مظاہرہ نہ کیا، بلکہ نرم لہجے میں پوچھ گچھ کا آغاز کیا۔ وہ روانی سے نارویجن زبان بولتا تھا۔ اس نے صرف پانچ سوال مجھ سے پوچھے:

کون ہو؟ تمہارا اصل نام کیا ہے؟ کہاں کہاں رہے ہو؟ چہرے اور سر پر زخموں کے نشان کیسے ہیں؟ رات کے وقت سمندر میں کشتی لیے کس مقصد سے گھوم رہے تھے؟

میں نے تفصیل سے وہی رٹے رٹائے جواب پیش کر دیے، لیکن میجر پلیسل کے لبوں پر آئی ہوئی مسکراہٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ان سے مطمئن نہیں ہے۔ وہ مجھ سے کہنے لگا:

"یہ مانتے ہو کہ تم برطانیہ کے لیے جاسوسی کے ارادے سے خود کو ناروے میں اسمگل کر رہے تھے؟"

"جناب! میں کہہ چکا ہوں کہ میں انگریز ہوں نہ امریکہ کا باشندہ، بلکہ ناروے کا رہنے والا ہوں اور میرے آباؤ اجداد صدیوں سے اسی ملک کو اپنا وطن بنائے ہوئے ہیں۔ میرا جرم صرف اتنا ہے کہ میں انگلستان سے اپنے وطن واپس آیا ہوں۔ یہ کشتی میں نے وہیں سے حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی قابلِ اعتراض چیز نہیں۔ میں تو جناب اپنی زمین پر قبضہ کرنے آیا ہوں جو میری ماں مرتے وقت میرے لیے چھوڑ گئی ہے۔"

موٹا اور مکروہ صورت میجر جو اب تک خاموشی سے باتیں سن رہا تھا، یکایک چلایا:

"کیا بکواس کر رہے ہو؟ یہ اڑن گھائیاں کسی اور کو دینا۔ سچ سچ بتاؤ تم انگلستان میں کیا کرتے رہے ہو اور اب وہاں سے یہاں کس ناپاک ارادے سے آئے ہو؟"

اور اس سے پیشتر کہ میں وہی داستان دہراتا، وہ دونوں کسی بھوکے درندے کی مانند مجھ پر پل پڑے اور اس بری طرح میری پٹائی کی کہ چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ میں قطعی ادھ موا ہو گیا ہوں تو مجھے اسی کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ مجھ پر ساری رات ایک ناقابلِ برداشت عذاب کی مانند گذری۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری کئی پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ منہ سوج کر کُپا بن گیا تھا اور رہا تھ پیر ہلانے کی سکت بھی باقی نہ تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ابھی تو میری اتنی ہی درگت بنی ہے، جب انہیں پتہ چلے گا کہ میں نے جرمن سپاہیوں کی ٹھکائی بھی کی ہے تو یہ لوگ مجھے جان ہی سے مار ڈالیں گے۔

کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے، چنانچہ اس تکلیف کے باوجود میری آنکھ بھی جھپک گئی اور ہوش اس وقت آیا جب میں نے "گسٹاپو" پولیس کے دو آفیسروں کو اپنے قریب کھڑے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے اپنے بوٹ کی نوک میری پسلیوں میں چھبوتے ہوئے کہا:

"اٹھو سور کے بچے! بہت عیش کر چکے۔ اب ذرا کچھ کام وام بھی کر کے دکھاؤ، ورنہ مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

گسٹاپو کے ان آفیسروں کو دیکھتے ہی یقین کیجئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے موت کے فرشتے میری روح قبض کرنے آئے ہیں۔ گسٹاپو کے مظالم اور تشدد کی لرزہ خیز داستانیں میں نے بہت سُنی تھیں چنانچہ سب سے پہلا خیال جو میرے ذہن میں آیا وہ یہی تھا کہ شرافت سے اپنے جرم کا اقبال کروں۔ موت تو اب ہر صورت میں یقینی ہے۔ جرم کا اقبال نہ کروں تو بھی یہ موذی مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔ میں نے عاجزانہ انداز میں ان کی طرف دیکھا اور اٹھ کر ان کے ساتھ ہو لیا۔

باہر ایک جیپ گاڑی کھڑی تھی۔ مجھے اس میں بٹھا کر گسٹاپو پولیس کے ہیڈ کوارٹر نمبر ۱۹ میں لے جایا گیا۔ یہاں باقاعدہ جیل بھی تھی جس میں سینکڑوں بدنصیب ناروین باشندے جاسوسی اور دوسرے الزامات کے تحت گسٹاپو کے بے پناہ ظلم و تشدد کی چکی میں پس رہے تھے۔

مجھے ایک علیحدہ کال کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا جہاں میں اُن مظلوموں کے چیخنے چلانے کی آوازیں بخوبی سن سکتا تھا جنہیں دن رات اذیت دی جاتی تھی۔ دو روز تک میں اس کوٹھڑی میں بھوکا پیاسا بند رہا۔ تیسرے روز جب کہ میں موت کی گھڑیاں گنتے گنتے عاجز آچکا تھا، دروازہ کھلا اور ایک باوردی مسلّح سپاہی نے مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ کمرۂ تفتیش میں گسٹاپو کے وہی دونوں آفیسر ٹہل رہے تھے جو مجھے اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ انہوں نے نارویجن زبان میں سوالات کا آغاز کیا اور ان کے ہر سوال میں "جاسوس" کا لفظ آتا تھا۔ اب میں نے ذرا ایکٹنگ شروع کی اور روتے ہوئے جواب دیا:

"جناب والا! میں اپنی مرحومہ والدہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں جاسوس نہیں ہوں۔ انگریز بھی یہی کہتے تھے کہ میں جاسوس ہوں اور آپ لوگ بھی یہی کہہ رہے ہیں۔ حالانکہ میں ایک بے گناہ نارویجن کاشت کار ہوں۔ میرے باپ دادا نے بھی جاسوسی کبھی نہیں کی۔"

جیسا کہ مجھے بعد میں پتہ چلا ان میں سے ایک کا نام لیوکر اور دوسرے کا ایلڈانٹ تھا۔ دفعتہً لیوکر نے آگے بڑھ کر ایک گھونسہ میرے منہ پر رسید کیا۔ میں چیخ مار کر فرش پر گر گیا اور ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ اتنے میں ایلڈانٹ نے میرے پیٹ پر لات مار کر رہی سہی کسر پوری کر دی اور میں بے جان ہو گیا۔ میرے کانوں میں ایلڈانٹ کے چلانے کی آواز آرہی تھی:

"ابھی پتہ چل جائے گا کہ تم کون ہو۔ بس ذرا ہمارے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دیتے جاؤ۔"

"آپ کیا جاننا چاہتے ہیں؟" میں راہِ راست پر آگیا۔

"رپورٹ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم کو ناروک سے برطانیہ لے جایا گیا۔ بتاؤ تم برطانیہ میں کہاں ٹھہرے تھے؟"

"لندن میں ——— انہوں نے مجھے جہاز سے اتارا اور اسٹریچر پر لٹا کر ہسپتال لے گئے۔"

"کون سا ہسپتال؟" ایلڈانٹ غرّایا

"سینٹ تھامس" میں نے جواب دیا۔

"اچھا اس کی تفصیل بیان کرو۔"

"تفصیل؟ ارے صاحب، ہسپتال کی تفصیل کیا؟ وہاں تو زخمیوں، ڈاکٹروں اور نرسوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔"

"بکو مت۔" لیوکر گرجا۔ "تمہیں اس سے زیادہ بتانا پڑے گا۔"

"ذرا مجھے سوچنے کی مہلت دیجیئے۔" میں نے التجا کی۔ "ہاں خوب یاد آیا۔ مجھے جس کمرے میں علاج کے لیئے رکھا گیا اس کے دروازے سے برطانوی پارلیمنٹ کی عمارت نظر آتی تھی، دریا کے پرے، اور وہاں ایک بہت بڑا چرچ بھی وہاں سے دکھائی دیتا تھا اور میں سوچا کرتا تھا شاید یہی ویسٹ منسٹر ایبے ہے۔"

"اور کچھ بتاؤ ——"

"بس جناب، اس سے زیادہ مجھے یاد نہیں آتا۔ میں اس ہسپتال میں کافی دن زیر علاج رہا۔ میری ناک کا بانسہ ٹوٹ گیا تھا اور میرے رخسار زخمی تھے۔ ڈاکٹر اکثر کہا کرتے تھے کہ میں اب فوج کے قابل نہیں رہا —— اور ہاں وہ لوگ میرے سر کے بارے میں بھی تشویش کا اظہار کیا کرتے تھے، لیکن تعجب ہے کہ گولی لگنے کے باوجود میرا دماغ ٹھیک رہا۔"

"چھوڑو اس بکواس کو۔" ایلڈ ہانٹ کہنے لگا۔ "یہ بتاؤ کہ تم کو ہسپتال سے پھر کہاں کہاں لے جایا گیا۔"

"انہوں نے چند دن تک مجھے ایک فوجی کیمپ میں رکھا۔ مجھے وہاں مشقت بھی کرنا پڑتی تھی۔ امریکن اور انگریز فوجیوں کی بیرکیں بناتا رہا۔ میں بہت اچھا بڑھئی ہوں جناب۔"

"بیرکیں؟ —— فوجی کیمپ؟" وہ دونوں بیک وقت چیخے۔

"جی ہاں۔ بالکل درست۔"

یہ سنتے ہی لیوکر بے تاب ہو کر دروازے کی طرف لپکا اور ایلڈ ہانٹ مجھ پر جھک گیا۔ اس کی آواز فرطِ جوش سے کانپ رہی تھی۔

"یہ سب فوجی کیمپ کہاں تھے؟"

"سب سے پہلے میں بھول گیا تھا جناب، لیکن اس کے بعد اور بھی کئی مقامات پر مجھ سے کام لیا جاتا رہا۔"

"ہاں ہاں بولے جاؤ۔ رکو مت۔" ایلڈرانٹ بے صبری سے کہنے لگا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا جیسے اس نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ "تم نے کل کتنے کیمپوں میں کام کیا؟"

"یہی کوئی دس بارہ ـــــ" میں نے یونہی کہہ دیا۔ "تاہم میں یقین سے ان کی صحیح تعداد نہیں بتا سکتا۔"

اتنے میں لیوکر ایک بڑا نقشہ لیئے کمرے میں آیا۔ نقشے کو میز پر پھیلا کر اس نے ایک پنسل مجھے دی اور کہا:

"نقشے پر ان تمام مقامات کی نشاندہی کرو جہاں جہاں فوجی کیمپ قائم تھے۔"

"جناب میں کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔" میں نے کہا۔

"بیوقوف کی اولاد! وقت مت ضائع کرو۔ جلدی نقشے پر نشان لگاؤ۔" لیوکر نے پھر گھونسہ میرے پیٹ میں مارا۔

"دیکھیئے جناب، اگر آپ مجھے اسی طرح گالیاں دیتے اور پیٹتے رہے تو میں مرجانا پسند کروں گا مگر زبان ہرگز نہ کھولوں گا۔"

"اچھا اچھا!" ایلڈرانٹ کہنے لگا۔ "اب نہیں ماریں گے مگر جلدی سے بتاؤ کہ وہ فوجی کیمپ کہاں کہاں تھے؟"

"ایک تو یہاں تھا۔" میں نے ہل کے قریب نشان لگایا۔ "اور یہاں بھی ایک ـــــ" اور پھر اسی طرح رکتے رکتے اور سوچتے سوچتے میں نے پورا نقشہ ہی پنسل کے نشانوں سے پُر کردیا۔ وہ دونوں حیرت سے اس نقشے کو دیکھ رہے تھے۔ پھر کہنے لگے:

"اچھا اب یہ بتاؤ کہ فوجی کیمپوں سے نکلنے کے بعد تم کہاں کہاں گئے اور کیا کیا دیکھا؟"

"جناب میں تین دن سے بھوکا پیاسا ہوں۔ اس دوران میں میری پٹائی بھی خوب ہوتی رہی ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ مجھے کچھ کھانے کے لیئے دیں اور تھوڑی دیر میں ستالوں۔ ممکن ہے اس طرح کچھ اور مفید باتیں آپ کو بتا سکوں۔"

دونوں نے قہر آلود نظروں سے میری طرف دیکھا اور چپ چاپ نقشہ اُٹھا کر باہر نکل گئے

چند منٹ بعد ایک شخص میرے لیئے کھانا لے کر آیا۔ کھانا اچھا خاصا تھا اور سگریٹ بھی دیئے گئے۔ گویا یہ ایک قسم کی رشوت تھی جو مجھے دی جارہی تھی اور میں بخوبی جانتا تھا کہ جب تک اپنا کھلایا پلایا وصول نہ کرلیں، یہ لوگ مجھے چھوڑنے والے نہیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں کمر سیدھی کرنے کے لیئے وہیں لیٹ گیا اور یہ سوچ کر مجھے ہنسی آگئی کہ اب یہ لوگ میری دی ہوئی خبروں کو نہایت جوش و خروش سے برلن بھیجنے کا اہتمام کررہے ہوں گے۔ لیکن برلن میں خفیہ پولیس اور وار آفس کے ریکارڈ سے ان کو جلد ہی پتہ چل جائے گا کہ میں نے ان کی معلومات میں کچھ بھی اضافہ تو نہیں کیا۔

دو دن خیریت سے کٹ گئے، لیکن تیسرے روز پھر مصائب کا پہاڑ مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ لیوکر اور ایلڈ انٹ غیظ و غضب میں بھرے ہوئے میری کوٹھڑی میں آئے اور اس قصور پر کہ میری دی ہوئی سب خبریں غلط نکلیں۔ مجھ پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کردی۔ اس دوران میں میں کئی مرتبہ بے ہوش ہوا۔ لیکن وہ پانی انڈیل انڈیل کر مجھے ہوش میں لاتے رہے۔ جب یہ تھک گئے تو مجھے اور سپاہیوں کے حوالے کردیا۔ دن بھر میری مرمت ہوتی رہی اور سورج غروب ہوتے ہی وہی دونوں موذی لیوکر اور ایلڈ انٹ میرے سامنے کھڑے تھے۔

"اٹھو بدمعاش جاسوس! تم یوں نہ مانو گے۔ ہم تمہیں گرینی بھیج رہے ہیں۔"

یہ سنتے ہی میری روح لرز گئی اور خون سمٹ کر کلیجے میں آگیا۔

"نہیں نہیں ایسا نہ کرو۔ میں آپ کو سب کچھ بتا چکا ہوں۔ خدا کے لیئے مجھ پر ظلم نہ کرو۔ اگر مجھے ہلاک کرنا ہی چاہتے ہو تو یہیں کردو مگر گرینی نہ بھیجو۔ وہ تو جہنم ہے جہنم۔"

"آہا" لیوکر مسکرایا۔ "تو تمہیں گرینی کی خوشگوار آب و ہوا سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"جناب میں کیا کسی بھی ناروین باشندے کو گرینی سے دلچسپی نہیں کیونکہ اب تک وہاں چالیس ہزار ناروین باشندے بھیجے جاچکے ہیں اور کوئی زندہ نہیں بچا۔"

"بس تو تم بھی اپنے ہم وطنوں کے پاس جانے کے لیئے تیار ہو جاؤ۔ یہاں اکیلے رہ کر کیا کروگے؟" لیوکر نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

مرتا کیا نہ کرتا، ان کے ساتھ ہولیا۔ راستے میں پھر خوشامد شروع کی:

"جناب میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس لیئے مجھ پر رحم کیجئے اور اس دوزخ میں نہ بھیجیے۔"

"خاک بتایا ہے تم نے۔" لیوکر نے میرے سر پر دھول جماتے ہوئے کہا۔ "تم اقرار کرو کہ یہاں جاسوسی کرنے آتے تھے۔"

"میں جاسوس ہرگز نہیں ہوں۔"

"پھر بکواس شروع کی تم نے؟" اس مرتبہ ایڈ انٹ کا گھونسہ میری پشت پر پڑا اور میں اوندھے منہ گرتے گرتے بچا۔ "اب تم جیسے مکّاروں کا علاج گرینی ہی میں ہو سکتا ہے۔"

ہیڈ کوارٹر کے بیرونی ہال میں بہت سے بدنصیب نارویجن بیٹھے تھے انہی میں مجھے بھی دھکیل دیا گیا۔ دروازے پر گسٹاپو کے دو مسلّح جرمن پہرہ دے رہے تھے۔ ایک آفیسر کونے میں میز لگائے کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ ان نارویجن لوگوں کی حالت دیکھ کر مجھے رومن عہد کے وہ غلام یاد آگئے جو اُن کے بحری جہازوں کو چلایا کرتے تھے۔ اُن کی حالت مُردوں سے بدتر تھی۔ فاقوں کے باعث اُن کے جسموں کی ایک ایک ہڈی آسانی سے گنی جا سکتی تھی۔ اکثر بُری طرح زخمی اور اپاہج تھے۔ کسی کا ہاتھ ٹوٹا ہوا تھا تو کسی کی ٹانگ۔ کسی کی ناک ٹوٹی ہوتی تو کسی کے چہرے پر ایسے گھاؤ جیسے وحشی درندے نے منہ نوچا ہو۔ بعض مظلوموں کی کھوپڑیوں سے اس وقت بھی لہو ٹپک رہا تھا۔ ان کی حالت دیکھتے ہی میں اپنی تکلیف بھول گیا اور میں نے سہم کر آنکھیں بند کر لیں۔ یکایک لیوکر کی آواز سُن کر میں نے آنکھیں کھولیں۔ وہ کہہ رہا تھا:

"بس یہ آخری کھیپ ہے۔" پھر میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔" اس بدمعاش کتے کا خاص خیال رکھنا۔" اور پھر اپنی تلخی مٹانے کے لیئے تھوک نگلتے ہوئے بولا۔" یہ جاسوس ہے اور اس خوش فہمی میں مبتلا کہ ہمیں بیوقوف بنا لے گا۔"

ٹائپ کرنے والے افسر نے مجھے گھور کر دیکھا اور لیوکر سے کہنے لگا:

"آپ فکر نہ کریں۔" پھر جلدی جلدی ٹائپ کرنے لگا۔ چند منٹ بعد اس نے ٹیلیفون پر کسی سے باتیں شروع کر دیں:

"ٹرک ابھی تک کیوں نہیں آیا؟ —— نہیں ہم انتظار نہیں کر سکتے۔ جہنّم میں جاؤ تم۔ ہم

انہیں پیدل ہی لے جائیں گے۔"

"اس نے غصّے سے ٹیلی فون بند کر دیا۔ اور اپنی میز کے پیچھے رکھی ہوئی ہتھکڑیوں والی آہنی زنجیر اُٹھا میرے پاس آیا اور بولا:"

"تو تم خاص توجّہ کے مریض ہو؟ فکر نہ کرو ہم تمہیں سب سے آخر میں باندھیں گے۔"

اتنے میں چار پانچ مسلّح محافظ اور آ گئے۔ اور انہوں نے گھونسوں، لاتوں اور گالیوں کی بوچھاڑ کے ذریعے تمام نارویجن لوگوں کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ اور اُن کو ہتھکڑیاں پہنانے لگے، انہی کے ساتھ مجھے بھی باندھ دیا گیا۔ اور چلنے کا اشارہ کیا گیا۔ دفعتہً وہی ٹائپسٹ محافظوں سے کہنے لگا:

"ذرا ٹھہرو اور اسے واپس میرے پاس لاؤ۔"

اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ محافظوں نے مجھے آزاد کر دیا۔ میں ٹائپسٹ کی میز کے قریب پہنچا تو وہاں میرا سفری تھیلا پڑا تھا۔

"پڑھنا جانتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"معمولی سا۔" میں نے جواب دیا۔ میں حیران تھا کہ اب انہیں کون سی نئی شرارت سوجھی ہے۔

اتنے میں اس نے ایک لمبے کاغذ پر چند سطریں ٹائپ کیں۔ پھر میز کی دراز سے دو اور کاغذ نکال کر میرے حوالے کیے:

"یہ لو، یہ رہا تمہارا راشن کارڈ اور یہ تمہارے شناختی کاغذات ہیں —— اب اس پتے پر پہنچ جاؤ۔ یہ تمہاری قیام گاہ ہے اور تمہاری ڈیوٹی بندرگاہ پر لگائی گئی ہے۔ ان کاغذوں کو گم نہ کرنا اور ہر روز شام کو پانچ بجے نزدیکی پولیس اسٹیشن پر حاضری دیا کرنا۔ جاؤ اب یہاں سے دفان ہو جاؤ۔"

میں کاغذ ہاتھ میں لیے احمقوں کی طرح منہ کھولے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میری عقل حیران تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے مجھے پھر کھڑے پایا تو وہ کہنے لگا:

"اگر تم دو منٹ کے اندر اندر یہاں سے نہ گئے تو میں یہ کاغذ چھین کر واقعی تمہیں گرینی بھیج دوں گا۔ چلو بھاگو۔"

تھیلا اٹھا کر میں نے کندھے پر ڈالا، کاغذ پتلون کی جیب میں ٹھونسے اور دروازے سے

باہر نکل گیا۔ اس وقت میرا ذہن کام ہی نہیں کر رہا تھا۔ نازیوں کے اس بدلے ہوئے رویتے کا سبب دریافت کرنا چاہتا تھا، مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ تن بہ تقدیر ایک طرف کو چل کھڑا ہوا۔ یکایک خیال آیا کہ مجھے آزاد کرنے کا ایک مقصد ہے۔ اس طرح اب یہ لوگ میری سرگرمیوں کا مطالعہ کریں گے۔ اور پھر یک لخت میں اپنے انجام کو پہنچا دیا جاؤں گا۔ یقیناً یہی بات ہے۔

مجھے انکر کے نواح میں ایک بورڈنگ ہاؤس کی تلاش تھی۔ دو گھنٹے بعد میں اس عمارت کے سامنے کھڑا تھا۔ یہاں کا انتظام ایک لمبوترے چہرے والی نارویجن عورت کے ہاتھ میں تھا۔ اُسے جب معلوم ہوا کہ میرے پاس نارویجن کرنسی نہیں تو اس نے مجھے بورڈنگ میں کمرہ دینے سے انکار کر دیا۔ جوں ہی میں نے گسٹاپو کی طرف سے دیئے گئے راشن کارڈ، شناختی کاغذات اور اس بورڈنگ ہاؤس کا پتہ دکھایا تو خوف سے اس کا رنگ اڑ گیا۔ وہ فوراً مجھے ایک کمرے میں لے گئی اور بولی:

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو گھنٹی بجا دینا۔"

پہلے ہی دن مجھے پتہ چل گیا کہ اس بورڈنگ میں رہنے والے سب کے سب گسٹاپو کی نظروں میں مشکوک ہیں اور منتظمہ مسز فوزلنگ کا کام یہ ہے کہ ان لوگوں کی سرگرمیوں کے بارے میں گسٹاپو کو خبریں بھجواتی رہے۔ میرا کمرہ کسی طرح بھی جیل کی کوٹھڑی سے کم نہ تھا۔ گھٹا گھٹا سا ماحول بوسیدہ فرنیچر اور باسی کھانا۔ گسٹاپو نے میری ڈیوٹی بندرگاہ پر لگائی تھی۔ میں حیران تھا کہ جنگی نقطۂ نگاہ سے بندرگاہیں تو بڑی اہم جگہ ہوتی ہیں پھر میری ڈیوٹی بندرگاہ پر کیوں لگائی گئی؟ اس کی صرف ایک ہی وجہ نظر آتی تھی کہ انہیں میرے جاسوس ہونے کا پورا پورا یقین تھا اور مجھے بندرگاہ پر بھیج کر وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ میں زیرِ زمین سرگرمیاں جاری رکھنے والے گروپ سے رابطہ قائم کرتا ہوں یا نہیں اور پھر اس طرح انہیں پورے گروپ کو پکڑنے کا موقع مل جائے گا۔ بہرحال مجھے آزاد کرنے کی کوئی بھی وجہ ہو، پھونک پھونک کر قدم اٹھانا ہوگا۔ انہی خیالات کے ہجوم میں نیند آ گئی اور میں دکھتی ہوئی پسلیوں کو سہلاتا ہوا سو گیا۔

اگلے روز علی الصباح حوائج ضروریہ اور ناشتے سے فارغ ہو کر میں پائیر کو گیا اور آدھی درجن جگہوں پر اپنے شناختی کاغذات دکھانے کے بعد ایک جرمن آفیسر تک پہنچ گیا جس کے قریب

ہی چند نارویجن مزدور کھڑے تھے ۔ اس نے اپنی فہرست میں میرا نام چیک کیا اور کہنے لگا، "سامانِ رسد کو پیک کرنا جانتے ہو؟"

"جی ہاں! میں ایک ماہر بڑھئی ہوں۔ لیکن میرے پاس اوزار نہیں ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"پرواہ نہیں —— سپلائی سٹور سے تمام اوزار مل جائیں گے۔" وہ میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "مگر یاد رکھنا پیکنگ ٹوٹی یا ڈھیلی رہ گئی تو تمہاری کھال کھینچ لی جائے گی۔"

اُس سے چھٹ لے کر میں سپلائی اسٹور پر گیا اور ضروری اوزار لے کر نارویجن مزدور کے ساتھ ہی ہو لیا اور پھر دن بھر ایک بڑے باربردار بحری جہاز پر کام کرتا رہا۔ میری ڈیوٹی ہفتوں اسی جگہ لگی رہی۔ میں نے پوری تندہی اور محنت سے کام کیا۔ شام کو چھٹی ہوتے ہی میں ایکروپولیس اسٹیشن حاضری دینے جاتا۔ بلاناغہ حاضری دینے اور دیانت داری سے اپنی ڈیوٹی ادا کرنے کا نتیجہ خوش گوار نکلا۔ بندرگاہ کے جرمن آفیسر، سپاہی اور پولیس اسٹیشن کا عملہ مجھ سے خاصا بے تکلف ہو گیا۔ میں نے اس دوران میں جرمن زبان پر بھی عبور حاصل کر لیا۔

اتوار کو بندرگاہ پر چھٹی ہوتی اور میں اس روز اِدھر اُدھر آوارہ پھرتا اور دوستوں سے گپ شپ میں دن کٹ جاتا۔ جب بندرگاہ پر کام کرتے کرتے پانچ ہفتے بیت گئے تو میں سوچنے لگا کہ میرا مشن تو اس طرح ناکام ہو جائے گا، جلد کوئی قدم اٹھانا چاہیئے لیکن یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا قدم اُٹھاؤں۔ مجھے علم تھا کہ اوسلو میں "کمپنی" کے کارندے موجود ہیں، لیکن ان سے رابطہ قائم کرنے کا کوئی آسان راستہ ذہن میں نہ آتا تھا اور اس کام میں صریحاً جان کا خطرہ تھا، کیونکہ مزدوروں میں بھی گسٹاپو کے بہت سے جاسوس کام کر رہے تھے۔

اسی ادھیڑبن میں نومبر کا مہینہ شروع ہو گیا اور میں بدستور بندرگاہ پر کام کر رہا تھا۔ اس طویل عرصے میں اگرچہ بہت سے نارویجن مزدور میرے دوست بن چکے تھے لیکن میں دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ ممکن ہے جسے میں رازدار بناؤں وہی گسٹاپو کا آدمی نکلے۔ اس کے بعد تو یہ سوچنا بھی حماقت تھی کہ مجھے زندہ چھوڑ دیا جائے گا۔

نومبر کے آخر میں ہلکی ہلکی بارش اور برف باری شروع ہو گئی۔ ایک روز جب میں کام پر جانے کے لیے ٹرالی میں بیٹھا تو میں نے دیکھا کہ وہ سب کے سب مزدور جو ٹرالی پر سوار

ہیں میرے لیے اجنبی ہیں۔ مزدوروں کا یہ نیا گروپ تھا جو شاید پہلی بار بندرگاہ پر بھیجا جا رہا تھا۔ یہ لوگ نہایت بے فکری سے غُل غپاڑے اور دھینگا مشتی میں مصروف تھے۔ برف کے گولے بنا بنا کر ایک دوسرے پر پھینکتے رہتے۔ اُس روز میری ڈیوٹی ایک نئے جہاز پر لگائی گئی تھی جو اگلے روز ہی بندرگاہ میں آیا تھا۔ جنگی ساز و سامان کی بھاری کھیپ اس جہاز پر لادی جا رہی تھی۔ کام کی زیادتی اور جلدی کی وجہ سے انہوں نے ایک اور بڑھئی میرا ہاتھ بٹانے کے لیے مقرر کر دیا تھا۔ میں نے اس بڑھئی کو اکثر بندرگاہ پر کام کرتے دیکھا تھا اور ایک دو بار اس سے علیک سلیک بھی ہو چکی تھی۔ اس سیاہ بالوں والے بھاری بھر کم بڑھئی کا نام تھورو الڈ تھا اور بہت محنتی اور منجھا ہوا کاریگر تھا۔

جہاز پر پہنچتے ہی ہم دونوں کام میں جُت گئے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ میرا ساتھی کچھ بے چین اور گھبرایا ہوا ہے۔ اس کے ہاتھ کی ضرب صحیح جگہ نہیں پڑ رہی تھی۔ میں نے اس سے اِس بے چینی کا سبب پوچھنا چاہا مگر کچھ سوچ کر خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ میں نے ایک شہتیر کاٹا اور تھورو الڈ نے اسے تکونی شکل میں جوڑ کر ایک کریٹ کے زیریں حصے میں نصب کر دیا تاکہ وہ ہل نہ سکے۔ کریٹوں کی بھاری تعداد اتاری جا رہی تھی لہٰذا ہم نے موٹی موٹی لکڑیوں سے چوکھٹے بنا کر کریٹوں کو ان میں جمانا شروع کیا۔ میں چار، پانچ مربع کی ایک لکڑی آرے سے کاٹ رہا تھا کہ تھورو الڈ چپکے سے ایک طرف کھسک گیا۔ چند لمحوں بعد میں بھی دبے پاؤں اس کے پیچھے ہو لیا۔ تھورو الڈ اتنی ہی دیر میں جہاز کے دوسرے عرشے پر پہنچ چکا تھا جہاں اسلحہ جمع کیا جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ تھورو الڈ نہایت اطمینان سے لکڑی کے ایک خانے میں دھات کا بنا ہوا لمبوترا سا ڈبہ ٹھونک رہا تھا۔ جوں ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی، اس نے ہتھوڑا میری طرف پوری قوت سے پھینک کر مارا۔ میں اگر فوراً اُچھل کر ایک طرف نہ ہٹ جاتا تو میری کھوپڑی پاش پاش ہو جاتی۔ ہتھوڑا سامنے لگے ہوئے ایک شہتیر میں پیوست ہو گیا۔

"کیا کرتے ہو؟ پاگل ہوتے ہو۔ ذرا میری بات تو سُن لو۔" میں نے آہستہ سے کہا لیکن وہ تو غصے سے واقعی پاگل ہو رہا تھا۔

"میں تمہیں زندہ نہ چھوڑوں گا۔" اس نے کہا اور قریب پڑا ہوا ایک شہتیر اٹھا کر میری طرف پھینکا۔ میں نے یہ وار بھی خالی دیا۔ اب اس نے خود کسی جنگلی بھینسے کی طرح مجھ پر چھلانگ لگائی۔ میں ادھر مستعد تھا۔ دائیں ہاتھ کا گھونسہ پورے زور سے اس کے پیٹ پر مارا۔ وہ درد سے دوہرا ہو گیا۔ میرا دوسرا مکّہ اس کی ٹھوڑی پر پڑا، پھر تیسرا اور چوتھا۔ وہ تیورا کر گرا لیکن فوراً ہی اٹھا۔ اس کے منہ اور ناک سے خون کی تلّیاں جاری تھیں۔ اس نے اٹھتے ہی بھرے ہوئے چیتے کی طرح مجھ پر چھلانگ لگائی لیکن میں دست بدست جنگ کا ماہر تھا۔ اس دفعہ میں نے اسے فرش پر لٹا دیا۔ میں نے نازیوں سے کھائی ہوئی مار کا بدلہ ٹھوررڈالڈ پر خوب اتارا۔ جب دیکھا کہ وہ بے ہوش ہو گیا ہے تو میں نے جلدی سے ایک خالی کریٹ اس پر رکھ دیا اور پھرتی سے اس دھات کے ڈبے کو اکھاڑ کر جس میں ٹائم بم چھپا ہوا تھا، قریب ہی پانی سے بھرے ہوئے ڈرام میں پھینک دیا۔ اس کے بعد میں نے تین چار خالی کریٹ ٹھوررڈالڈ پر گرا دیئے اور حلق پھاڑ کر چلّایا:

"بچاؤ ——— بچاؤ ——— بچاؤ۔"

اوپر کھڑا ہوا ایک ملاح میری پکار سن کر دوڑا ہوا آیا۔ پھر ایک جرمن سپاہی نے نیچے جھانک کر دیکھا:

"کیوں گدھے کی طرح چلّا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میرا ساتھی کریٹوں کے نیچے دب گیا ہے۔"

یہ سن کر کئی سپاہی دوڑتے ہوئے آئے اور کریٹ اٹھانے لگے۔ جب آخری کریٹ اٹھایا گیا تو اس کے نیچے سے ٹھوررڈالڈ برآمد ہوا۔ اس کا چہرہ جاپان کا نقشہ بنا ہوا تھا۔

"یہ شخص کریٹوں تلے کس طرح دب گیا؟" ایک سپاہی نے پوچھا۔

ہم نیچے کام ختم کر کے اوپر آئے اور ان کریٹوں کے لئے بریکیٹ بنا رہے تھے کہ اچانک خالی کریٹ ہم پر آ پڑے۔"

"کیسی بے پروائی سے کام کرتے ہو تم۔" جرمن سپاہی چلّایا۔ "دیکھو وہ کس بری طرح سے زخمی ہو گیا ہے۔"

"میں اُسے ابھی ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں۔" میں نے کہا۔
"اور یہاں کام تمہارا باپ کرے گا؟" اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔
"اتنے میں ایک اور مزدور بول پڑا:
"آپ انہیں ڈاکٹر کے پاس جانے دیں، میں یہاں کام کروں گا۔ میں بڑھئی کا کام جانتا ہوں۔"
"بہت بُرا ہوا۔" میں نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔ "بہت بُرا ہوا، تھورو والڈ کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ضروری ہے۔"
"اسے ہوش آرہا ہے۔" ایک ملاح نے کہا
"میں نے جُھک کر تھورو والڈ کے زخموں سے خون پونچھنا شروع کر دیا اور فوراً ہی اسے باتوں میں لگالیا:
"بہت ہولناک حادثہ پیش آیا ہے۔ کیا تم چل سکتے ہو میرے دوست؟"
میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور اسے آہستہ آہستہ اپنے ساتھ لے چلا:
"چلو تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔"
پہلے عرشے پر آکر تھورو والڈ نے اپنا بازو میری گردن میں ڈال دیا۔
"وہ ٹائم بم میں نے پانی میں پھینک دیا ہے۔" میں نے اُس کے کان میں کہا۔
"خدا کے لئے چُپ رہو۔" تھورو والڈ بڑبڑایا۔ "میں اب بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ تمہاری مہربانی سے تھوڑا سا خون نکلا ہے اور دو تین دانت اکھڑے ہیں۔" اس نے آستین سے ہونٹ پونچھتے ہوئے کہا: "مجھے براہ کرم تنہا چھوڑ دو۔"
"بکواس بند کرو، ورنہ میں تمہاری گردن توڑ دوں گا۔ میں تمہیں یہاں سے باہر لے جانا چاہتا ہوں تاکہ ہم اطمینان سے بات کر سکیں۔ بس مجھ پر اسی طرح جُھکے رہو اور اپنے چہرے پر سخت تکلیف کے آثار پیدا کرو تاکہ وہ تمہیں زخمی سمجھیں۔"
"تم مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہو؟" تھورو والڈ نے پوچھا۔
"میں تمہارے گروپ کے آدمیوں سے ملنا چاہتا ہوں۔"

یہ سُن کر تھورو الڈ کو جیسے برقی جھٹکا لگا۔ اور وہ مجھے چھوڑ کر یوں پرے ہٹ گیا جیسے میں کوئی بھوت تھا۔

"کیا بکتے ہو؟ گروپ؟ کیسا گروپ؟" اس نے کہا۔

"یار شور نہ مچاؤ، ورنہ یہ سب لوگ ہماری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ فکر نہ کرو میں تمہارا دوست ہوں اور "کمپنی" کی طرف سے آیا ہوں۔"

وہ پھر میرا سہارا لے کر چلنے لگا اور ہم دونوں خاموشی سے کارل جون اسٹریٹ تک آ گئے۔ یہاں آ کر وہ کہنے لگا:

"میں آگے آگے چلتا ہوں۔ تم میرے پیچھے چلے آؤ۔"

تھوڑی دور جا کر ہم ٹرالی میں بیٹھ گئے اور الیول پہنچ کر پھر پیدل چلنے لگے۔ چند قدم چلنے کے بعد تھورو الڈ ایک عمارت میں گھسا۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ تیسری منزل پر پہنچ کر اُس نے ایک دروازے پر مخصوص انداز میں تین بار دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور کمرے کے اندر دس بارہ عورتیں اور مرد چولہے کے گرد بیٹھے دکھائی دیئے۔

"یہ میرا دوست ہے۔" تھورو الڈ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

جب میں کمرے میں داخل ہو گیا تو ایک قد آور لحیم شحیم آدمی نے اُٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی تین چار آدمی میری طرف لپکے اور انہوں نے لاتوں اور مکّوں سے میری تواضع شروع کر دی، اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ لوگ جان لے کر ہی رہیں گے۔ میں نے بے ہوش ہو جانا ہی مناسب خیال کیا۔ جب میں جان بوجھ کر بے ہوش ہو گیا تو یہ مرد عورتیں آپس میں یوں باتیں کرنے لگے۔ ایک عورت نے رائے دی:

"برف توڑنے کا سُوا اس کی گردن میں بھونک دو۔ اس طرح جلد ہی قصہ پاک ہو جائے گا۔"

"نہیں ابھی ہمیں انتظار کرنا چاہیئے۔ ممکن ہے یہ شخص ہمیں کچھ مفید باتیں بتا سکے۔"

"یہ کہتا تھا کہ اِسے کمپنی نے بھیجا ہے۔" تھورو الڈ کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

"لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی نازی بہروپیا ہو اور کمپنی کی آڑ لے کر ہماری ٹوہ میں آیا ہو۔"

یکا یک میں نے آنکھیں کھول دیں اور وہ سب میری طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ مجھے یقیناً

نازی جاسوس سمجھ رہے تھے۔

"سچ سچ بتاؤ تم کون ہو؟ اور اگر تم نے دھوکہ دینے کی کوشش کی تو ہم تمہیں زمین میں زندہ دفن کر دیں گے۔"

"تم سب بے وقوف ہو۔ فرض کرو اگر میں نازی جاسوس ہوا تو کیا تمہارا خیال ہے کہ میں اکیلا ہی یہاں آگیا ہوں گا۔ بہرحال ڈرو نہیں مجھے کمپنی نے بھیجا ہے۔ اگر تمہارے پاس کمپنی سے رابطہ قائم کرنے کا کوئی ذریعہ ہے تو تم کمپنی سے میرے بارے میں پوچھ سکتے ہو۔"

"تمہارا کوڈ نمبر اور اس کا جواب کیا ہے؟"

میں نے کوڈ نمبر بتایا۔ وہ سب چند لمحے تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے آخر ایک شخص نے کہا:

"ہم ابھی کمپنی سے پوچھ لیتے ہیں۔ اگر وہاں سے تسلی بخش جواب ملا تو ہم تمہارے ساتھ تعاون کریں گے لیکن دوسری صورت میں خواہ تم ہٹلر کے دستِ راست ہی کیوں نہ ہو ہم تمہیں ابھی اور یہیں قتل کر دیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ میز کے پاس رکھے ہوئے ایک لیمپ کی طرف گیا۔ اس میں دو تین تار جوڑنے کے بعد اس نے ایک تار بالکونی کے باہر لٹکا دیا اور ایک تار قریب رکھے ہوئے گملے کی مٹی میں ٹھونس دیا۔ چند منٹ کے اندر اندر یہ لیمپ ایک طاقت ور ریڈیو ٹرانسمیٹر میں تبدیل ہو گیا۔ موٹا آدمی اپنی خفیہ زبان میں کچھ الفاظ مسلسل بول رہا تھا۔ تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد وہ کمپنی سے رابطہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے بتائے ہوئے کوڈ نمبر اس نے کئی مرتبہ دہرائے اور یقیناً اسے وہی جواب بھی ملا جو میں نے بتایا تھا کیونکہ اس کا چہرہ ایک دم روشن ہو گیا تھا۔ کمرے میں موت کا سا سکوت طاری تھا اور سبھی لوگ بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ غالباً انہیں کسی اور پیغام کا بھی انتظار تھا۔ معاً موٹے آدمی نے ریڈیو بند کر دیا اور مجھ سے مخاطب ہوا:

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں گرونگ جانا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"وہاں میرا زرعی فارم ہے اور میں اس پر قابض ہونا چاہتا ہوں۔"

"تمہیں وہاں جانے کا اجازت نامہ نہیں ملا؟"

"نہیں کئی بار کوشش کر چکا ہوں مگر کامیابی نہیں ہوئی۔"

"اجازت نامہ میں دلوا دوں گی۔ میں ان جرمن آفیسروں کی رگ رگ سے واقف ہوں"
ایک نوجوان لڑکی بول پڑی۔

آدھ گھنٹے میں میرا ان سب سے تفصیلی تعارف ہو چکا تھا۔ معلوم ہوا کہ کمپنی کے زیرِ ہدایت اوسلو میں بہت سے گروپ کام کر رہے ہیں اور ایک دن پروگرام کے مطابق یہ بندرگاہ کو تباہ کر دیں گے۔ مجھے ان لوگوں نے بتایا کہ ان کے پاس اسلحے کی کافی مقدار بھی موجود ہے۔ انہوں نے بتایا کہ نسوس کے قریب ہی نازی آب دوزوں کے کئی اڈے کام کر رہے ہیں لیکن ان اڈوں کی سختی سے نگرانی کی جاتی ہے۔ اور وہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا حتیٰ کہ وہاں عام جرمن سپاہیوں کو بھیجنے سے بھی پرہیز کیا جاتا ہے۔ کمپنی چاہتی ہے کہ ان اڈوں کو تباہ کر دیا جائے لیکن حقیقت میں یہ کام بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

"دوستو! سچ پوچھو تو میں آیا اسی کام سے ہوں۔" میں نے کہا۔

"لیکن آپ اکیلے کیا کر سکیں گے؟" موٹے نے پوچھا۔ "فرض کیجئے آپ کو گرونگ جانے کی اجازت مل جاتی ہے پھر آپ نسوس کیسے جائیں گے اور جب تک نازی آب دوزوں کے خفیہ اڈوں کے نقشے اور دوسرے کاغذات حاصل نہ ہوں، کمپنی بھی کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔"

"بہر حال میرا کام کوشش کرنا ہے۔ اگر میں گرونگ پہنچ گیا تو وہاں کے گروپ سے معلومات حاصل کر دوں گا۔ اس کے بعد جو کرنا ہو گا کیا جائے گا۔"

"آؤ اب جہاز پر واپس چلیں۔ ان کم بختوں کو اگر ذرا بھی شک ہو گیا تو سارا کام چوپٹ ہو

جائے گا۔" بھتوروالڈ نے کہا

"بھئی مجھے تم سے بھی معذرت کرنی ہے، تم خواہ مخواہ زخمی ہو گئے۔"

"کوئی بات نہیں۔" پھیکی ہنسی اُس کے لبوں پر پھیل گئی۔ "ہم لوگ تو ان باتوں کے اب عادی ہو چکے ہیں۔"

اس واقعے کے بعد میرے معمولات بدستور قائم رہے بلکہ نازی افسروں نے تو میری طرف سے مطمئن ہو کر نگرانی بھی بہت کم کر دی تھی۔ کبھی کبھار گروپ کے ارکان سے ملاقات بھی ہو جاتی۔ اُس نوجوان لڑکی نے خدا جانے کیا منتر پھونکا کہ تین روز ہی مجھے گرونگ جانے کا پرمٹ مل گیا اور میں اسی دن اپنا تھیلا سنبھالا وستبانا گارڈ کے ریلوے سٹیشن پر پہنچ گیا۔ گاڑی میں بیٹھا تو سارے راستے جرمن سپاہی شناختی کاغذوں کی جانچ پڑتال کرتے رہے۔ گاڑی کا انجن بہت پرانا تھا اور اس میں کوئلے کی بجائے لکڑی جلائی جاتی تھی۔ گرد ماکی زیریں وادیوں سے گذر کر ریل ٹرنڈھیم کے پہاڑی علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔ ان پہاڑوں کے بعد مرغزاروں کا طویل سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ جو ناروے کے مرکزی علاقے ٹرونڈھیم سے سالٹ فیورڈ تک تین سو میل لمبے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں اور گرونگ اس سارے سفر کے ایک تہائی حصّہ میں واقع تھا۔ ڈھائی گھنٹے بعد ریل گرونگ کے اسٹیشن پر رُکی۔ اسٹیشن کی عمارت، پلیٹ فارم اور شیڈ سب لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ لیفٹننٹ بشولٹر کی ڈیوٹی اسٹیشن پر تھی جو یہاں نازی افواج کا کیپٹن کمانڈر تھا۔ اس نے خوب غور سے میرے کاغذوں کا معائنہ کیا اور دیر تک مختلف سوالات پوچھتا رہا۔ آخر میں کہنے لگا:

"تم اپنے زرعی فارم پر رہ سکتے ہو مگر اس علاقے میں مقیم فوج سے تمہیں بہر حال تعاون کرنا ہو گا۔ جو کچھ تمہیں اگلے سال کاشت کرنا ہے، اس کے بارے میں نوٹس دے دیا جائے گا اور یہ بھی بتا دیا جائے گا کہ فصل میں فوج کا حصّہ کتنا ہو گا اور کان کھول کر سُن لو کہ ہمارے حُکم سے سرِ مُو انحراف کی عبرت ناک سزا دی جاتی ہے۔ سمجھ گئے؟"

"سمجھ گیا جناب! آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہ ملے گا۔"

شہر میں داخل ہوتے ہی ہولناک تباہی نے میرا استقبال کیا۔ اکثر عمارتیں شدید بمباری

کے باعث کھنڈروں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ اگرچہ میں عمر میں پہلی مرتبہ اس شہر میں آیا تھا لیکن مسٹر ہُک کے رٹائے ہوئے سبق یاد کر کے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کا چپہ چپہ میرا جانا پہچانا ہے۔ کسی سے پتا پوچھے بغیر ہی میں بازار اور گلیاں طے کرتا ہوا اپنے آبائی مکان تک پہنچ گیا۔ مکان کیا تھا ملبے کا ایک اُونچا سا ڈھیر تھا جس پر حسرت برس رہی تھی۔ میں ابھی اسے تعجب سے دیکھ ہی رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی۔

"بجورن! میرے بچے کیا تم واپس آ گئے؟"

میں نے مڑ کر دیکھا کہ ایک ناٹے قد کا سکڑے چہرے والا بڈھا جس کے سر پر ایک بھی بال نہ تھا، میری طرف آ رہا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ شخص کارل لینڈوِک ہے کیونکہ مسٹر ہُک نے اس کا حلیہ خوب میرے ذہن نشین کرا دیا تھا۔

"جی ہاں، میں ہی بدنصیب بجورن ہوں۔" میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "مگر مجھے واپس آکر بہت دکھ ہوا ہے۔"

"بے شک اپنے مکان کی تباہی پر دُکھ ہونا ہی چاہیئے۔" بڈھا بھی رنجیدہ ہو گیا۔ "میں نے سُنا تھا کہ تم نارِوک کے میدان میں زخمی ہو گئے تھے۔ میں تمہارا چہرہ دیکھ رہا ہوں، کتنا بدل گیا ہے، افسوس۔"

"فکر نہ کرو چچا کارل! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جان ہے تو جہان ہے۔ گھر تباہ ہوا تو کیا، فارم تو صحیح سلامت ہے۔"

"ہاں تم اس میں قیام بھی کر سکتے ہو، لیکن کھانے پینے کا انتظام کہاں سے کرو گے؟ بغیر کام کاج کے تو کچھ نہ بن سکے گا۔"

"چچا اب میں آیا ہوں تو کچھ نہ کچھ کروں گا۔ ہاں یہ بتاؤ گریٹا کیسی ہے؟" میں نے موضوع بدلنا چاہا۔

"گریٹا اچھی ہے۔ تمہیں اکثر یاد کرتی ہے۔ میرے اسٹور ہی پر کام کرتی ہے۔ جنرل گاربو اسے بہت پسند کرتا ہے۔ کبھی کبھی وہ کھانا اور شراب لے کر جنرل گاربو کی قیام گاہ پر جاتی ہے۔ جنرل نے اُس سے وعدہ کیا ہے کہ جنگ ختم ہونے کے بعد وہ گریٹا سے شادی کر لے گا۔"

یہ سُن کر میرے کان کھڑے ہوتے۔ گریٹا بڈھے کارل کی نوجوان اور حسین لڑکی تھی جس کا کبھی بجورن سے معاشقہ بھی چلا تھا۔ اور اب مجھے بجورن کا کردار نبھاتے ہوئے اس قصے کو بھی از سرِ نو زندہ کرنا تھا۔

"جنرل گاربو کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ یہاں جرمن ملٹری کا سب سے اعلیٰ کمانڈنگ آفیسر ہے۔ ابھی نوجوان ہی ہے اور سُنا ہے کہ جنرل گوئرنگ کا قریبی عزیز ہے۔"

"اچھا چچا کارل! اب میں چلتا ہوں۔ رہنے کا بندوبست کر لوں تو آپ کو سب گذشتہ حالات سناؤں گا اور گریٹا سے بھی ملوں گا۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت خود بخود میری رہنمائی کر رہی ہے۔ گریٹا کے ذریعے جنرل گاربو پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ خود گریٹا "کمپنی" کی زیرِ ہدایت کام کر رہی ہو۔ مجھے گریٹا سے جلد از جلد ملنا چاہیے۔ ان ہی خیالات کے گرداب میں غوطے کھاتا ہوا ... اپنے فارم کی طرف چل دیا۔

میرا فارم شہر سے چار میل دور پہاڑیوں کے دامن میں واقع تھا۔ یہاں "سمر ہاؤس" طرز کے مکان بنے ہوئے تھے اور ان کی چھتیں ڈھلوان تھیں۔ اس جگہ بہت سے لوگ ملے جن سے علیک سلیک ہوئی اور سبھی نے میری آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔ میں اپنے فارم کے کنارے بنے ہوئے مکان میں داخل ہوا جس کے بوسیدہ فرنیچر، برتنوں اور دوسرے سامان پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ سامان کو جھاڑ پونچھ کر درست کیا۔ اپنے سفری تھیلے سے سوکھی روٹی اور پنیر نکال کر کھایا۔ اور دری کے فرش پر لیٹ کر سو گیا۔ صبح سویرے آنکھ کھلی تو ایک پڑوسی کسان ناشتہ لئے میرے سامنے کھڑا تھا۔ شکریے کے ساتھ یہ ناشتہ قبول کیا اور کپڑے پہن کر شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ تمام راستے گریٹا کے متعلق سوچتا رہا۔ مجھے خوف تھا کہ اگر اس نے پہچان لیا کہ میں اصلی بجورن نہیں ہوں تو بہت بُرا ہو گا۔ نہ معلوم وہ کس مزاج کی لڑکی ہے۔ مجھے بہت سوچ سمجھ کر قدم اُٹھانا ہو گا۔

کارل کے اسٹور میں داخل ہوتے ہی میرا اور گریٹا کا آمنا سامنا ہوا۔ مجھے دیکھ کر اس

کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوتی اور میری حالت یکایک اس چور کی سی ہو گئی جسے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہو۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھا۔

"آہ! بجورن — " گریٹا چلائی "تم آگئے؟"

"ہاں گریٹا! زندگی کے کچھ دن ابھی باقی تھے۔ تمہیں دوبارہ دیکھے بغیر مرنا کچھ اچھا معلوم نہ ہوا۔"

وہ زور سے ہنسی اور بولی:

"تم اب بھی شرارت سے باز نہیں آتے۔ آؤ اندر کمرے میں چل کر بیٹھو۔ ابھی پاپا آجائیں گے تو میں اُن کو کاؤنٹر پر چھوڑ کر تمہارے پاس آجاؤں گی۔"

میں اندر کمرے میں ایک کوچ پر بیٹھ گیا اور گریٹا کے بارے میں سوچنے لگا لڑکی بلاشبہ نہایت ہوشیار اور چالاک ہے۔ کیا خبر وہ گسٹاپو سے ملی ہوئی ہو تبھی وہ جنرل گاربو سے رسم و راہ رکھتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے بڈھے کارل کی آواز سُنی۔ گریٹا اس سے کہہ رہی تھی:

"پاپا! بجورن مجھ سے ملنے آیا ہے۔ تم ذرا یہاں ٹھہرو۔ میں اس کا حال احوال پوچھ لوں۔ بے چارہ بہت اداس لگتا ہے۔"

"ہاں ہاں اسے دلاسا دو کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اُسے جس چیز کی ضرورت پڑے، اسٹور سے لے سکتا ہے۔ پیسے بعد میں دے دیگا۔"

گریٹا کمرے میں آئی تو اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ میرے پاس بیٹھ کر چند لمحے گردن جھکائے کچھ سوچتی رہی، پھر یکایک بولی:

"مسٹر بجورن! تمہارے آنے کی خبر مجھے چند روز قبل ہی اوسلو کے بعض دوستوں سے مل گئی تھی۔ اب غور سے میری بات سنو اور یاد رکھو۔ میں جانتی ہوں کہ تم کمپنی کی طرف سے کس مشن پر آئے ہو۔ مسٹر بک نے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں یہاں کے گروپ کی انچارج ہوں اور اب تک بہت سے مراحل کامیابی سے طے کر چکی ہوں۔ میں نے بڑی تگ و دو سے گسٹاپو کے ارکان، بعض بڑے فوجی آفیسروں اور جنرل گاربو کو بھی شیشے میں

اتار لیا ہے۔ آج دسمبر کی آٹھ تاریخ ہے، پرسوں یعنی دس تاریخ کو منسوس اور گرونگ میں فوجی افسروں اور سپاہیوں کے تبادلے ہونگے۔ پرانے آدمیوں کی جگہ نئے آدمی ڈیوٹی پر آجائیں گے۔ کیا تم جرمن زبان روانی سے بول سکتے ہو؟"

میں نقشِ حیرت بنا گریٹا کی بات سن رہا تھا۔ اتنی دہشت مجھ پر طاری تھی کہ بیان سے باہر —— اس کے سوال پر زبان سے کچھ نہ کہہ سکا، البتہ اثبات میں گردن ہلادی۔ وہ کہنے لگی:

"اس دوران میں میں نے جنرل گاربو کے کمرے کی تلاشی لے کر آب دوزوں کے خفیہ اڈوں کے کئی نقشے حاصل کر لیے ہیں اور انہیں گرونگ کے گروپ کی معرفت کمپنی تک پہنچا دیا ہے۔ اب وہاں سے ہمیں یہ ہدایت ملی ہے کہ اگر ممکن ہو تو ان اڈوں کو تباہ کر دیا جائے۔ اتحادی بمبار طیارے ۱۰ دسمبر کو آدھی رات کے وقت منسوس اور اس کے نواحی علاقوں پر حملہ کریں گے اور اسی وقت اوسلو کی بندرگاہ پر نازی جہازوں میں ٹائم بم پھٹیں گے، یہ سارا پروگرام تقریباً طے پا گیا ہے۔ اب تمہارا کام یہ ہے کہ کسی طرح جنرل گاربو کے بھیس میں منسوس تک پہنچو۔ تمہارے ساتھ چار آدمی فوجی وردیوں میں ہوں گے۔ اس لیے تم بلاخوف و خطر منسوس تک پہنچ جاؤ گے۔"

"جنرل گاربو کا بھیس کس طرح بھرا جائے گا؟"

آج رات میں تمہیں اپنے ساتھ جنرل کی قیام گاہ پر لے چلوں گی۔ تم اس کے بولنے اور چلنے کا انداز ذہن نشین کر لینا۔ وہ روزانہ دس بجے رات کو اپنی کار میں منسوس جاتا ہے۔ اس کے ساتھ صرف ڈرائیور ہوتا ہے۔ منسوس تک پندرہ فوجی چوکیاں قائم ہیں اور دو جگہ دریا پر پل بنے ہوئے ہیں۔ پرسوں رات کو جب جنرل گاربو منسوس کے دورے پر روانہ ہوگا تو چوتھے میل پر ایک چٹان کے قریب جہاں سڑک مڑتی ہے جنرل کو اپنی کار رکوانی پڑے گی، اس لیے کہ راستے میں ایک بڑا پتھر پڑا ہوگا۔ تم اور تمہارے چار ساتھی جن کے پاس ڈائنامیٹ، ٹائم بم، پستول اور آتش گیر مادّہ ہوگا، اس چٹان کے قریب سرِشام چھپ جائیں گے اور جنرل کو یا نو

شوٹ کردیں گے یا اسے اور ڈرائیور کو کسی کھڈ میں پھینک دیں گے۔ تمہارے ساتھی پہلے ہی فوجی وردی میں ہوں گے، تم بھی جنرل کی وردی پہن لینا اور کار کو کہیں روکے بغیر سیدھے منسوس لے جانا۔ رات کی تاریکی میں نئے افسر نقلی جنرل کو پہچان نہ سکیں گے۔ معائنے کے دوران میں موقع پاکر بموں اور اسلحے کے ذخیروں میں آتشگیر مادہ اور ٹائم بم رکھ دینا اور واپسی پر پلوں کے پہرہ داروں کو شوٹ کر کے پلوں کو بھی ڈائنامیٹ سے اڑا دینا۔ اس کے بعد کار کسی کھڈ میں پھینک دینا اور وردیاں بھی ضائع کر دینا اور سیدھے اپنے فارم پر چلے جانا۔ سمجھ گئے؟"

"سمجھ گیا، لیکن یہ پروگرام مجھے ایک خواب کی مانند دکھائی دیتا ہے جس کا شرمندۂ تعبیر ہونا محال ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ سب کام اسی طرح ہوگا۔ اب آرام کرو۔ شام کو جنرل گاربو کے ہاں شراب لے کر جاؤں گی تو تمہیں ساتھ لے چلوں گی۔"

جنرل گاربو میری طرح لمبا تڑنگا اور خوش مزاج جرمن تھا۔ رات کو بھی وہ سیاہ چشمہ لگاتا اور جب بولتا تو تحکمانہ لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دیتا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی وردی پہن کر میں ایسی ہی ایکٹنگ بڑی آسانی سے کر سکتا ہوں۔ میرے حوصلے اب بلند تھے۔

۱۰ دسمبر ۱۹۴۲ء کی وہ رات میں مرتے دم تک نہ بھول سکوں گا۔ ہم پانچ آدمی جرمن فوجی آفیسروں کی وردیاں پہنے، پستول لگائے اور کمر سے ڈائنامیٹ باندھے نہایت اطمینان سے منسوس کی سڑک کے چوتھے میل پر چٹان کے عقب میں پہنچ گئے۔ راستے میں کئی جرمن سپاہی ملے لیکن بات کسی نے نہ کی۔ سب نازی سیلوٹ کر کر کے اپنی ڈیوٹیوں پر چلے گئے۔ آسمان پر سیاہ بادل رات کی تاریکی میں اضافہ کر رہے تھے اور سردی دم بدم بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ ٹھیک سوا دس بجے سڑک پر کسی تیز رفتار کار کی آواز سنائی دی جس کی ہلکی بتیاں روشن تھیں۔ یہ جنرل کی کار تھی۔ میں نے ساتھیوں کو خبردار رہنے کا اشارہ کیا اور خود ٹارچ روشن کر کے سڑک کے بیچ میں کھڑا ہو گیا۔ جنرل گاربو کی کار ایک جھٹکے سے میرے قریب آکر رکی اور ڈرائیور نے سر باہر نکال کر کرخت لہجے میں کہا:

"کیا بات ہے؟ کیا سڑک بند ہے؟"

اتنی دیر میں خود جنرل گاربو کار سے باہر نکلا اور میری طرف آیا۔

"جناب! ایک چٹان ٹوٹ کر سڑک پر آن گری ہے۔ یہ حادثہ چند منٹ پہلے پانچویں میل پر پیش آیا ہے۔" میں نے جرمن زبان میں کہا۔

وہ جھلا کر کار کی طرف مڑا اور ڈرائیور کو گاڑی واپس لے چلنے کا حکم دیا، مگر اتنی دیر میں میرے ساتھی اُن دونوں کو قابو کر چکے تھے۔ جنرل کی وردی میں نے پہن لی اور اپنی وردی اتار کر جنرل کو پہنا دی۔ پھر ان کو اچھی طرح باندھ کر اسی چٹان کے پیچھے تاریکی میں پھینک دیا۔

نمسوس تک ہم خیریت سے پہنچ گئے۔ تمام راستے فوجی سپاہی جنرل کی کار کو سلیوٹ کرتے رہے۔ دونوں پلوں پر ہم نے دیکھا کہ چار چار سپاہی پہرہ دے رہے ہیں۔ خدا کی قدرت کہ اُدھر میں نے جنرل گاربو کی حیثیت سے نمسوس میں قدم رکھا کہ ہوائی حملے کے سائرن بھیانک آوازوں سے چیخنے لگے۔ اور ہر طرف افراتفری پڑ گئی۔ ایک کرنل نے مجھے بتایا کہ ڈیڑھ سو اتحادی بمبار طیاروں کا بیڑہ نمسوس کی جانب پرواز کر رہا ہے۔ اور آدھ گھنٹے تک یہاں پہنچ جائے گا۔ میں نے دیکھا کہ نمسوس اور اس کے گرد و نواح میں لاتعداد طیارہ شکن توپیں نصب ہیں اور کوئی طیارہ ان توپوں کی زد میں آ کر نہیں بچ سکتا۔ موقع پا کر میرے ساتھی بارود خانے میں گھس گئے جہاں سے اِن توپوں کو گولا بارود مہیا کیا جاتا تھا۔ بارود خانے میں ٹائم بم اور آتش گیر مادّے کے بم رکھ دیئے گئے۔ میں نے اڈّوں کا سرسری معائنہ کیا، فوجیوں کو ہمت سے کام لینے کی تلقین کی اور اس ہدایت کے ساتھ کہ میں ایک گھنٹے تک واپس آتا ہوں، کار میں بیٹھ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ تین چار بڑے فوجی افسر میری حرکتوں کو تعجب سے دیکھ رہے تھے اور یقیناً انہیں مجھ پر شبہہ ہو گیا تھا۔ لیکن وقت بڑا نازک تھا۔ اتحادی طیارے ان کے قریب پہنچ رہے تھے۔ میرے ساتھی کار میں بیٹھ چکے تو میں نے افسروں کو الوداعی اشارہ کیا اور تیزی سے گرونگ کی طرف روانہ ہو گئے۔

جب پہلا پل قریب آیا تو ہم نے کار آہستہ کر لی۔ اور پہرہ داروں کو آواز دے کر بلایا۔ جوں ہی وہ نزدیک آئے ہمارے پستولوں سے بیک وقت چار شعلے نکلے اور بدنصیب

پہرے دار وہیں ڈھیر ہو گئے۔ پُل کو ڈائنامیٹ سے اڑانے میں صرف دس منٹ صرف ہوئے اور جب ہم دوسرے پُل کے پہریداروں کی لاشیں دریا میں پھینک رہے تھے، تو آسمان پر بمبار طیاروں کے اڑنے کی کان پھاڑ آوازیں سنائی دیں اور پھر بموں کے پھٹنے اور طیارہ شکن توپوں کے گرجنے کی ہولناک آوازیں بلند ہوئیں۔

ساری رات اتحادی طیارے آسمان پر پرواز کرتے اور بمباری کرتے رہے۔ اور ان کی تعداد میں بھی کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ نازیوں کی طیارہ شکن توپیں بالکل خاموش تھیں اور منسوس کی جانب سے ایک جرمن سپاہی بھی زندہ نہیں لوٹا۔ اگلے روز دوپہر تک اتحادی چھاتہ بردار دستے منسوس پر قابض ہو چکے تھے

مجھے تیسرے روز کیپٹن کا عہدہ دے کر منسوس کے ایک جزیرے کا انچارج بنا دیا گیا اور میں نے انچارج بنتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ گریٹا سے شادی کر لی کیونکہ اس مہم میں میری کامیابی سراسر اسی عورت کی مرہونِ منت تھی۔

زندہ مُردے

بمبار طیاروں کی آواز سب سے پہلے لیفٹیننٹ جون کیلی کے قوی الحس کانوں تک پہنچی ___ وہ چلتے چلتے یک لخت رُکا اور کہنے لگا۔ "سنو......"

جنگی قیدیوں اور جرمن سپاہیوں کا گروہ اس آواز پر ٹھہر گیا۔ "کیا سُنیں؟" سارجنٹ گریز نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"خاموش ___ اب مجھے کچھ سنائی دے رہا ہے" سارجنٹ بلینچرڈ نے اُسے ڈانٹا۔ "شائد ہوائی حملہ دوبارہ ہونے والا ہے۔"

تین امریکی ہوابازوں کی نگرانی پر متعین چھ جرمن سپاہیوں کے انچارج سارجنٹ جونز رائسٹر نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ یہ گویا سب کو چپ رہنے کا اشارہ تھا۔ اب وہ خود یہ پُراسرار آواز سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ یکایک اُس نے اپنا منہ کھول دیا اور افق کی جانب گھُورنے لگا۔ بمبار طیاروں کی ہلکی سی گونج اب اسے واضح اور صاف سُنائی دے رہی تھی۔ یہ آواز آہستہ آہستہ بلند ہونے لگی۔ راکٹوں کے اس جرمن تجرباتی اڈّے پر کام کرنے والے سبھی لوگ طیاروں کو دیکھنے میں لگے ہوئے تھے۔ روسی جنگی قیدی جو اس اڈّے پر گدھوں کی طرح محنت مشقت کرنے پر مجبور تھے۔ اس سنہری موقع سے فائدہ اُٹھا کر کمر سیدھی کرنے کے لئے چُپ چاپ کھڑے تھے۔ انہیں آسمان کی پہنائیوں میں پرواز کرنے والے بمبار طیاروں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

یکایک مغربی افق کا سینہ چیر کر طیارے نمودار ہوئے، وہ اتنی بلندی پر تھے کہ یہ

شناخت کرنا ممکن نہ تھا کہ وہ کس ملک کے ہیں۔ لیفٹیننٹ کیلی کے اندازے کے مطابق اُن کی بلندی تیرہ ہزار فٹ سے کسی طرح کم نہ تھی اور وہ سمندری لہروں کی طرح بل کھاتے اور جھپٹتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

"آہ —— ہمارے بمبار،" جرمن سارجنٹ رائشر نے خوشی سے چلا کر کہا "یہ ہمارے بمبار ہیں اور غالباً روسی محاذ پر کسی بڑے حملے کے لئے جا رہے ہیں۔"

"غلط —— بالکل غلط" یہ آواز جون کیلی کی تھی۔ سارجنٹ رائشر غصے سے بل کھا کر اُس کی طرف مڑا۔ جون کیلی نے مسکرا کر اطمینان سے کہا۔

"سارجنٹ، تمہارا اندازہ غلط ہے۔ یہ تمہارے نہیں، ہمارے بمبار ہیں۔" اور اس سے پیشتر کہ سارجنٹ رائشر کے منہ سے گالیوں کا سیلاب اُمڈے، بمبار طیارے اڈے کے چاروں طرف ہیبت ناک انداز میں گرج رہے تھے۔ پھر جرمن طیارہ شکن توپوں کے دہانے کھل گئے اور بمباروں پر شدید گولہ باری شروع ہو گئی۔

لمحہ بہ لمحہ نیچے آتے ہوئے بمبار طیارے جرمن اڈے کو پوری طرح اپنے گھیرے میں لے چکے تھے۔ اب ان میں سے سیاہ رنگ کی گیندیں نکلیں اور زاویۂ قائمہ بناتی ہوئی زمین کی طرف گرنے لگیں۔ ان گیندوں نے دیکھتے ہی دیکھتے دزنی اور بڑے بموں کا روپ دھار لیا اور پھر —— ہولناک دھماکوں سے جیسے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ ہر طرف آگ کے سُرخ سُرخ شعلے اور بل کھاتا ہوا گہرا سیاہ دھواں آسمان کی طرف اُٹھ رہا تھا۔ دفعتہً لیفٹیننٹ کیلی ایک زبردست جھٹکے سے قلابازی کھا کر زمین پر گرا اور اُسی لمحے بلینجر ڈ بھی منہ کے بل اُس پر آن پڑا۔ اُس نے ایک نظر اڈے پر ڈالی۔ عمارتوں اور مشینریوں کا ملبہ انسانی لاشوں سمیت تین سو فٹ کی بلندی تک اُڑ کر دوبارہ زمین کی طرف آ رہا تھا۔

راکٹ اڑانے والے مقام پر بیک وقت چار پانچ بم گرے اور آن واحد میں ان بموں نے جرمنوں کی برسوں کی محنت خاک میں ملا دی۔ ایک بم تیل کے ذخیرے پر پھٹا اور قیامت خیز دھماکے کے ساتھ ہی تیل سے اُٹھنے والے آگ کے شعلے آسمان کو چھونے کی کوشش کرنے لگے۔ دور دور تک جلتے ہوئے تیل کی بارش ہو رہی تھی۔ بے شمار روسی قیدی اور جرمن

سپاہی جُھلس گئے، ان کے کپڑوں میں آگ لگ گئی اور پھر جل بُھن کر کوئلہ بن گئے۔ لیفٹیننٹ کیلی کو یوں محسوس ہُوا۔ جیسے کوئی شخص اُسے سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُس نے بمشکل اپنی ایک آنکھ کھولی۔ سارجنٹ گریمز کا مانوس چہرہ اس کے سامنے تھا۔ پھر اُس نے جرمن سارجنٹ رائشٹر کو دیکھا۔ جو اپنے دو آدمیوں سمیت نرس سگلینڈ وارنر کو کھینچ کر محفوظ جگہ لے جانا چاہتا تھا۔ تین جرمن سپاہیوں نے پہلے کیلی اور پھر اُس کے دونوں ساتھیوں کو بھی اسی سمت میں دھکیل دیا۔ بلینچرڈ بڑے بے ڈھنگے پن سے ایک جرمن کی طرف لپکا۔

"بلینچرڈ، خدا کے لئے ٹھہر جاؤ۔" کیلی نے چلّا کر اُسے اس حرکت سے منع کیا۔ "خاموشی سے رائشٹر کے پیچھے چلے چلو۔"

سارجنٹ رائشٹر ان سب کو زیرِ زمین برقی زینے کی گہری سُرنگ کے نزدیک لے گیا۔

یک لخت اُن کے عقب میں ایک اور دھماکہ ہُوا اور وہ جھٹکے سے برقی زینے کے تاروں کے پنجرے میں جا گرے۔ ۶×۴ فٹ کے اس پنجرے پر پتھروں کی بوچھاڑ ہوئی اور انہیں لہولہان کر گئی۔ رائشٹر برقی زینے کو سٹارٹ کرنے کی کوشش میں مختلف بٹن دباتا رہا، مگر بدحواسی اور پریشانی کے باعث اُسے صحیح بٹن نہ مل سکا۔ اپنی عادت کے مطابق اس کے منہ سے برقی زینے اور اس کے موجد کے بارے میں بے پناہ مغلظات کا طوفان امڈ پڑا۔ دو جرمن سپاہی آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ دونوں ملبے کی زد سے محفوظ رہنے کے لئے ایک دوسرے کو ڈھال بنانا چاہتے تھے۔ خاک دُھول میں اٹے اور دھوئیں میں ڈوبے ہوئے مزید تین انسانی ہیولے برآمد ہوئے۔ ان میں دو نرسیں تھیں اور تیسرا آدمی فوجی ہسپتال کا انچارج ڈاکٹر کیپٹن فرانز جوسف کربس تھا۔ اس کے کندھے پر مشین گن کی گولیوں کی پیٹی لٹک رہی تھی، لیکن مشین گن کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ غیظ و غضب سے کانپتی ہوئی آوازیں جون کیلی سے کچھ کہہ رہا تھا، لیکن مسلسل دھماکوں کے باعث اس کی آواز کسی کو سنائی نہ دی۔ ملبے کا ایک اور بڑا ریلا آیا اور اُس نے برقی زینے کا راستہ بند کر دیا۔ دھماکوں کی شدت نے جون کیلی کو اس قدر حواس باختہ کیا کہ اس کا ذہن ماؤف ہو گیا۔ اُسے اب قطعی یاد نہ تھا کہ وہ کہاں ہے، یہ کون لوگ ہیں اور آخر ان دھماکوں کا مطلب کیا ہے۔ معاً ایک نسوانی آواز تاریکی میں گونجی۔ جون کیلی نے سُنا،

وہ کہہ رہی تھی:

"مجھے اس اندھیرے میں ڈر لگتا ہے ——————" پھر کسی نے زور سے اُسے جھنجھوڑا۔ کیلی نے آنکھیں کھول کر گرد و پیش دیکھنے کی کوشش کی، مگر گھپ اندھیرے میں اُسے چند سایوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ اب اس کا ذہن اپنی کھوئی ہوئی قوت دوبارہ بحال کر رہا تھا۔ چند لمحے بعد کیلی کو یہ اندازہ کرنے میں دقت نہ ہوئی کہ خوف سے بھری ہوئی یہ آواز نرس سگلینڈ کی تھی۔ جو کیلی کو ہوش میں لانے کے لئے بار بار اس کا بازو جھنجھوڑ رہی تھی۔ کیلی نے آہستہ سے نرس کو ایک طرف ہٹایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے جیب ٹٹولی، ماچس کی ڈبیا کی دل خوش کُن آواز کانوں میں آئی، جونہی تیلی روشن ہوئی، نرس نے اطمینان سے بھرپور لمبا سانس لیا اور چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ اس مختصر سے روشن وقفے میں کیلی نے وہاں اپنے علاوہ بلینچرڈ کو بھی پایا جو کہنیوں اور گھٹنوں کے بل جھکا خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا اور اس کے منہ سے گرد و غبار بھرا تھوک آہستہ آہستہ گر کر فرش پر جمع ہوتا جا رہا تھا۔

"یا خُدا! یہ کیا ہو گیا؟" اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ جواب میں بلینچرڈ گردن ہلا کر کچھ بڑبڑایا لیکن اس کے الفاظ کسی کی سمجھ میں نہ آسکے۔ پہلی تیلی بجھ گئی۔ دوسری تیلی جلا کر جون کیلی نے ماحول کا جائزہ لیا اور اپنے آپ کو ایک ایسے کھلے کمرے میں پایا۔ جہاں بے شمار مختلف قسم کے اوزار بکھرے پڑے تھے۔

"ہم کہاں ہیں؟" کیلی نے نرس کے ہاتھ اُس کے چہرے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ہسپتال کے تہ خانے میں۔" نرس کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ دوسری تیلی بجھنے سے پہلے پہلے کیلی ایک بڑی موم بتی تلاش کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ موم بتی وہیں ایک بنچ پر پڑی مل گئی۔ اس نے جلدی سے موم بتی روشن کی۔ اب وہ ہر شے اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ یہ تہہ خانہ تین مختلف گیلریوں کے درمیان واقع تھا اور خاصا فراخ ——— کیلی کی نظریں یکایک ایسی چیز پر پڑیں جسے دیکھ کر اس کے بدن میں جھرجھری دوڑ گئی۔ یہ چھت تک اونچی ملبے کی وہ دیوار تھی۔ جو عین اُس جگہ بن گئی۔ جہاں برقی زینے کی رفتار ہونی چاہیے تھی

سرنگ کا یہ حصہ لکڑی کے شہتیروں، بڑے بڑے پتھروں کے ٹکڑوں اور لوہے کے گارڈرز سے اٹا پڑا تھا۔ یہ سب چیزیں اس قدر وزنی اور بڑی تھیں کہ انہیں ہٹانا تو کجا، ہلانا تک ممکن نہ تھا۔

"راستہ تو بالکل بند ہو چکا ہے۔" کیلی نے مایوسی سے گردن ہلا کر کہا۔ اس کا ذہن ایک بار پھر ماؤف ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ وہ بڑبڑایا "نہ جانے باقی لوگوں پر کیا بیتی..... ممکن ہے وہ سب بچ گئے ہوں ——— معلوم کیسے ہو ——— ہمیں کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کرنا چاہیئے، ورنہ ———" اس سے آگے سوچنا اس کے بس میں نہ تھا

دفعتہً اس نے نرس کا شانہ زور سے ہلایا۔

"بولتی کیوں نہیں ——— دوسرا راستہ کدھر ہے؟"

"دوسرا راستہ؟" لڑکی نے پہلی بار آنکھیں کھول کر جون کیلی کی طرف حیرت سے دیکھا اور بولی "یہاں دوسرا راستہ کوئی نہیں"۔

یہ ناقابلِ فراموش داستان آج تک دوسری عالمی جنگ کے ریکارڈ کی فائلوں میں دفن تھی، اب پہلی مرتبہ شائع کی جا رہی ہے۔ جنگ کے بارے میں یوں تو بے شمار عظیم داستانیں سامنے آئی ہیں، لیکن یہ سب سے زیادہ لرزہ خیز اور عجیب ہے۔ اس کا آغاز ۲۰ دسمبر ۱۹۴۴ء کی یخ بستہ اور کہر آلود صبح سے ہوتا ہے۔ اسی روز اتحادیوں کے بمبار طیارے V-2 قسم کے جرمن راکٹوں کے اڈے پر بمباری کرنے گئے تھے۔ یہیں سے لندن پر ۱۰۰ راکٹ روزانہ کے حساب سے تباہ کن راکٹ برسائے جاتے تھے۔ یہ اڈا بحیرہ بالٹک کے ایک جزیرے میں تھا اور جرمنوں نے اسے خفیہ، مضبوط اور محفوظ بنانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ مگر اتحادی بمباروں نے آخر اسے تباہ کر ہی دیا۔

بمبار طیاروں کا سکویڈرن ۵ بج کر ۱ منٹ پر یہاں پہنچا۔ اس سکویڈرن کے اکثر پائلٹ اور عملے کے افراد امریکی تھے۔ لیفٹیننٹ جون کیلی کے بمبار میں کل دس افراد سوار تھے۔ ۹ بج کر ۲۶ منٹ ہوئے تھے کہ ایک جرمن طیارہ شکن توپ کا گولہ اس طیارے کے انجن سے ٹکرایا اور پلک جھپکتے میں یہ طیارہ شعلوں کی زد میں آ کر زمین کا رخ کر رہا تھا۔ عملے کے صرف

تین آدمی پیراشوٹ کے ذریعے کودنے میں کامیاب ہو سکے۔

لیفٹیننٹ جون کیلی ـــــ پائلٹ ـــــ عمر ۲۵ سال، سب سے پہلے اترنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے پیراشوٹ کی رسیاں اُلجھ گئی تھیں۔ اس نے غصے سے دانت پیستے ہوئے سوچا: کاش! تربیت کے دوران میں وہ کئی کئی دن غیر حاضر نہ رہتا اور پیراشوٹ سے اترنے کی پوری مشق کر لیتا، بہرحال اس نے جوں توں کر کے رسیوں کی مصیبت سے اپنے آپ کو آزاد کرایا اور باقی ساتھیوں کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ وہ دونوں کچھ زیادہ دور نہ تھے۔ ان میں سے ایک شاہ بلوط کے درختوں کے درمیان سردی سے ٹھٹھری ہوئی گھاس پر پیراشوٹ کے نیچے بے حس و حرکت پڑا تھا۔ دوسرے کے پیراشوٹ کی رسیاں ایک درخت کی شاخوں میں اُلجھ گئی تھیں اور وہ کسی پکے پھل کی مانند لٹک رہا تھا۔

"میری آواز سننے والے جوانو!" کیلی نے چلاتے ہوئے کہا۔ "ذرا حاضری بولو تاکہ پتہ چل سکے کہ ہم میں سے کتنے آدمی زمین تک پہنچ سکے ہیں۔" یکایک آواز آئی:

"بلینچرڈ یہاں ہے۔ میرا خیال ہے کہ میری ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔"

ولیم بلینچرڈ ـــــ سارجنٹ ـــــ عمر ۲۰ سال۔ طیارے میں "گنر" کے فرائض انجام دیتا تھا۔

"یہ حاضری کی بھلا کیا تک ہے؟" گریمز چیخا "جان کیلی، کیا تم اندھے ہو، تمہیں دکھائی نہیں دیتا کہ میں اس مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں۔ خدا کے لئے مجھے درخت سے اتارو۔"

رڈی گریمز ـــــ سارجنٹ ـــــ عمر ۲۰ سال ـــــ طیارے میں ریڈیو آپریٹر اور گنر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔

"اور کوئی نہیں، صرف ہم تینوں ہیں؟" کیلی بولا۔

"نظر تو یہی آتا ہے" گریمز نے جواب دیا۔ "اس جال سے مجھے نکالو۔"

"دس میں سے صرف تین ـــــ اُف خدایا، کس قدر ہولناک معاملہ ہے۔ میری ٹانگ میں شدید درد ہے۔"

"خدا کا شکر کرو کہ تین تو بچے"، گریمز پھر چلایا "کیا کوئی صاحب مجھے اس مصیبت سے نجات دلانے کی کوشش بھی کریں گے؟"

"سات جانیں ضائع ہو گئیں اور ایک ٹانگ الگ ٹوٹی۔"

"خاموش!" کیلی نے گرج کر کہا "کان کھول کر سن لو، یہ پہلا اور آخری موقع ہے کہ میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ تم دونوں اپنے حواس کھو چکے ہو۔ ہمیں برطانیہ واپس پہنچنا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیسے؟ ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ آئندہ کیا مشکلات سامنے آئیں۔ سمندر میں کودنا پڑے یا پہاڑوں پر چڑھنا، ہم بہرحال وہاں پہنچ کر رہیں گے۔ اگر تم میں سے کسی نے حواس سے باہر ہونے کی کوشش کی تو اُسے تنہا چھوڑ دیا جائے گا۔"

اُس کے ساتھی خاموش رہے۔ کیلی نے چند لمحے دم لیا، پھر دوبارہ بولا۔ اب اُس کا لہجہ پہلے کی نسبت نرم تھا۔

"گریمز، کیا تم وہ ہدایات بھول گئے۔ جن کے مطابق تمہیں اس قسم کی صورت حال سے خود نپٹنے کی تربیت دی گئی تھی؟ اپنے حواس کو قابو میں کر کے وہ یکسو اتلاش کرنے کی کوشش کرو۔ جسے کھولنے سے سارا پیراشوٹ خود بخود جسم سے الگ ہو سکتا ہے۔" پھر اُس نے بلینچرڈ کی طرف رُخ کر کے کہا "اور تم یہ جانتے ہوئے بھی کہ ٹانگ تکلیف کا باعث بن رہی ہے، کھڑے ہو کر سب سے پہلے اس ٹانگ پر بوجھ ڈالنا چاہتے ہو۔ کیا واقعی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے؟"

چند لمحے بعد گریمز پیراشوٹ کے جال سے چھٹکارا پا کر زمین پر پڑا اپنی کمر سے مٹی جھاڑ رہا تھا اور بلینچرڈ ایک دو مرتبہ ڈگمگانے کے بعد اپنی دونوں ٹانگوں پر کھڑا مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا:

"لیفٹیننٹ، اگر تم مجھے اسپرین کی ایک ٹکیہ مہیا کر دو، تو میں ابھی تمہارے ساتھ لندن پہنچنے کے لئے تیار ہوں۔"

"تمہارا دماغ واقعی جواب دے گیا ہے" کیلی نے جھلا کر کہا۔ "بے وقوف کے بچے پہلے ہمیں کوئی موزوں پناہ گاہ تلاش کرنی چاہیئے۔ جہاں ہم چھپ کر آئندہ پروگرام

طے کر سکیں اور ــــــــ"

"کیلی، وہ دیکھو سامنے سڑک پر۔" گریمز نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ کیلی نے سڑک کی طرف دیکھا۔ وہاں دو ٹرک کھڑے تھے۔ جو ابھی ابھی آن کر رُکے تھے۔ سادہ کپڑوں میں ملبوس دیہاتی لوگوں کا ایک ٹولہ ان میں سے اُتر کر افراتفری کے عالم میں ادھر اُدھر بھاگ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں کسی کی جستجو ہے۔ اس گروہ میں ادھیڑ عمر اور کمسن لڑکے سبھی شامل تھے۔ دو تین آدمیوں کے ہاتھوں میں شاٹ گنیں تھیں اور باقی کلہاڑیاں اور لاٹھیاں سنبھالے ہوئے تھے۔ ایک کریہہ صورت آدمی ہاتھ میں پکڑے ہوئے رسے کے بل کھولتا جا رہا تھا۔ رسے کے ایک سرے پر پھندا بنا ہوا تھا۔

"پچھلے دِنوں دیہاتیوں کے ایک ایسے ہی ٹولے نے ہمارے جیسے دو ہوا بازوں کو "لینچ" کر دیا تھا" گریمز نے دہشت زدہ ہو کر کہا "میرے لیے تو چلنا بھی مشکل ہے، اس لئے تم دونوں میری پرواہ کئے بغیر جہاں جی چاہے، جا سکتے ہو۔" LYNCHING قتل کرنے کا بڑا بھیانک طریقہ ہے جو زمانۂ قدیم کے افریقی قبائل کی ایجاد ہے۔ اس طریقۂ قتل میں قریب قریب اُگے ہوئے دو درختوں کی مضبوط اور لچکدار ٹہنیاں جھکا کر ایک ٹہنی کے ساتھ قیدی کی ایک ٹانگ اور دوسری ٹہنی کے ساتھ دوسری ٹانگ باندھ دی جاتی ہے اور جب انہیں چھوڑا جاتا ہے تو وہ اس تیزی اور قوت سے اُوپر اُٹھتی ہیں کہ بدنصیب قیدی کا جسم دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔

کیلی اور بلینچرڈ کے لئے بھاگ کر جان بچانے کی کوشش اب بے سود تھی، کیونکہ شکاری کتوں کی طرح ان کی کھوج میں سرگرداں دیہاتیوں نے انہیں دیکھ لیا تھا اور ایک قوی ہیکل جرمن جس کے چہرے پر نہایت گھنی مونچھیں تھیں، ہاتھ میں کسی اوزار کا دستہ تھامے سیدھا کیلی کی طرف آ رہا تھا۔ وہ شخص اگرچہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا، تاہم زبان سے ناواقف ہونے کے باعث کیلی اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ آنے والے کی نیت ٹھیک نہیں، کیلی اپنی جگہ سنبھل گیا۔ اور جونہی جرمن نے قریب پہنچ کر کیلی کو اپنے ہتھیار کی ضرب کا نشانہ بنانا چاہا، کیلی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا، پوری قوت

سے اُس کی ناک پر گھونسا مارا اور پیٹ میں بوٹ کی ٹھوکر لگائی۔ حملہ آور بلبلاتا ہوا پرے جا گرا چوٹ اتنی شدید تھی کہ درد کی شدت سے وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ کیلی نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے لوہے کی سلاخ چھین لی۔ اتنی دیر میں دوسرا شخص نزدیک آن پہنچا اور ابھی وہ اس کے جبڑے پر اپنا زوردار گھونسا جمانے بھی نہ پایا تھا کہ وحشی جرمن دیہاتیوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر کر ننھے خرگوشوں کی طرح دبوچ لیا اور ان تینوں پر گھونسوں، لاتوں اور تھپیڑوں کی بارش شروع ہو گئی۔ بلینچرڈ فریاد کر رہا تھا:

"تم لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جنیوا کنونشن کی رو سے یہ حرکت ناجائز ہے ... کم بختو، میری ٹوٹی ہوئی ٹانگ ہی کا کچھ خیال کرو"، لیکن اس کی چیخ و پکار کسی نے نہ سُنی اور سن بھی لیتے، تو سمجھتے کیسے؟ وہ انگریزی سے نابلد تھے۔ بپھرے ہوئے ہجوم نے اُن کی اس بیدردی سے ٹھکائی کی کہ چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ کیلی دوبارہ ہوش میں آیا، تو دیکھا کہ اس کے ساتھی خون اور مٹی میں لتھڑے پڑے ہیں اور آنکھیں کھول کر ادھر ادھر کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہلکے ہتھیاروں سے مسلّح نوعمر جرمن فوجیوں نے انہیں اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا۔ کچھ فاصلے پر جوش و خروش میں بھرے ہوئے دیہاتیوں کا گروہ ہلڑبازی اور دھما چوکڑی مچا رہا تھا۔ ایک فربہ اندام جرمن سارجنٹ ان دیہاتیوں کو اپنی زبان میں سمجھانے بجھانے کے لئے آگے بڑھا، مگر دیہاتیوں نے الٹا اسی پر ہلّہ بول دیا۔ وہ پریشان ہو کر لوٹ آیا اور اپنے فوجی سپاہیوں کو حکم دیا کہ قیدیوں کو فوراً اس جگہ سے کہیں اور لے چلو۔ چند لمحے بعد وہ فوجی ٹرکوں میں بیٹھ کر تیزی سے ایک ویران علاقے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"خدا کا شکر ہے کہ جان بچ گئی" گریمز نے کہا۔ "اگر یہ موٹا سارجنٹ نہ آتا تو وہ ہمیں ہلاک کئے بغیر نہ چھوڑتے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے"، کیلی نے جواب دیا، "مجھے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ وہ جرمن سارجنٹ کی طرف مڑا اور انگریزی میں کہنے لگا۔

"میں آپ کی زبان نہیں جانتا، ورنہ آپ کا شکریہ اچھی طرح ادا کر سکتا تھا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے"۔ سارجنٹ نے بے صبری سے شکستہ انگریزی میں جواب دیا۔ "ہمارے دیہاتیوں کا رویہ کچھ زیادہ قابلِ اعتراض نہ تھا۔ گرفتار ہونے والے دشمن کے ہوابازوں کو "ڈیل" کرنے کے معاملے میں برلن اُن کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، اس لئے یہ لوگ جوش میں بھرے ہوئے تھے۔ اگر میں بروقت نہ پہنچتا، تو اب تک تم لوگ تین آدمیوں کے بجائے لاشوں کے چھ ٹکڑوں میں تبدیل ہو چکے ہوتے۔ تمہارے طیاروں نے برلن کا جو حشر کیا ہے، وہ ہم جانتے ہیں"۔

"اور تمہارے راکٹوں اور بموں نے لندن میں جو تباہی مچائی ہے، وہ بھی تمہیں دیکھنی چاہیئے" کیلی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

جرمن سارجنٹ نے کوئی جواب نہ دیا اور خلا میں گھورنے لگا۔ اس کے چہرے کے آثار چڑھاؤ سے اندازہ ہوتا تھا کہ نہ اُسے برلن کی بربادی پسند ہے، نہ لندن کی تباہی، بلینچرڈ بولا ——— "یہ شخص مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ تم نے کہیں اسے ناراض تو نہیں کر دیا؟"

"گھبراؤ نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا"

"کیا تم خوف زدہ نہیں ہو؟"

"ان وحشی دیہاتیوں سے تو میں واقعی ڈر گیا تھا، مگر ان فوجیوں سے کچھ اگلوانے کے لئے شرافت کے بجائے نشتر زنی ہی زیادہ مفید رہتی ہے"۔

جرمن سارجنٹ نے برلن کے بارے میں اشارتاً جو کچھ کہا تھا، وہ غلط نہ تھا، بدنام نازی لیڈر گوئبلز نے ۲۶ مئی ۱۹۴۴ء کی ایک تقریر میں اتحادی ہوابازوں پر الزام لگایا تھا کہ وہ جرمنی کے نہتے عوام، سکولوں اور ہسپتالوں پر بمباری کر رہے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جرمن عوام اتحادی ہوابازوں کے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں اور جب بھی اُن کا بس چلتا ہے، وہ ہوابازوں کو پکڑ کر ہلاک کر دیتے ہیں۔

ڈیڑھ گھنٹہ سفر کرنے کے بعد فوجیوں کا ٹرک راکٹ سٹیشن کے نزدیک پہنچ کر رُک گیا۔ کیلی اسے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اُس جگہ کے سوا جہاں سے راکٹ چھوڑے جاتے

تھے، سارا اڈہ زمین دوز تہہ خانوں میں بنایا گیا تھا۔ اس کی لمبائی دس ایکڑ اور چوڑائی سات ایکڑ کے لگ بھگ ہو گی۔ ایک طرف کھلی چھت کی پانچ گاڑیاں دکھائی دیں۔ جن پر ایک ایک 2-V راکٹ لدا ہوا تھا۔ جا بجا بڑی بڑی کرینیں آسمان کی طرف سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ ان کی مدد سے دیو قامت اور وزنی راکٹوں کو لانے لے جانے کا کام لیا جاتا تھا۔ بجلی کے تاروں کا بنڈل، منجمد خوراک کی پیٹیاں اور ہسپتالوں میں کام آنے والا سازو سامان کہیں ٹرکوں سے آتارا جا رہا تھا اور کہیں ان متفرق اشیاء کو زیرِ زمین گوداموں میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ سٹیشن کے وسیع و عریض رقبے کو خارجی نظروں سے اس طرح چھپانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ کہ نہ تو فضا سے یہ علاقہ دیکھا جا سکتا تھا اور نہ طیاروں کے ذریعے اس کی تصویریں اتاری جا سکتی تھیں۔ مختلف تعمیراتی کام اُس وقت بھی جاری تھے۔ کہیں بڑے بڑے کنویں کھودے جا رہے تھے، کہیں سیمنٹ اور بجری کو ملایا جا رہا تھا اور کہیں یہ مسالہ کھدے ہوئے کنوؤں میں ڈالا جا رہا تھا۔ تعمیراتی کاموں میں بے طرح مشغول مزدور تمام کے تمام روسی جنگی قیدی تھے۔ پھٹی پرانی وردیاں اُن کے جسموں پر جھول رہی تھیں اور جسم تھکے ماندے اور خستہ، لیکن ان سب باتوں سے بے نیاز وہ پوری ذمّے داری سے اپنے دھندے میں لگے ہوئے تھے۔

"سارجنٹ مجھے یقین ہے اِس غیر انسانی سلوک سے تمہارا کوئی تعلق نہ ہو گا۔" کیلی نے روسی قیدیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جرمن سارجنٹ نے کوئی جواب نہ دیا اور افسردہ نظروں سے قیدیوں کی طرف تکنے لگا۔ بلینچرڈ نے مضطرب ہو کر کیلی کا بازو دبایا اور سرگوشی کی:

"خدا کے لئے خاموش رہو، کیوں سارجنٹ کو خواہ مخواہ غصہ دلانے کی کوشش کر رہے ہو۔"

سارجنٹ نے انہیں ٹرک سے اترنے کا حکم دیا اور مورچے کی مانند بنی ہوئی ایک بلند کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ یہ کوٹھڑی ابھی زیرِ تعمیر تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا بڑا کمرہ تھا۔ جس میں چند جرمن فوجی افسر بیٹھے اپنے اپنے کام کر رہے تھے۔ کیلی نے کھڑکی

سے جھانک کر دیکھا، سامنے ہی سیاہ وردی پہنے ایک جرمن کیپٹن میز کے قریب بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے تین فوجی کھڑے باہر سے آنے والے ٹیلی فون سن رہے تھے، شریف الطبع سارجنٹ اپنے کیپٹن کے سامنے اٹین شن کھڑا تھا۔ کیپٹن کے چہرے پر پھیلے ہوئے تاثرات ظاہر کرتے تھے کہ وہ خشونت اور خفگی کے ملے جلے جذبات سے دوچار ہے اور کرخت لہجے میں سارجنٹ سے کچھ کہہ رہا ہے۔ کیلی ان کی پوری گفتگو سننے اور سمجھنے سے قاصر تھا، تاہم جو کچھ اس کے پلے پڑا، اس کا مفہوم یہ تھا کہ کیپٹن ان اتحادی ہوابازوں کو زندہ رکھنے کے حق میں نہیں۔ وہ بار بار میز پر پڑا ہوا پستول اٹھاتا، لیکن پھر رکھ دیتا۔

"تمہیں پتہ ہے کہ یہ کون ہے؟" بلینچرڈ نے خوف سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "اس کے کالر پر لگے ہوئے نشان بتا رہے ہیں کہ یہ گسٹاپو کا آدمی ہے اور گسٹاپو کے لوگ جنگی قیدیوں سے جو سلوک کرتے ہیں، وہ محتاجِ بیان نہیں، ان کی سفاکی، ظلم اور بربریت کی داستانیں دنیا کے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ یہ وحشی، خون آشام درندے جب تک کسی نہ کسی جنگی قیدی کو ہلاک نہ کر لیں، ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔"

"بکواس بند کرو۔" کیلی نے دانت پیس کر کہا "سارجنٹ واپس آرہا ہے۔"

"وہ تمہیں گولی مار دینے کے لیے بے چین تھا۔" جرمن سارجنٹ نے ان کی کوٹھڑی میں داخل ہو کر کہا۔ "لیکن میں نے اسے سمجھایا کہ تفتیش کے بغیر جنگی قیدیوں کو گولیوں سے اڑانا جنگی قوانین کے خلاف ہوگا۔ اب تمہیں فضائیہ کے ایک جنگی کیمپ میں بھجوایا جا رہا ہے شاید وہاں پہنچ کر تمہیں زندگی کے چند دن اور مل جائیں۔"

"بہت بہت شکریہ سارجنٹ" کیلی نے جواب دیا۔ "جنگی جرائم کے کمیشن سے میں تمہاری پُرزور سفارش کروں گا، لیکن اس سے پہلے میں اپنی انٹیلی جنس کو وہ سب کچھ بتاؤں گا جو میں نے یہاں دیکھا ہے۔" کریمر نے کیلی کے ان حماقت آمیز الفاظ کا اثر کم کرنے کے لئے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ سارجنٹ نے مشتعل ہو کر کیلی کی جیکٹ کا کالر پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا:

"کیا تم انسان نہیں ہو گے؟ مجھے شاید احمق سمجھتے ہو —— میں نے تمہارے

ساتھ جو سلوک کیا ہے، وہ سلوک پورے جرمنی میں کوئی اور سارجنٹ ہرگز نہ کرتا۔ کیا امریکہ میں مردوں کی اتنی ہی قلت ہے کہ انہوں نے تم جیسے نادان چھوکردں کو جنگ کی بھٹی میں جھونکنا شروع کر دیا ہے؟ ہوش کے ناخن لو، میں نے تمہاری کم سنی پر رحم کھا کر جونیکی کی ہے، اسے سمجھنے کی کوشش کرو" یہ کہہ کر اس نے کیلی کو اس زور کا دھکا دیا کہ غریب نوجوان لڑھکتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ لیکن اٹھتے ہی وہ سارجنٹ کی طرف لپکا اور اس سے پیشتر کہ وہ سارجنٹ پر حملہ کرے، بلینچرڈ اور گریمز نے اسے دبوچ لیا، آہٹ سن کر جرمن کیپٹن اپنے کمرے سے اٹھا اور کوٹھڑی کے دروازے میں آن کھڑا ہوا۔ اُس نے ہونٹ بھینچ کر سارجنٹ سے کہا۔

"اگر یہ حرامزادے کسی تکلیف کا باعث بن رہے ہیں، تو ان کا قصہ ابھی پاک کر دو ——"

"ایسی کوئی بات نہیں جناب! اگر انہوں نے شرارت کی تو میں آپ کے کہے بغیر ہی انہیں ٹھکانے لگا دوں گا۔" سارجنٹ نے جواب دیا۔

کیپٹن اپنا رُول گھماتا ہوا چلا گیا۔ سارجنٹ خونیں نظروں سے کیلی کو گھور رہا تھا۔ یہ دیکھ کر گریمز نے لال پیلی آنکھیں نکال کر کیلی سے کہا۔

"دیکھو لیفٹیننٹ، یہ آخری مرتبہ ہے، اگر تم نے آئندہ کوئی بدتمیزی کی، تو ہم تمہارے ساتھ کوئی واسطہ نہ رکھیں گے۔ یہ تیسری مرتبہ اس شریف سارجنٹ نے ہماری جان بچائی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں سارجنٹ سے اپنے کیے کی معافی چاہتا ہوں۔" کیلی نے ندامت سے کہا۔

طے یہ ہوا تھا کہ ان قیدیوں کو پانی کے راستے ایک کشتی کے ذریعے جرمنی پہنچایا جائے، لیکن کشتی آنے میں ابھی دیر تھی اور قیدیوں کو اس کوٹھڑی میں زیادہ دیر کے لئے رکھا نہیں جا سکتا تھا، چنانچہ کیپٹن کی ہدایت پر انہیں ایک بند ٹرک میں بٹھا کر باہر سے تالا

لگا دیا گیا۔ بلینچرڈ اور گریمز اس وقفے سے فائدہ اٹھا کر سونے کے لئے لیٹ گئے لیکن کیلی کی آنکھوں سے نیند غائب ہو چکی تھی۔ وہ اس پُر اسرار اڈے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات جمع کر لینے کی فکر میں تھا۔ اُس نے ٹرک کے اندرونی حصّے کی دیکھ بھال شروع کی اور آخر ایک ایسی جھری تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جس کی مدد سے وہ اڈّے کا جائزہ بخوبی لے سکتا تھا۔ اُس نے اڈّے کے بارے میں اب تک جو معلومات حاصل کی تھیں، انہیں دیر تک ذہن میں محفوظ رکھنا ممکن نہ تھا اور ضروری تھا کہ انہیں لکھ لیا جائے، مگر کاغذ کہاں سے ملے؟ کیلی نے ٹرک میں نظر دوڑائی، تو پنیر کا ایک خالی تھیلا مل گیا۔ اس نے سوئے گریمز کی جیب سے ننھی سی پنسل نکالی اور پورے انہماک سے اپنی یادداشتیں تھیلے پر درج کرنے لگا۔ یکایک گریمز نے آنکھ کھولی اور کہا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"چند ضروری باتیں نوٹ کر رہا ہوں۔ اگر ہم یہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تو اپنے افسروں کو معلومات کا بیش بہا خزانہ پیش کر سکیں گے۔"

"تمہارا تو دماغ چل گیا ہے،" گریمز غرّایا۔ "اگر جرمنوں نے یہ کاغذ دیکھ لیا، تو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ کاش! تم طیارے کے ساتھ ہی ختم ہو گئے ہوتے۔ اب اپنے ساتھ ہمیں بھی مرواؤ گے۔ خُدا کے لئے ہم پر رحم کرو۔"

کیلی نے محبت سے گریمز کے شانے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

"میں جانتا ہوں دوست کہ یہ کام خطرناک ہے اور مجھے یہ بھی علم ہے کہ جرمنوں کی آنکھوں میں دُھول جھونک کر فرار ہونا آسان نہیں، تاہم میرا فرض یہی ہے جو میں کر رہا ہوں۔ چونکہ تم اپنے حواس کھو چکے ہو، اس لئے میں تمہیں معذور سمجھ کر اکیلا ہی یہ فرض ادا کروں گا۔"

گریمز نے کچھ کہنے کے بجائے اپنی ہتھیلی پر گھونسا مارا۔ جب وہ کسی بات پر اتفاق کرتا تو اسی طرح ہتھیلی پر گھونسا مارا کرتا تھا۔

"ایک چیز اور،" کیلی نے کہا۔ "تم لوگوں پر خواہ مخواہ رعب ڈالنا میرا مقصد نہیں، لیکن

جب تک اس عہدے کے نشان میری وردی پر موجود ہیں، تمہیں میرے ساتھ اس بیہودہ انداز میں گفتگو نہیں کرنی چاہیئے"

گریمز حسبِ عادت خاموش رہا، تاہم اُس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

کیلی نے ایک اور جھری تلاش کر کے اپنی آنکھ اُس کے ساتھ لگا دی اور فرض ادا کرنے میں مصروف ہو گیا۔ یکایک ٹرک کا دروازہ پُرشور آواز سے کھلا اور باہر لمبے قد اور سنہرے بالوں والی ایک صحت مند لڑکی کھڑی نظر آئی۔ اُس نے فوجی نرسوں کی وردی پہن رکھی تھی۔ ہنسی کے مارے اُس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اُس نے اپنی خوبصورت انگلی سے کیلی کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔

"تم باہر کیوں جھانک رہے تھے گندے آدمی؟ تمہیں معلوم نہیں ایسی حرکت منع ہے؟"

لڑکی کے پیچھے دو فوجی بھی تھے جو یہ بات سن کر بے ساختہ ہنس دیے۔

"سارجنٹ رائشر نے مجھے زخمی ٹانگ کا معائنہ کرنے بھیجا ہے۔ کاش! ہمارا ہسپتال مکمل ہو چکا ہوتا، پھر تم دیکھتے کہ ہم تمہارا کیسا بہترین علاج کرتے، جرمن انجینئروں نے ٹھوس چٹان کاٹ کر دو سو فٹ زیرِ زمین ہسپتال بنوایا ہے اور کمال یہ کہ اس میں جدید مشینری اور ہر قسم کی سہولت مہیا کی جا رہی ہے، کتنی ہی شدید بمباری ہو، ہسپتال پر اُس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔" نرس مسلسل بول رہی تھی اور کیلی سوچ رہا تھا کہ جس بھلے آدمی سے گذشتہ دو گھنٹوں میں کئی جھڑپیں ہو چکی ہیں، اس کا نام رائشر ہے۔

"اچھا، اب مجھے اپنی ٹانگ دکھاؤ۔"

"کیا ہسپتال کی سبھی نرسیں تمہاری طرح حسین ہیں؟" کیلی نے مسکرا کر پوچھا۔

"اگر یہ سچ ہے، تو میں ان سب سے شادی کرنے کو تیار ہوں" گریمز سے چپ نہ رہا گیا۔

جرمن نرس ایسے بیہودہ مذاق کی عادی نہ تھی۔ شرم و غصّے سے اُس کے کان سُرخ ہو گئے اور وہ بمشکل اتنا کہہ پائی:

"تم امریکی ـــــ شیطان کی اولاد ہو۔"

"اور تم جرمن ـــــ" کیلی نے کہا۔ "سب کے سب پاگل اور مذاق کی حس سے بیگانہ

ہو، تم پر جنگ کا سوگ طاری ہے، تم ہار رہے ہو' اس لئے شکلوں پر بارہ بجے ہوئے ہیں لیکن تمہارا چہرہ تو پھول کی طرح کھلا ہوا ہے۔ شاید تم جنگ کے صدمات سے ابھی تک محفوظ رہی ہو''

''ہاں میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جسے کھو کر مجھے صدمہ ہو'' لڑکی کا مسکراتا ہوا چہرہ سنجیدگی میں ڈوب گیا اور اس نے غمگین لہجے میں کہا۔ ''میں سب کچھ پہلے ہی کھو چکی ہوں۔ ڈرسڈن کی بمباری میں میرے والدین چھن گئے۔ ایک سمندری جھڑپ میں میرا بھائی مارا گیا اور سٹالن گراڈ کے محاذ پر میرا خاوند ــــــ حتیٰ کہ میرا پیارا کتا بھی کھو گیا۔ اب میرے پاس کوئی چیز باقی نہیں رہی جو ضائع ہو اور مجھے صدمہ اٹھانا پڑے''

''آہ! مجھے افسوس ہے نرس ــــــ بے حد افسوس'' کیلی کی آنکھوں سے یک لخت آنسو بہنے لگے۔

''میری مصیبت پر تمہیں رونے کی ضرورت نہیں'' نرس نے ہنس کر کہا ''ہمارے ہاں ایک روایت ہے کہ ٹانگ تڑوائے بغیر برف پر پھسلنا نہیں آتا۔ تمہاری ٹانگ کا زخم کچھ زیادہ خطرناک معلوم نہیں ہوتا، ذرا طبی مرکز تک چلو، میں مرہم پٹی کر دوں گی۔ سہارے کے لئے چھڑی بھی مل جائے گی۔ ہم سگنڈ وار نہیں اور دکھ لے کر خوشیاں بانٹنا میرا فرض''۔

اگرچہ کیلی نے جان بوجھ کر نرس کے زخموں کو نہیں چھیڑا تھا، تاہم اُسے افسوس ضرور ہوا تھا۔ بلینچرڈ اور گریمز بھی افسردہ نظر آتے تھے۔ ہنس مکھ نرس مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی مگر آنسو تھے کہ مسلسل رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

طبی مرکز کی چوبی عمارت چاروں طرف سے گھنے درختوں میں چھپی ہوئی تھی۔ تینوں قیدی نرس کے ساتھ وہاں پہنچے، تو اُن کی ملاقات ایک ایسے جرمن سے ہوئی جو بدمزاجی اور بیہودگی میں نرس کی طبیعت کے بالکل برعکس تھا۔ اس دبلے پتلے اور لمبے شخص کے چہرے پر غیر مرئی حروف میں لکھا تھا کہ میں اس دنیا میں صرف برائی کرنے آیا ہوں۔ مجھ سے نیکی کی توقع نہ رکھو۔ یہ شخص جرمن آرمی کا سرجن، کیپٹن ڈاکٹر فرانز جوزف کربس تھا اور اس زیر زمین ہسپتال کا انچارج اور کرتا دھرتا تھا۔ اس کے منہ سے سب سے پہلی بات جو نکلی، وہ یہ تھی:

"سارجنٹ کے گھٹنے کی مرہم پٹی فضول ہے۔ اس کا بہتر علاج یہی ہے کہ اسے کاٹ دیا جائے" جب اُس کی نظر بنچ پر بیٹھے ہوئے دونوں قیدیوں پر پڑی، تو اس نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ وہی ہوا باز نہیں جو جاسوسی اور توڑ پھوڑ کے ارادے سے پیراشوٹ کی مدد سے اترتے ہوئے پکڑے گئے ہیں؟ انہیں تو گولی مار دینی چاہیئے"۔

"جاسوسی؟ توڑ پھوڑ؟" کیلی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "نام، عہدہ اور نمبر جاننے کے باوجود بھی تمہارا یہی خیال ہے تو جہنم میں جاؤ"۔

نرس نے جلدی سے مداخلت کرتے ہوئے کہا: "انہیں فضائی معرکے میں مار گرایا گیا تھا۔ اور دشمن کے فوجی افسر ہونے کی حیثیت سے انہیں طبی امداد بہم پہنچانا ہماری ذمے داری ہے" ڈاکٹر نے ترچھی نظروں سے نرس کو گھورا۔ چند لمحے تک اُن کے مابین جرمن زبان میں گفتگو ہوتی رہی۔ آخر ڈاکٹر نے قائل ہو کر گردن ہلا دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ نہایت احتیاط سے بلینچرڈ کے زخموں کی مرہم پٹی کر رہی تھی۔ جونہی وہ فارغ ہو کر طبی مرکز سے نکلے، اتحادی طیاروں کی ہولناک بمباری شروع ہو گئی اور اس کے بعد ——— کیلی اور اس کے ساتھیوں نے اپنے آپ کو زمین کی سطح سے دو سو فٹ نیچے ایک تہہ خانے میں گھرے ہوئے پایا۔ اب وہ بدحواسی کے عالم میں سوچ رہا تھا کہ انہیں دوبارہ سورج کی روشنی دیکھنی نصیب ہو گی یا نہیں۔

موم بتی کی زرد کانپتی ہوئی روشنی میں اُس نے ماحول کا گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں برآمدہ نما گیلریوں اور پختہ مورچوں کی طرح بنی ہوئی بے شمار کوٹھڑیاں ہیں۔ کہیں کہیں ہسپتال میں استعمال ہونے والے سامان اور اشیائے خورد و نوش کی بند پیٹیاں بھی پڑی دکھائی دیں۔ اڈے کے یہ زیرِ زمین، تہہ خانے سائیکل کے پہیے کی شکل کے مطابق بنائے گئے تھے اور وہ کوٹھڑی جس میں یہ لوگ اُوپر سے آن گرے تھے۔ اس پہیے کا مرکزی نقطہ بنائی گئی تھی۔ مختلف اطراف میں پھیلی ہوئی تین گیلریاں گویا پہیے کے تاروں کی مانند تھیں اور گیلریاں کے آخر میں بنے ہوئے کمرے پہیے کے گھیرے یا حلقے کی حیثیت رکھتے تھے۔ نرس کے بیان کے مطابق تمام کمرے چٹانوں میں بنے ہوئے قدرتی غار تھے۔ جنہیں فوج کے انجینیئروں اور روسی

قیدیوں نے رات دن کی جان توڑ کھدائی کے بعد برآمدے نما گیلریوں کی مدد سے آپس میں ملا دیا تھا۔ غاروں کے کھردرے اور اونچے نیچے حصّوں کو سیمنٹ کی مدد سے ہموار دیواروں کی شکل دے دی گئی تھی۔ کیلی نے اپنی سہولت کے لئے مرکزی کمرے کو ایچ (H) کا نام دے کر باقی تینوں کمروں کو اے، بی، سی (A - B - C) میں بانٹ دیا۔ گیلریوں کو ایک سے تین تک نمبر الاٹ کر دیئے۔

"ہمیں سب سے پہلے ان تمام اشیاء کی فہرست تیار کرنی چاہیئے تاکہ اندازہ ہو کہ ہم اس راشن پر کتنے دن زندہ رہ سکتے ہیں۔" کیلی آپ ہی آپ بڑبڑایا، لیکن اس کی آواز بلینجرڈ کے زود حس کانوں تک پہنچ گئی۔ اس نے کہا۔

"کیا تمہارا کوئی سٹور کھولنے کا ارادہ ہے؟"

"یہ وقت مذاق کا نہیں،" کیلی نے جواب دیا۔ "چلو اٹھو، کام شروع کریں۔"

"کیا بکواس ہے۔" بلینجرڈ جھلّا کر بولا۔

کیلی نے سرد اور ویران نظروں سے اُس کی طرف گھورا اور کہنے لگا۔ "سارجنٹ بلینجرڈ، فوج نے مجھے جو کمیشن دے رکھا ہے، اس کی میعاد صرف اس وجہ سے ختم نہیں ہو جاتی کہ ہم ہزاروں من مٹی کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ تمہیں ایک اچھے اور ذمّہ دار فوجی افسر کی طرح کام کرنا چاہیئے، ورنہ قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر ہم یہاں سے صحیح سلامت نکل کر اپنے وطن پہنچ گئے، تو سب سے پہلے تمہارا کورٹ مارشل کراؤں گا۔"

بلینجرڈ نے چپ چاپ اپنی جیب سے پنسل نکالی اور ایک کونے میں پڑے ہوئے گتّے کے ڈبے کا ڈھکنا اُٹھا لیا۔

تہہ خانے میں داخلے کا راستہ بند ہو جانے کی وجہ سے اس جگہ ہوا کی کمی کا سامنا کرنا پڑتا مگر شدید بمباری کے باعث "اے" کمرے کی چھت میں دراڑ پڑ گئی تھی اور یوں قدرت نے ان زندہ درگور انسانوں کے لئے خود بخود تازہ ہوا کا انتظام کر دیا تھا۔ پانی کا مسئلہ بھی بمباری نے حل کیا۔ گیلری نمبر ایک کی چھت میں پیدا ہونے والے تین چار سوراخوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ کیلی کا خیال تھا کہ گیلری کے اوپر کوئی چشمہ یا پانی کا قدرتی ذخیرہ ہے اور یہ پانی وہیں

سے رِس رِس کر نیچے آ رہا ہے۔ اُس نے نرس سے مخاطب ہو کر کہا۔
"اے لڑکی، تمہارے خیال میں یہاں سے چٹان کی موٹائی کتنی ہو گی؟"
نرس مسکرائی: "میں یہ تو بتا سکتی ہوں کہ ٹانگ میں زخم ہو، تو مارفین کی کتنی مقدار درکار ہو گی، مگر چٹانوں اور سرنگوں کے بارے میں میں تمہاری طرح جاہل ہوں"
کیلی اس جواب پر دانت پیس کر رہ گیا۔ انہوں نے سامان کا جو سرسری اندازہ لگایا، وہ کچھ اس طرح تھا۔
اے کمرے میں مرہم پٹی کا سامان، آپریشن کے اوزار، ہر قسم کی جدید دواؤں کے ذخیرے اور اشیائے خورد و نوش کی پیٹیاں۔
بی کمرے میں شراب کے بہت سے بھرے ہوئے ڈرم اور ہر ڈرم میں اندازے کے مطابق کوئی پچاس گیلن شراب۔
سی کمرے میں زمین کھودنے کے اوزار، تعمیراتی مشینری، رنگ روغن، کمبل، رسّے اور اسی طرح کی الم غلم چیزیں۔ اس کمرے میں برقی قوّت پیدا کرنے والا ایک چھوٹا سا جنریٹر اور اس میں استعمال ہونے والے تیل کے بہت سے ڈرم بھی موجود تھے۔
جگہ اور سامان کا جائزہ لینے کے بعد تینوں واپس اے کمرے میں آئے۔ اب انہیں بھوک کا احساس ہو رہا تھا؛ چنانچہ انہوں نے قیمہ اور مصالحے بھری ہوئی انتڑیوں اور خوبانیوں سے خوب پیٹ بھرا اور پھر اس مصیبت سے رہائی پانے کے طریقے سوچنے میں مصروف ہو گئے۔ کیلی کو اندازہ ہوا کہ اس کے دونوں ساتھی مایوسی اور غم کا شکار ہیں، لیکن جرمن نرس کے حوصلے بلند تھے۔ اس کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی، وہ ہر بات کا جواب اپنے خاص انداز میں دیتی تھی۔ کیلی نے اسے ہدایت کی کہ وہ سٹور سے ضروری سامان لا کر بلینچرڈ کی ٹانگ پر پلستر چڑھا دے۔
"کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ ہم تینوں ملبہ ہٹا کر باہر نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟" نرس نے پلستر تیار کرتے ہوئے پوچھا۔
"ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا"، کیلی نے امید اور یقین سے بھرپور لہجے میں کہا۔ "ہم تنہا تو نہیں ہیں، کیا جرمن انجنیئر یہاں بھرے ہوئے قیمتی سامان کو حاصل کرنے کے لئے کوئی

کوشش نہیں کریں گے؟ ممکن ہے وہ اوپر سے کھدائی شروع بھی کر چکے ہوں۔"

"واقعی؟" بلینچرڈ کے لہجے میں پہلی بار امید کی جھلک محسوس ہوئی۔ "کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا نہیں، ہو گا اور بہت جلد ہو گا۔ آخر وہ بھی تو انسان ہی ہیں جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے پہاڑوں کا سینہ چیر کر اس قدر شاندار تہہ خانے بنائے۔ ہمارا کام تو ان کے مقابلے میں بہت آسان ہے۔"

جب تک پلستر تیار ہوتا، کیلی ایپج کمرے میں جنریٹر لا کر اسے چالو کر چکا تھا اور چند لمحے بعد کمرہ برقی روشنی سے بقعۂ نور بن گیا۔ اس کے بعد اس نے سرنگ کا منہ صاف کرنا شروع کیا اور بہت جلد پتھر اور کنکریٹ کے چھوٹے بڑے ٹکڑے وہاں سے ہٹا دیے۔ اب اس کے سامنے کسی شکستہ ستون کا بہت بڑا ٹکڑا پڑا تھا۔ جس نے سرنگ میں داخل ہونے کا راستہ روک رکھا تھا۔
اس وقت تک نرس، بلینچرڈ کی ٹانگ پر پلستر چڑھا چکی تھی۔ انہوں نے شکستہ ستون کو ایک مضبوط رسے سے باندھ کر گھسیٹنے کی کوشش کی، مگر گھنٹوں جان مار محنت کے باوجود وہ اسے ایک انچ بھی نہ سرکا سکے۔ آخر تھک ہار کر فرش پر گر پڑے اور ہانپنے لگے۔ نرس، کیلی کے قریب بیٹھ گئی اور بولی۔

"جب تک ہم یہاں موجود ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے جرمنی اور امریکہ اتحادی بن چکے ہیں۔"
تہہ خانے کے باہر نہ معلوم دن کا کتنا حصہ ابھی باقی تھا، لیکن یہ سب اس قدر تھک چکے تھے کہ ان کے لئے مزید مشقت کرنا ممکن نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑے خراٹے لے رہے تھے۔ یکایک بلینچرڈ نے کیلی کو جھنجھوڑ کر اٹھایا "جان، تم ٹھیک کہہ رہے تھے اوپر سے کسی کے پتھر کھودنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔"
کیلی بجلی کی مانند تڑپ کر اٹھا اور ایپج کمرے میں پہنچا۔ ابتدا میں اسے کچھ سنائی نہ دیا لیکن کان لگا کر غور سے سننے کے بعد محسوس ہوا کہ ایک مدھم سی آواز اوپر سے آ رہی ہے۔ کچھ دیر بعد اسے شکستہ ستون میں حرکت ہوتی دکھائی دی۔ رسا تو پہلے ہی بندھا ہوا تھا، وہ ایک مرتبہ پھر اس کے ساتھ کشتی لڑنے میں مصروف ہو گئے اس بار وہ اسے کروٹ دلانے میں

کامیاب ہو گئے اور جب انہوں نے قوت سے ایک اور ہلّہ بولا تو ستون اپنی جگہ سے اٹھا اور مینار کی مانند سیدھا کھڑا ہو گیا۔ کیلی نے رسے کو جھٹکا دیا، تو ستون دھڑام سے نیچے آ رہا اور گرتے ہی ریزہ ریزہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد گرد و غبار بیٹھا تو انہوں نے حیرت سے دیکھا کہ سرنگ میں ستون ہٹنے سے جو راستہ بنا ہے۔ اس میں لوہے کا ایک لمبا پائپ ہلتا نظر آتا ہے۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اوپر سے ملبہ ہٹاتے والوں نے ستون کو پرے کرنے کے لئے اس پائپ کے ذریعے مدد بہم پہنچائی تھی۔ کیلی تیزی سے آگے بڑھا اور جونہی اس نے سوراخ نما راستے سے اوپر کی طرف دیکھا، اس کی نظر ایک جرمن سپاہی پر پڑی جو رائفل کی نالی کا رخ کیلی کی جانب کئے ہوئے تھا۔ کیلی دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹا ہی تھا کہ رائفل سے گولی نکلی اور کیلی کے قدموں کے پاس فرش سے ٹکرائی، وہ چلّایا:

"یہ کیا کر رہے ہو، ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں" پھر اس نے بلینچرڈ کی طرف گھور کر کہا" جلدی کرو، بتی بجھا دو۔" اتنی دیر میں جرمن سپاہی اندھا دھند چار پانچ فائر کر چکا تھا۔

"لیفٹیننٹ کیلی ——— لیفٹیننٹ کیلی ———" اوپر سے رائنشر کی مدھم آواز سنائی دی۔

"میں یہاں موجود ہوں" کیلی نے جواب دیا" اپنے آدمی کو روکو، یہ فائرنگ کی کیا تک ہے؟"

"کیا تم اپنے آپ کو ہمارے حوالے کرنے کے لئے تیار ہو؟"

"تم بالکل گدھے ہو رائنشر، ہمیں تم سے لڑ کر کیا لینا ہے" کیلی نے پکار کر کہا "کیا اوپر تک راستہ صاف ہو گیا ہے؟ ہم یہاں تین افراد ہیں۔ میں، میرا ساتھی بلینچرڈ اور ترس سگلینڈ"

اسے دیر تک کوئی آواز سنائی نہ دی۔ آخر کیپٹن کربس اپنے کرخت لہجے میں بولا:

"لیفٹیننٹ، میں کیپٹن کربس بول رہا ہوں۔ وقت ضائع نہ کرو، اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو"

"پھر وہی بکواس ——— بندۂ خدا ہم تو پہلے ہی جنگی قیدی ہیں۔ ہم حوالے کیا کریں؟ کچھ تو عقل کے ناخن لو"

"بمباری شروع ہونے کے بعد تم نے بھاگنے کی کوشش کی تھی" کرِبس چلایا "سیدھی طرح ہمارے قابو میں آجاؤ، ورنہ گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔"

"نہ جانے یہ بدمعاش ہم سے چاہتا کیا ہے؟" بلینچرڈ نے کہا۔ کیلی بلند آواز سے پکار کر کہنے لگا "کیا ہمارا ساتھی گریمز زندہ سلامت تمہارے پاس ہے؟ تم کتنے آدمی ہو؟ عہد کرو کہ تم ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گے لیکن ایسی کوشش کا نتیجہ یہ ہے کہ میں کدال سے تمہاری کھوپڑیاں پاش پاش کر دوں گا۔"

جواب میں اوپر تلے چار گولیاں برسائی گئیں، کچھ دیر کے لئے سکوت طاری ہو گیا، پھر دو آدمیوں کے بحث مباحثے کی آوازیں آنے لگیں۔ کربس اور رائشٹر جرمن زبان میں تیز تیز باتیں کر رہے تھے۔ آخر رائشٹر نے اوپر سے کہا۔

"لیفٹیننٹ، میں سفید جھنڈا لئے صاف دلی سے نیچے اتر رہا ہوں۔ تم بھی اپنی کدال ایک طرف رکھ دو" رائشٹر جیسے قوی الجثہ آدمی کے لئے اس سوراخ میں سے نیچے اترنا مصیبت سے کم نہ تھا، تاہم وہ اترا۔ آہٹ پاتے ہی کیلی نے کدال کا دستہ مضبوطی سے پکڑ کر بلینچرڈ کو ہدایت کی کہ جرمن نرس کو قابو میں رکھے۔ تاکہ وہ رائشٹر کی کوئی مدد نہ کر سکے۔ بلینچرڈ نے اُسے اپنی گرفت میں لے کر اس کا منہ بند کر دیا۔

چند لمحے بعد رائشٹر اپنے عہد کے مطابق بالکل نہتا نیچے آ گیا۔ اُس کے چہرے پر سراسیمگی اور دہشت کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"جو کچھ ہوا اُسے بھول جاؤ۔ کیپٹن کربس ذیابیطس کا مریض ہے۔ اسے روزانہ "انسولین" دی جاتی ہے۔ آج دوسرا دن ہے، اُسے اب دوا نہیں مل سکی اور وہ اس کے بغیر نیم پاگل ہو رہا ہے۔ اُسے اب تک معلوم نہیں کہ ہم پر کیا بیت گئی ہے؛ بہرحال میں اسے قائل کر چکا ہوں، وہ تمہیں گولی مارنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔"

"یہ ہم پر تمہارا چوتھا احسان ہے" کیلی نے کہا اور رائشٹر سے حادثے کی تفصیلات پوچھنے لگا۔ اس نے بتایا کہ سرنگ اوپر سے اس طرح بند ہے کہ فی الحال نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ہم سب تہہ خانے سے چند گز اوپر ایک محفوظ پاکٹ میں پھنس کر رہ گئے۔ گریمز ہمارے

ساتھ صحیح سلامت موجود ہے۔ چند بیلچے اور تھوڑا سا راشن بھی ہے۔ ہمیں یہ بالکل معلوم نہیں تھا کہ تم تینوں تہہ خانے میں پہنچ چکے ہو۔ اچھا یہ بتاؤ یہاں تھوڑی بہت انسولین موجود ہے۔ اس کے بغیر کربس کو راہ راست پہ لانا آسان نہیں۔"

"مجھے معلوم نہیں، لیکن اگر موجود بھی ہو، تو خدا کے لیے کربس کو مر ہی جانے دو۔ میں ایک ہی ملاقات میں اس شخص کو اچھی طرح جان گیا ہوں۔ ہمیں جس صورتِ حال کا سامنا ہے، اُس کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی دشمنی بالائے طاق رکھ دیں اور یہاں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے مل جل کر کوشش کریں، لیکن جب تک کربس موجود ہے، وہ ایسا کبھی نہیں ہونے دے گا اور بالآخر ہمارے ساتھ تم سب کو بھی اسی قبر میں سسک سسک کر موت کا شکار ہونا پڑے گا۔ تمہارے پاس اسلحہ ہے، تم اُس کے زور سے جب چاہو، انسولین حاصل کر سکتے ہو، لیکن میری رائے یہی ہے کہ کربس کو مرنے دو، اس میں ہمارا ہی نہیں، تمہارا بھی بھلا ہے۔"

کیلی کی یہ تقریر سن کر رالشٹر کچھ دیر سوچ میں ڈوبا خاموش کھڑا رہا، پھر بولا۔

"تمہاری دلیلیں نہایت قوی ہیں، لیکن ہمیں جلد بازی سے بچنا چاہیئے۔ ہمیں کربس کو ایک موقع ضرور دینا ہوگا ــــــــ تمہیں معلوم ہے کہ میں ابھی تک باضابطہ جرمن فوج سے متعلق ہوں اور فوج کی روایات اور ضوابط آسانی سے نہیں توڑ سکتا۔ تم مجھے انسولین والا فارمولا آزما لینے دو۔ ہمیں اگر توقع کے مطابق کربس کے معاملے میں کامیابی نہ ہوئی تو کوئی دوسرا حل نکالیں گے ــــــــ تمہاری طرح میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ قدرت نے ایک حادثے کے باعث ہمیں ایک ہی راہ پہ پھینک دیا ہے۔ زندگی کا انحصار ایک دوسرے کی مدد پہ ہے" یہ کہہ کر اس نے ہاتھ آگے بڑھایا اور کیلی نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔

رالشٹر کی آواز پہ کربس رینگتا ہوا سُرنگ سے نکلا، اس کے بعد دو نوجوان فوجی نرسیں اور ان کے پیچھے گریمز آیا اُس کا چہرہ زرد تھا۔ جیسے برسوں کا مریض ہو، سب سے آخر میں یہ چھ جرمن سپاہی نیچے آئے۔ پیاس کے مارے ان کا بُرا حال تھا جونہی انہیں شراب کی موجودگی کی خبر سنائی گئی وہ فرطِ مسرت سے ناچنے لگے اور دل کھول کر پیاس بجھانے لگے۔ نرس سگلینڈ بھاگتی ہوئی کمرہ نمبر بی میں گئی اور انسولین کی پوری بوتل اٹھا لائی۔

"فریج دیر سے بند پڑا ہے۔" اس نے کہا "اس لیے دوا کے زود اثر ہونے کے بارے میں کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی، تاہم آزما لینے میں کیا حرج ہے۔"

اُس نے کربس کو ٹیکہ لگایا، ٹیکا لگتے ہی کربس بے خودی کے عالم میں گہری نیند سو گیا۔ باقی ماندہ لوگ ایک دوسرے کو اشاروں اور ٹوٹی پھوٹی جرمن اور انگریزی کی مدد سے اپنی اپنی آپ بیتی سنا رہے تھے۔ کیلی اور رائشر سرنگ کے اندر گھسے موم بتی کی روشنی میں جائزہ لے رہے تھے کہ انہیں کیسے اور کہاں سے کام شروع کرنا چاہیئے۔ لفٹ، جس میں وہ سب نکل کر آئے تھے، جہاں پھنسی ہوئی تھی، اس کے اوپر سے لے کر سرنگ کے منہ تک ملبہ اٹا پڑا تھا اور اس ملبے کو نیچے سے کھود کر راستہ صاف کرنا بچوں کا کھیل نہ تھا۔ اگر انہیں اوپر سے نیچے آنا پڑتا، تو شاید اتنی دشواری پیش نہ آتی، مگر جن حالات سے وہ دوچار تھے، وہ انتہائی مایوس کن اور پُر خطر تھے۔ ایک گھنٹے بعد جب وہ دونوں واپس آئے، تو جو منظر دیکھا، وہ اُن کے جسموں پر کپکپی طاری کر دینے کے لئے کافی تھا۔ گرمیزا اور ربلنجر ڈکے ہاتھ پاؤں رسیوں سے بندھے ہوئے تھے اور وہ کمرے کے ایک کونے میں بے بس پڑے تھے۔ تینوں جرمن نرسیں حیرت زدہ سی دوسرے کونے میں سہمی کھڑی تھیں۔ سامنے ہی چار جرمن سپاہی رائفلوں سے کیلی پر فائر کرنے کے لئے مستعد نظر آ گئے تھے اور بقیہ دو فوجی کمرے کے وسط میں کھڑے کیپٹن کربس کے اشارے پر رسّا لئے کیلی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"اور دو اسے انسولین۔" کیلی نے دانت پیس کر رائشر سے کہا۔ "دیکھ لیا اپنی مہربانی کا نتیجہ۔"

بے چارا رائشر کچھ کہنے کے بجائے ناگواری سے اپنے شانے اچکا کر رہ گیا۔

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" کربس نے غرّا کر کہا۔ "فرار ہونے کے جرم میں تم سب کو گولی مار دینے کا فیصلہ کر چکا ہوں، تیار ہو جاؤ۔" اس نے جرمن زبان میں دونوں سپاہیوں سے کچھ کہا اور بھوکے کتّے کی طرح کیلی پر لپکے۔ کیلی پہلے ہی تیار تھا۔ اس نے دونوں کو گھونسوں اور لاتوں کی زد پر رکھ لیا اور پھر ایک سپاہی کے ہاتھ سے رائفل چھیننے کے لئے آگے بڑھا ہی تھا کہ بقیہ چاروں سپاہیوں نے آگے بڑھ کر اسے دبوچ لیا؛ چنانچہ تھوڑی دیر بعد کیلی بھی اپنے

ساتھیوں کی طرح رسّے سے بندھا بے بس پڑا تھا اور رائفل بردار جرمن سپاہی فائر کرنے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

"ایک ــــــ دو ــــــ"، کربس گرجا اور سپاہیوں کی انگلیاں ٹریگر پر جم گئیں۔ اب اُسے تین کہنا تھا اور چار گولیاں بدنصیب کپی کا جسم چھلنی کرنے والی تھیں کہ دفعتاً ایک ناقابلِ یقین حادثہ پیش آیا۔ رائشر اپنی جگہ سے اٹھا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا بیلچہ کربس کے سر پر دے مارا، یہ ضرب ایسی شدید تھی کہ کربس کے منہ سے آواز تک نہ نکل سکی اور وہ لکڑی کے لٹھے کی طرح دھم سے فرش پر گر گیا۔

"کم بخت کا بچہ"، رائشر پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے بڑبڑایا۔ فائر کا ارادہ کرنے والے سپاہی دم بخود کھڑے تھے۔ انہوں نے کوئی حرکت نہ کی۔ تینوں نرسوں نے آگے بڑھ کر جکڑے ہوئے قیدیوں کو کھولنا شروع کیا اور جرمن سپاہی یوں لاتعلق ہو کر ایک طرف جا بیٹھے جیسے انہیں اس حادثے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

رائشر کے اشارے پر امریکی قیدی آگے بڑھے اور کربس کو رسّوں سے باندھنے لگے۔ وہ ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔ ایک نرس نے جھک کر اس کی نبض ٹٹولی، دوسری نے دل پر ہاتھ رکھا اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔ کربس زندہ تھا، پھر انہوں نے اس کے پھٹے ہوئے سر پر پٹی باندھی اور اٹھا کر ایک گوشے میں ڈال دیا۔ اب رائشر اپنے ماتحت جرمن سپاہیوں کی طرف مڑا اور کہنے لگا۔

کیپٹن کربس کا دماغ خراب ہو چکا ہے۔ مجھے خدشہ تھا کہ اس موقع پر اگر وہ قیدیوں کو ہلاک کر دیتا، تو ہم ہرگز ہرگز اس قبر نما سرنگ سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ ہمیں ان امریکی قیدیوں کی ہر مرحلے پر ضرورت ہے۔ ہمیں ان سے کام لینا ہے اور میں دیکھ چکا ہوں کہ یہ لوگ کام کرنے اور منصوبہ بنانے میں کتنے تیز ہیں، ہمیں ان سے کوئی خطرہ نہیں، میں ہر شخص کو ہدایت کرتا ہوں کہ وہ میرے حکم کے بغیر کسی قیدی پر ہاتھ نہ اٹھائے۔ ہم سب اس وقت تک ایک دوسرے کے دوست ہیں جب تک اس گڑھے سے باہر نہیں نکل جاتے۔"

رائشر نے تقریر ختم کر کے امریکی قیدیوں سے ہاتھ ملایا، اس کی تقلید میں سپاہیوں اور

نرسوں نے بھی خوشی خوشی ہاتھ ملائے اور اپنے اپنے کاموں میں جُت گئے۔ تین گھنٹے بعد جب رائشر نے کربس کا معائنہ کیا، تو اسے ہوش آچکا تھا اور وہ مسلسل کراہ رہا تھا۔ جونہی اُس نے رائشر کو اپنے قریب دیکھا، مغلظات کا بے پناہ طوفان اُس کے ہونٹوں سے اُبل پڑا۔ ایسی ننگی اور شرمناک گالیاں رائشر اور اُس کے ساتھیوں نے کبھی نہیں سُنی تھیں۔ وہ بار بار کورٹ مارشل کی دھمکی دیتا۔ رائشر نے محسوس کیا کہ سپاہیوں کے حوصلے کربس کی ان دھمکیوں سے پست ہو رہے ہیں اور عین ممکن ہے کوئی شخص چپکے سے اُسے آزاد کر دے، اُس نے سپاہیوں کو وہاں سے ہٹ جانے کا حکم دیا، پھر نرس سگلینڈ کو ایک طرف لے جا کر کہنے لگا۔

"نرس دیکھو، اب ہم کربس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے، جب تک وہ زندہ ہے، ہمارے لئے مصیبت بنا رہے گا —— کیا تم ——" اس سے آگے الفاظ منہ سے نہ نکل سکے۔ نرس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا اور بُری طرح سسکیاں بھرنے لگیں۔ وہ رائشر کا مطلب سمجھ گئی۔

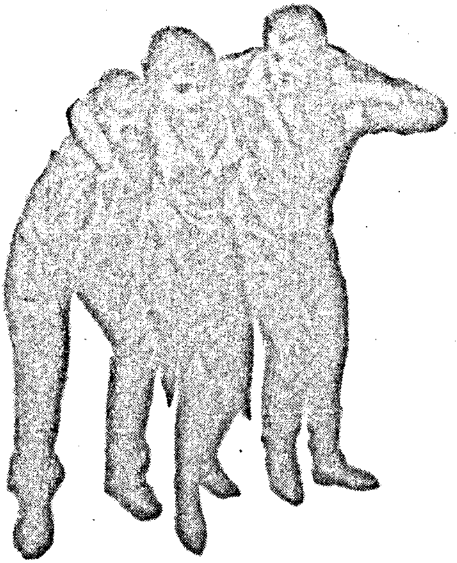
"نہیں، نہیں سارجنٹ، ایسا نہ کرو، وہ بہر حال ہمارا افسر ہے۔ ہمیں ان امریکی قیدیوں پر زیادہ بھروسا نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ قوم نہایت خود غرض اور لومڑی کی طرح عیار ہے ہمیں ان کے ہاتھوں میں نہیں کھیلنا چاہیئے۔ میں کربس کو سمجھانے کی کوشش کروں گی، وہ میری بات مان لے گا۔"

رائشر سوچ میں پڑ گیا۔ "بہت اچھا، میں تمہاری بات مان لیتا ہوں، لیکن شرط یہ ہے کہ کربس کو آزاد نہیں کیا جائے گا۔ تم اس کی دیکھ بھال کرو، تاہم میرا اندازہ ہے کہ انسولین کا زہر اُسے بہت جلد ختم کر دے گا۔"

"آپ کا خیال درست ہے سارجنٹ۔" نرس نے کہا۔ "وہ انسولین کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور ہمارے پاس انسولین کی جو مقدار ہے، وہ آہستہ آہستہ خراب ہو رہی ہے، لیکن اُسے ٹیکہ لگائے بغیر چارہ نہیں، ورنہ وہ ہر وقت گالیاں بکتا رہے گا۔"

یکایک دوسری طرف سے کربس کی آواز سنائی دی۔ وہ نرس سگلینڈ کو پکار رہا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی وہاں پہنچی، تو اُس نے کیلی کو کربس کے سرہانے کھڑا پایا۔ رسیوں میں

جکڑا ہوا کربس نزع کے عالم سے گذر رہا تھا، اُس کا چہرہ پسینے سے تر تھا اور ہاتھ پیروں کی انگلیاں تھرتھرا رہی تھیں، پھر اس کے منہ سے سفید سفید جھاگ نکلنے لگا۔ چشم زدن میں سب لوگ اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ راٹشر کو دیکھ کر کربس نے کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر حلق سے آواز نہ نکلی، پھر اُس نے ایک زور کی ہچکی لی اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔



کیپٹن کربس کی دردناک موت ایسی نہ تھی کہ اُسے چُپ چاپ برداشت کرلیا جاتا۔ جرمن سپاہیوں اور نرسوں پر جتنا اثر ہوتا' اتنا ہی کم تھا؛ کیونکہ کربس بہرحال ان کا افسرِ اعلیٰ تھا اور فوجی قواعد ضوابط کی رو سے وہ اُس کے حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور تھے، لیکن حقیقت یہ تھی کہ امریکی ہوا بازوں کو بھی اس کی موت کا صدمہ پہنچا۔ جرمن نرسیں تو سسکیاں لے لے کر رو رہی تھیں اور سپاہی ایک طرف کھڑے کربس کی لاش کو گھور رہے تھے۔ ان کے چہرے اگرچہ تاثرات سے خالی تھے تاہم لیفٹیننٹ کیلی بھانپ گیا تھا کہ وہ اندر ہی اندر غم و غصے سے کھول رہے ہیں۔ اس نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ جرمن سپاہیوں کا یہ غصہ بے چارے سارجنٹ رائنشر پر غیظ و غضب کی بجلی بن کر گرے گا۔ بلاشبہ اس کی پوزیشن نازک ہو گئی تھی؛ کیونکہ اُس نے نہ صرف کیپٹن کربس کے احکامات کی تعمیل سے انکار کیا، بلکہ اپنے ہی سپاہیوں کی نظروں کے سامنے کربس کے سر پر بیلچہ بھی دے مارا تھا۔

اور اب کربس کی اکڑی ہوئی لاش اُن کے سامنے پڑی تھی۔

یکایک رائنشر کے ہونٹ کپکپائے اور پھر وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ کر بچّوں کی طرح رونے لگا۔

"یہ میرا قصور ہے ——— میں اِس کا قاتل ہوں ——— میرا کورٹ مارشل ہونا چاہیئے ——— ہیں ———" اُس کی آواز گھُٹی گھُٹی چیخوں میں بدل گئی۔ جرمن نرسیں اپنا رونا دھونا بھول کر رائنشر کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں، لیکن کسی کو اتنی جرأت نہ ہوئی کہ آگے بڑھ کر اُسے دلاسا دے یا ہمدردی کا ایک لفظ بھی زبان سے نکالے۔ کیلی دل میں کہہ رہا تھا کہ یہ تو بہت بُرا ہوا، رائنشر بھی ہاتھ سے گیا۔ کسی نہ کسی طرح اس کے ذہن سے یہ غلط خیال نکال دینا چاہیئے کہ کربس کی موت میں اس کا ہاتھ تھا۔ یہ سوچ کر اس نے رائنشر کے شانے کو پیار سے تھپتھپایا اور کہنے لگا:

"سارجنٹ رائنشر، اگرچہ میں اس موقع پر کچھ نہیں کہہ سکتا، کیونکہ ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور دشمن کی موت پر ہمیں خوش ہونا چاہیئے، تاہم حلفیہ کہتا ہوں، میری خواہش نہ تھی کہ کربس کو کوئی تکلیف پہنچے۔ مجھے اس کی موت کا اتنا ہی صدمہ ہے جتنا تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو ——— دراصل وہ انسولین نہ ملنے کے باعث اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا تھا ———"

"بے شک یہی بات تھی ———" گریز نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "اچھا ہوا بیچارہ دنیا کے غموں سے نجات پا گیا۔" یہ جملہ اس نے طنزیہ لہجے میں ادا کیا اور داد طلب نظروں سے کیلی اور بلینچرڈ کی طرف دیکھنے لگا، لیکن انہیں اس موقع پر گریز کی بذلہ سنجی اور خوش طبعی پسند نہ آئی۔ کیلی نے آنکھیں نکال کر اسے گھورا اور بلینچرڈ کا اگلا فقرہ ہونٹوں ہی پر اٹکا رہ گیا، نہ معلوم وہ اور کیا کیا کہتا۔

"ہر وقت کی بکواس اچھی نہیں ہوتی پیارے بھائی! کبھی موقع محل بھی دیکھ لیا کرو۔" بلینچرڈ نے گریز کو سمجھایا اور گریز احمقوں کی طرح گردن ہلانے لگا۔ پھر اس نے منہ اس طرح بگاڑا جیسے ابھی رو پڑے گا۔ گریز کی اِس ایکٹنگ پر کیلی اور بلینچرڈ بمشکل اپنی مسکراہٹ ضبط کر سکے، لیکن نرس سگلینڈ بے اختیار کھِل کھِلا کر ہنس پڑی۔ جرمن سپاہیوں کے چہروں کی کھچی ہوئی کمانیاں بھی اصلی جگہ آ گئی تھیں اور وہ بھی اپنی ہنسی چھُپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

سارجنٹ رائنشر نے نرس سگلینڈ کے قہقہے کی آواز سن کر منہ اوپر اُٹھایا اور بولا۔

"ہنسو ——— خوب ہنسو ——— میں نے کام ہی ایسا کیا ہے نا؟ میں اسی لائق ہوں کہ مجھ پر نہ صرف ہنسا جائے، بلکہ میرے سر پر جوتے بھی برسائے جائیں۔"

یہ کہہ کر وہ پھر سسکیاں بھرنے لگا۔ اس کے یہ الفاظ تھگلینڈ کا مزاج درست کر دینے کے لئے کافی تھے۔ نرس یک لخت سنجیدہ ہوگئی اور معذرت آمیز لہجے میں کہنے لگی،

"سارجنٹ، معاف کر دو ــــــ اس کم بخت امونکی نے منہ ایسا بنایا تھا کہ میں ہنسی نہ روک سکی ــــ مجھے اپنی اس حرکت پر سخت ندامت ہے ــــــ"

رائنشر نے جیب سے رومال نکالا، اپنے آنسو پونچھے اور وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کیلی اس کے پیچھے پیچھے تھا اور تسلّی دینے کے لئے مزید چند جملے سوچ ہی رہا تھا کہ رائنشر ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا:

"تم سمجھ رہے ہوگے کہ اس مردود کریبس کی موت پر میں واقعی آنسو بہا رہا ہوں ــــــ حالانکہ اس کی موت کی مجھ سے زیادہ خوشی کسی کو نہ ہوگی۔ یہ وہ شخص تھا جس نے میرے خاندان کے تمام افراد کو گسٹاپو کے ذریعے موت کے گھاٹ اتارا۔ چونکہ وہ میرا افسر تھا اور میں نے اپنے سپاہیوں کی موجودگی میں اس پر وار کیا تھا، اس لئے یہاں سے نکلنے کے بعد میرا کورٹ مارشل ضرور ہوتا۔ میرے سپاہی کبھی جھوٹ نہ بولتے اور فوجی عدالت میں صاف صاف سارا واقعہ بیان کر دیتے، چنانچہ اُن کا غصّہ ٹھنڈا کرنے کے لئے رونے دھونے کا یہ ناٹک رچانا پڑا۔ ممکن ہے اس طرح میں ان کی ہمدردیاں حاصل کر سکوں۔"

لیفٹیننٹ کیلی دم بخود کھڑا اس کی یہ تقریر سُن رہا تھا۔ اُسے یقین نہ آتا تھا کہ سارجنٹ رائنشر اداکاری کا اتنا عمدہ نمونہ پیش کر سکتا ہے۔ کریبس کی موت پر اپنے چہرے کا رنگ اُڑانا اور آنکھوں سے آنسوؤں کی مسلسل برکھا برسانا اسی کا کام تھا۔

"پناہ بخدا ــــــ" کیلی نے بے تکلفی سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر کہا "یار تم تو کمال کے آدمی نکلے ــــــ بندۂ خدا، دعا کرو کہ ہماری تمہاری یہ منحوس جنگ جلد ختم ہو، پھر میں تمہیں امریکہ لے چلوں گا۔ کئی بڑے بڑے فلم ساز اور مشہور ڈائریکٹر میرے شناسا ہیں۔ تمہیں کام دلوا دوں گا ــــــ لاکھوں میں کھیلنے لگو گے۔"

کیلی کے یہ جملے سُن کر رائنشر ایک دم سنجیدہ ہوگیا اور نفرت سے اس کا ہاتھ جھٹک کر بولا:

"لیفٹیننٹ، اب خوشامد اور چاپلوسی سے فائدہ؟ ہم اور تم ایک ہی کشتی میں سوار ہیں اور

مشترکہ کوششوں کے بعد ہی اِس مصیبت سے چھٹکارا پا سکتے ہیں، لیکن یہ سمجھ لو کہ جب تک ہمارے اور تمہارے مابین جنگ جاری ہے، میں کبھی تمہارا دوست نہیں بن سکتا۔ میں تمہاری فلم کمپنیوں اور ڈائریکٹروں پر لعنت بھیجتا ہوں ـــــ میرے اپنے ملک میں سب کچھ ہے۔ تم روپے کا لالچ دے کر مجھے بے وقوف بنانا چاہتے ہو، افسوس ہے اس ذہنیت پر ـــــ تم امریکی دنیا کی ہر شے اور ہر شخص کو بکاؤ مال سمجھ کر خریدنا چاہتے ہو، لیکن یاد رکھو تم جرمنی اور جرمن عوام کا حوصلہ خریدنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ میں آخری بار کہتا ہوں کہ آئندہ ایسی باتیں مجھ سے یا میرے ساتھیوں سے نہ کرنا، ورنہ میں تمہاری جانوں کی سلامتی کا کوئی ذمہ نہ لوں گا۔"

کیلی کو ایک بار پھر دم بخود ہونا پڑا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سارجنٹ رائنشر کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔ بہرحال اس کی بات سن کر کیلی دل ہی دل میں انتہائی ندامت محسوس کر رہا تھا۔

"سارجنٹ، تم نے ٹھیک کہا، میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ بلاشبہ تمہیں ان سے بڑا رنج پہنچا ہوگا، لیکن یقین کرو میری نیت بری نہ تھی، نہ تمہیں بکاؤ مال سمجھتا ہوں اور نہ میں نے روپے کا لالچ دیا ہے، بلکہ خلوص سے یہ بات کہی تھی۔ اگر تم اس میں اپنی توہین محسوس کرتے ہو تو معافی مانگنے کو تیار ہوں۔"

"بس ٹھیک ہے یار ـــــ" رائنشر نے اکتا کر کہا۔ "تم اپنے راستے پر چلتے رہو، ہم اپنے راستے پر چلیں گے۔ جنگ میں ہار جیت کے بعد ہی فیصلہ ہوگا کہ مجھے تم سے دوستی کرنی چاہئے یا نہیں، اس سے پہلے ہم بہرحال ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ ملاؤ ہاتھ اسی بات پر ـــــ"

کیلی نے ہاتھ ملایا اور کہنے لگا: "اب مسئلہ یہ ہے کہ کربس کی لاش کو ٹھکانے کیوں کر لگایا جائے۔ ظاہر ہے لاش کچھ عرصے بعد گل سڑ جائے گی اور ہمارے بدبو کے سبب کا دم گھٹنے لگے لگا۔"

"صحیح ہے۔" رائنشر نے تسلیم کیا۔ "میرا خیال ابھی تک اس طرف نہ گیا تھا۔ بہرحال ابھی طے کر لیتے ہیں، لیکن میرے سامنے اس وقت جو صورتِ حال ہے، وہ کربس کی لاش کو ٹھکانے لگانے سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔"

"وہ کیا؟"

"وہ ہی کورٹ مارشل کا خطرہ۔ تم ان جرمن سپاہیوں کی فطرت سے آگاہ نہیں ہو۔ میں ان بدمعاشوں کی رگ رگ سے واقف ہوں اور مجھے خدشہ ہے کہ ان میں سے ایک آدھ ضرور گسٹاپو کا آدمی ہو گا۔ دراصل گسٹاپو کا نظام اتنا ہمہ گیر اور سخت ہے کہ جرمن فوج کا کوئی حصہ اس کی دست برد سے محفوظ نہیں اور اسی لئے ہر شخص دوسرے کے سامنے ایسی حرکت کرتے ہوئے ڈرتا ہے جس کی جواب دہی کرنی پڑ جائے۔ میں نے کربس کے سر پر بیلچہ دے مارا اور ان سپاہیوں نے اپنی آنکھوں سے یہ ماجرا دیکھا ——"

"سارجنٹ، تم اپنے دفاع میں کہہ سکتے ہو کہ کربس کا دماغی توازن بگڑ گیا تھا اس لئے ——" کیلی نے دلیل دینی چاہی، لیکن رائشر نے بے صبری سے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "سب بے کار ہے —— فضول ہے۔ وہ لوگ میرا کوئی عذر نہ سنیں گے، کربس کا دماغ خراب ہو یا کچھ اور، وہ بہرحال کیپٹن تھا اور اس کے احکامات کی تعمیل میرا فرض۔ ہمیں تو یہی حکم ملا تھا کہ کربس کی ہدایات پر عمل کریں، ہماری حیثیت تو ان کٹھ پتلیوں کی سی ہے جو کسی اور کے اشارے پر ناچتی ہیں، خود اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتیں۔ اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ میں اپنے حواس میں نہ تھا، ورنہ میرا ہاتھ کبھی کربس پر نہ اٹھتا۔ اب مجھے اپنے کیئے کی سزا بھگتنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔"

"لیکن تم اپنے سپاہیوں کو قائل تو کر سکتے ہو کہ ——" کیلی نے جرح کرنی چاہی۔

"کیا انہیں اس کا قائل کروں کہ میں نے کربس کے سر پر بیلچہ نہیں مارا؟" رائشر نے جھلا کر کہا "بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اور یہ سب کچھ تم لوگوں کی وجہ سے ہوا۔ مجھے کربس سے لاکھ نفرت سہی، لیکن یہ تو تم بھی مانو گے کہ فوجی قواعد وضوابط کی رو سے اس کا حکم ماننا میرا فرض تھا۔ میں نے اس کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ اسے بغاوت کے سوا کیا کہا جائے گا؟ بولو، تم میری جگہ ہوتے، تو کیا تمہارے اعلیٰ افسر تمہیں معاف کر دیتے؟"

"نہیں، وہ مجھے کبھی معاف نہ کرتے۔" کیلی نے اقرار کیا۔ سارجنٹ رائشر کے ہونٹوں

پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ کیلی کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے اس جوشیلے اور کھلنڈرے نوجوان ہوا باز کی صاف گوئی پسند آگئی تھی اور اسے اتنا تو یقین ہو چلا تھا کہ یہ نوجوان ہٹ کا پکا اور نڈر بھی ہے۔ اور کسی نازک مرحلے پر دھوکہ نہ دے گا۔ کیلی نے اُسے تذبذب کے عالم میں دیکھ کر کہا:

"تم جس غم میں گھل رہے ہو، سارجنٹ، اس کا حل تو اُس وقت تلاش کرنا جب اس دو سو فٹ گہری قبر میں سے زندہ سلامت باہر نکل سکے۔ ہمیں سب سے پہلے یہاں سے نکلنے کی تگ و دو کرنی چاہیئے۔ اس کے بعد جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ اب براہِ کرم کورٹ مارشل کا بھوت سر سے اتارو اور اپنے آدمیوں سمیت کام میں جُت جاؤ۔"

رائنشر نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور پھر کیلی کے ساتھ اسی جگہ آگیا جہاں کربس کی لاش پڑی تھی۔ جرمن سپاہی ایک گوشے میں اطمینان سے بیٹھے بیئر چڑھا رہے تھے اور نرسیں ایک طرف کھڑی سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ بلیچرڈ اور گریمز منہ لٹکائے دوسرے گوشے میں بیٹھے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کیلی کا رویّہ ناقابلِ فہم ہوتا جا رہا ہے۔

رائنشر اور کیلی کو واپس آتے دیکھ کر سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ رائنشر نے بے پروائی سے کربس کی طرف اشارہ کر کے جرمن زبان میں اپنے سپاہیوں اور نرسوں کو مخاطب کیا اور ایک لمبی تقریر کی جو کیلی اور اس کے ساتھیوں کی کچھ سمجھ میں آئی، کچھ نہ آئی۔ تاہم اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس سرنگ سے رہائی پانے کے لئے کربس کا چل بسنا ضروری تھا، ورنہ وہ ایسے حالات پیدا کر دیتا جو "جرمن قوم اور ملک کی سلامتی" کے لئے بے حد مُضر ہوتے۔ بالہٰذا اس کا سوگ منانے کی زیادہ ضرورت نہیں، صرف ایک انسان اور دوست کی حیثیت سے اس کے لئے آنسو بہائے جا سکتے ہیں اور یہ آنسو خاصے بہائے جا چکے ہیں۔ مزید آنسو ضائع کرنا فضول ہے وغیرہ وغیرہ۔

"مگر سارجنٹ، لاش ہم کہاں لے جائیں، اس کا کیا کریں؟" نرس سگلینڈ بول اُٹھی۔ رائنشر سر کھجا کر کیلی کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھنے لگا۔

"بے شک اُسے فوراً ٹھکانے لگانا چاہیئے، ورنہ بدبو کے مارے یہاں سانس لینا بھی مُشکل ہو جائے گا۔" کیلی نے کہا۔ "لیکن سوال یہ ہے کہ اسے ٹھکانے کیوں کر لگائیں، زمین میں گڑھا

کھودنا ممکن نہیں اور نہ یہ لاش کسی تابوت میں بند کی جا سکتی ہے۔

"میں بتاؤں؟ ایک تدبیر ذہن میں آئی ہے۔" بلنچرڈ نے کہہ ہی دیا۔

"جلدی بکو۔" کیلی نے اُسے خشمگیں نظروں سے گھورا۔

"تدبیر یہ ہے ——" بلنچرڈ دانستہ رُکا، پھر مصنوعی انداز میں کھانسنے لگا۔ سب بے صبری سے اس کی تجویز سننے کے منتظر تھے۔ "تدبیر یہ ہے جناب کہ میں نے اس کاٹھ کباڑ میں کہیں چونے سے بھری ہوئی ایک بوری دیکھی ہے۔"

"بس میں سمجھ گیا۔" کیلی چلّایا۔ "پہلی مرتبہ تمہارے منہ سے کام کی بات سن رہا ہوں"

اس نے جلد جلد سارجنٹ رائنٹر کو سارا منصوبہ سمجھایا۔ انہوں نے لکڑی کے ایک صندوق میں کربس کی لاش ٹھونسی اور اسے چونے سے ڈھانپ کر اوپر سے کئی گیلن بیئر شراب انڈیل دی۔ چند منٹ کے اندر اندر چونا کھولنے لگا۔ اور آدھ گھنٹے بعد جب انہوں نے صندوق میں دیکھا، تو کربس کی لاش گل سڑ کر جلے ہوئے چونے کے بڑے بڑے ڈلوں میں تبدیل ہو چکی تھی۔

"خس کم جہاں پاک۔" کیلی بڑبڑایا۔ پھر انہوں نے کربس کو اتنی آسانی سے ٹھکانے لگا دینے کی خوشی میں جی بھر کر بیئر پی اور سارے رنج و غم فراموش کر دیئے۔ جرمن سپاہی اس تمام قصے سے الگ تھلگ رہے۔ اگرچہ انہوں نے کربس کو جلانے کی کارروائی میں کوئی حصہ نہ لیا تھا؛ تاہم ان میں سے کسی نے اعتراض بھی نہ کیا۔ ان کے رویئے سے صرف یہ اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں اس مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں؛ البتہ سارجنٹ رائنٹر کو اپنا افسر اعلیٰ مانتے ہوئے حکم کی تعمیل کے لئے آمادہ نظر آتے تھے۔

دو دن تک بحث مباحثے کے بعد یہ سب لوگ درج ذیل منصوبے کے مطابق کام کرنے کے لئے تیار تھے۔ منصوبے کے دو حصے تھے۔ پہلا یہ کہ دو سو فٹ اونچی سرنگ میں سے ملبہ ہٹا کر اُسے صاف کیا جائے اور دوسرا یہ کہ ایک نئی سرنگ کھودی جائے۔ ان میں سے جو منصوبہ زیادہ آسان اور سود مند ہو گا، بعد میں پوری قوت اسی پر صرف کی جائے گی۔

تیرہ افراد کی اس جماعت کو جس میں تین لڑکیاں بھی شامل تھیں، کیلی کی تجویز کے مطابق اس طرح سے گروپوں میں تقسیم کیا گیا:

۱: کام تین شفٹوں میں ہوگا اور ہر شفٹ آٹھ گھنٹے مصروف رہے گی۔

۲: دو شفٹوں میں چار چار افراد شامل ہوں گے اور تیسری شفٹ کیلی سمیت پانچ افراد پر مشتمل ہوگی۔

۳: ہر شخص آٹھ گھنٹے کام کرنے کے بعد ۱۶ گھنٹے آرام کرے گا۔

تینوں نرسیں الگ الگ شفٹوں میں شامل کی گئیں، اسی طرح کیلی کے ساتھی دونوں ہوا باز، بلیچرڈ اور گریز بھی پہلی دو شفٹوں میں رکھے گئے۔ مقصد یہ تھا کہ جرمنوں اور امریکیوں میں تعاون بڑھے اور وہ ایک دوسرے کے طریق کار کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ منصوبے کی نگرانی اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی مشترکہ ذمہ داری کیلی اور رائنشر کے کندھوں پر تھی، تاہم رائنشر نے کیلی کو اجازت دے دی تھی کہ وہ احکام جاری کرے گا اور جرمن تعمیل کریں گے۔

تیسری شفٹ نے سب سے پہلے کام شروع کیا۔ اس میں کیلی کے علاوہ رائنشر، نرس سگلینڈ اور جرمن سپاہی کراز اور کارپورل میڈریگل شامل تھے۔ برقی روشنی پیدا کرنے والے جنریٹر نے تاریکی دور کرنے میں بڑی مدد کی اور کیلی اکثر سوچتا کہ اگر یہ جنریٹر دستیاب نہ ہوتا، تو ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والے اندھیرے میں کھدائی کا کام ممکن نہ ہوتا۔ سارجنٹ رائنشر اور نرس سگلینڈ تو کسی قدر انگریزی سمجھ اور بول لیتے تھے اور کیلی ان کے مزاج سے بھی آگاہ ہو چکا تھا لیکن کراز اور میڈریگل کے بارے میں اُسے اندازہ نہ تھا کہ وہ کس ذہن کے آدمی ہیں۔ دونوں نہایت خاموش طبع اور انتہائی جفاکش آدمی تھے۔ شاذونادر ہی زبان کھولتے؛ البتہ مشین کی طرح کام کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مستعدی دکھاتے تھے۔ سارجنٹ رائنشر سے کبھی انہوں نے تُند لہجے میں بات نہ کی تھی اور نہ اس کا حُکم کبھی ٹالا تھا۔

دو ہفتوں کی مسلسل اور جان توڑ مشقت کے بعد وہ سرنگ میں سے تیس فٹ کی اونچائی تک ملبہ ہٹانے میں کامیاب ہو گئے۔

اس دوران میں کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ تینوں شفٹیں پروگرام کے مطابق منصوبے پر عمل

پیر اتھیں۔ انہیں اندازہ ہو گیا کہ ایک نئی سرنگ کھودنے کے بجائے اسی پرانی سرنگ کو صاف کرنا زیادہ آسان ہے؛ چنانچہ پورا زور اسی پر لگا دیا گیا۔

تیس فٹ کا یہ حصہ جسے صاف کیا گیا، چھوٹے چھوٹے پتھروں اور سمینٹ کے باریک ملبے سے اٹا ہوا تھا۔ اس میں چونے کی مقدار اتنی زیادہ تھی کہ کام کرنے والوں کے جسم اس میں بری طرح اَٹ گئے تھے اور چونا آہستہ آہستہ بدن کی کھال کو متاثر کر رہا تھا۔ نرسوں کے بالوں میں چونا اور مٹی اس قدر بھر گیا کہ جھنجنیاں نظر آنے لگیں۔ یہی حال مردوں کا تھا۔ ان کے کپڑے تار تار ہو چکے تھے۔ لیکن سٹور میں نئی جرمن وردیاں موجود تھیں، اس لیے انہیں کوئی فکر نہ تھی؛ البتہ نرسوں کی یونیفارم نہ مل سکیں، چنانچہ انہوں نے بھی مردوں کی وردیاں پہن لیں۔ اب ہر شخص کا نہانے کو جی چاہتا تھا اور اگرچہ ان کے پاس پانی کی خاصی مقدار جمع ہو چکی تھی لیکن کوئی شخص اسے ضائع کرنے کے حق میں نہ تھا۔ یہ پانی وہی تھا جو اوپر کی طرف سے چٹانوں کی نامعلوم درزوں اور سوراخوں میں سے رِس رِس کر نیچے پہنچا تھا۔

چالیس فٹ کے بعد اچانک ان کے سامنے مشکلوں کا پہاڑ آن کھڑا ہوا۔ سرنگ کے اس حصے میں بڑے بڑے وزنی پتھر اَٹکے ہوئے تھے جنہیں اٹھانا تو درکنار، ہلانا بھی ممکن نہ تھا۔ ویسے بھی ان سب کے ہاتھوں میں پھاوڑے اور بیلچے چلا چلا کر چھالے پڑ چکے تھے اور جب چٹانوں سے گھری ہوئی اس گہری سرنگ میں پھاوڑے اور بیلچے چلتے تو گونجدار دھماکوں سے کانوں کے پردے پھٹنے لگتے۔ نرسوں نے تو مستقل طور پر روئی ٹھونس رکھی تھی۔

دوپہر کو کھانے کے وقت جو باسی گوشت اور سوکھی ہوئی روٹی کے چند ٹکڑوں پر مشتمل تھا، کیلی نے رائنٹر سے گفتگو کا آغاز کیا:

"اتنے وزنی پتھروں کو توڑنا انسانی بازوؤں کی قوت سے باہر ہے۔ میرا خیال ہے ڈائنامیٹ سے کام لینا پڑے گا۔"

"ڈائنامیٹ"۔ نرس سگلینڈ کے حلق میں جیسے نوالہ پھنس گیا۔ سبھی لوگ حیرت اور خوف کی نظروں سے کیلی کو دیکھ رہے تھے۔

"کیا کہا ڈائنامیٹ؟" بلنچرڈ حسبِ عادت بولا۔ "میں کہتا ہوں لیفٹننٹ تمہارا دماغ تو ٹھکانے ہے؟"

کیلی نے غیظ آلود نظروں سے بلنچرڈ کو گھورا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کوڑھ مغز نوجوان کو امریکی فضائیہ میں کیسے بھرتی کر لیا گیا؛ تاہم غصہ ضبط کر کے اس نے نرمی سے کہا۔

"اگر میرا دماغ ٹھکانے نہیں رہا تو تم ہی کچھ کر دکھاؤ، تمہارا دماغ تو خوب چل رہا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ایک طرف اطمینان سے بیٹھ گیا۔ گریمز نے بلنچرڈ کی گردن پر ایک ہاتھ مارا اور دانت پیس کر بولا:

"خدا کی قسم! تمہاری بکواس سن سن کر میرا خون کھولنے لگا ہے۔ لیفٹننٹ کیلی جو کچھ کہہ رہا ہے، ہمارے فائدے کے لئے ہے۔ اگر وہ ڈائنامیٹ کا استعمال مناسب سمجھتا ہے تو اس میں ہرج کیا ہے۔ کیا اتنے بڑے بڑے پتھر توڑنے کے لئے تمہارا باپ جہنم سے چل کر آئے گا؟"

ممکن ہے بلنچرڈ گریمز کی یہ بات نظر انداز کر جاتا لیکن باپ کی گالی اس کی قوتِ برداشت سے باہر تھی۔ اُس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا بھاری بیلچہ اُٹھایا اور گریمز کے سر پر مارنے کی کوشش کی۔ گریمز اچھل کر پرے نہ ہٹ جاتا، تو اس کی کھوپڑی یقیناً پاش پاش ہو جاتی۔

"حرامی کے پلّے ——— سُور ———" بلنچرڈ کے منہ سے مغلظات کا ایک نہ رکنے والا طوفان اُبل پڑا، اور طیش سے اس کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ بلنچرڈ اور گریمز دونوں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے اور یہ کیلی ہی کا حوصلہ تھا کہ انہیں اب تک سنبھالے چلا آتا تھا۔ اس سے پیشتر کہ وہ کوئی قدم اُٹھاتا، بلنچرڈ اور گریمز آپس میں دست و گریبان ہو چکے تھے۔ رائنشر اور دو جرمن سپاہی بیچ بچاؤ کرانے کے لئے آگے بڑھے ہی تھے کہ کیلی نے منع کر دیا۔

"سارجنٹ رائنشر! انہیں دل کے حوصلے نکال لینے دو۔ میں بھی ان سے عاجز آ گیا ہوں۔"

تین منٹ کی گھونسے بازی اور گالم گلوچ کے بعد دونوں لڑنے والے بُری طرح سے ہانپ رہے تھے، مگر پیچھے ہٹنے کے لئے کوئی بھی آمادہ نہ تھا۔ آخر کیلی سے صبر نہ ہو سکا، وہ اُٹھا اور اس کا گھونسہ بلنچرڈ کے پیٹ پر پڑا۔ بلنچرڈ درد سے دہرا ہو کر فرش پر گر پڑا۔ اس نے دوسرا ہاتھ گریمز کی کنپٹی پر رسید کیا اور وہ بھی اوندھے منہ زمین پر ناک رگڑتا نظر آیا۔

"میں تم دونوں کو جان سے مار ڈالوں گا۔" کیلی آپے سے باہر ہو چکا تھا۔ وہ سارجنٹ رائنشر سے رائفل چھیننے کے لئے آگے بڑھا۔ رائنشر رائفل دیتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اس نے سوچا یہ بدمعاش رائفل لینے کے لئے ڈراما کھیل رہے ہیں۔ ضرور یہی بات ہے۔ ان کے دلوں میں بے ایمانی اور بدی ہے۔ یہ خیال آتے ہی رائنشر نے اپنی رائفل مضبوطی سے تھام لی اور چلایا:

"پرے ہٹ جاؤ، میں یہ سب چالاکیاں سمجھتا ہوں، اسی بہانے تم رائفل ہتھیانا چاہتے ہو۔"

کیلی کا سارا جوش و خروش یک دم کافور ہو گیا۔ یہی حال بلنچرڈ اور گریمز کا تھا۔ ایک لمحے کے لئے کیلی کے منہ سے کچھ نہ نکل سکا ——— اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سارجنٹ رائنشر اب تک انہیں قابلِ اعتماد نہیں جانتا۔ رائنشر سے کچھ کہنے کے بجائے وہ اپنے ساتھیوں کی طرف رُخ کر کے افسردہ لہجے میں بولا:

"دیکھا تم نے، جرمن کتنے فرض شناس اور ہوشیار ہیں۔ اس مشترکہ مصیبت میں بھی وہ نہیں بھولے کہ ہم اُن کے دشمن ہیں اور ایک تم ہو کہ آپس ہی میں کھینچا تانی کرتے ہو۔ لعنت ہے تم دونوں پر ——— اور میں کیا کہوں۔"

بلنچرڈ اور گریمز پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ان کے سر جھکے ہوئے تھے اور نظریں زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔ "میں آخری بار حکم نہیں، التجا کرتا ہوں کہ اپنے ملک اور اپنی فوج کے وقار کو یوں بے آبرو نہ کرو۔"

تھوڑی دیر بعد بلنچرڈ اور گریمز گلے مل رہے تھے، لیکن انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ کیلی کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہیں۔

ٹھیک چار ماہ بعد ان بدنصیب قیدیوں پر شب تاریک میں رہائی کا سورج طلوع ہوا۔ اس روز رہ اپنے حساب کے مطابق دو سو فٹ کی اونچائی تک ملبہ صاف کر کے اور اسی ملبہ کی سیڑھیاں بنا کر ایک دوسرے کا سہارا لیتے اوپر آ گئے تھے۔ ڈائنامیٹ نے ان کی بڑی حد تک مدد کی تھی اور اگر اس تدبیر پر عمل نہ کیا جاتا تو وہ برسوں میں بھی راستہ صاف نہ کر سکتے تھے۔ کیلی سب سے آگے تھا اور نہایت احتیاط سے اپنے آگے جما ہوا ملبہ ہٹا رہا تھا۔ چار ماہ تک سورج کی روشنی میسر نہ آنے اور باسی خوراک اور گندا پانی پی پی کر سب کی حالت خراب تھی۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئے تھے اور کپڑے چیتھڑوں کی طرح بدنوں پر جھول رہے تھے۔ اتنے عرصہ تک گہری زمین در زمین دفن رہنے کے بعد زمین کی سطح پر پہنچنے اور اس دنیا کو دیکھنے کی خواہش ان کے سینوں میں بری طرح تڑپ رہی تھی اور اب سب ہی دھڑکتے دلوں کے ساتھ ایک دوسرے کو سہارا دیتے اور احتیاط سے قدم بڑھانے کی ہدایتیں دیتے ہوئے اوپر چڑھ رہے تھے۔

یکایک کیلی کا ہتھوڑا آخری بار مٹی کے ایک ڈھیر سے ٹکرایا اور پھر اس کے سامنے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ باہر چمکتے ہوئے سورج کی بے تاب کرنیں ان بدنصیبوں کا منہ چوم لینے کیلئے ایک ننھے سے سوراخ کے راستے تاریک گڑھے میں گھس آئیں اور پھر ان کے منہ سے خوشی کی چیخیں نکل گئیں۔ کیلی نے جلدی جلدی لرزتے بے جان ہاتھوں سے مٹی ہٹائی اس وقت اسے کچھ نظر نہ آ رہا تھا ——— دم بدم بڑھتی ہوئی تیز دھوپ کے باعث اس کی آنکھیں کھلتی ہی نہ تھیں۔ اب وہ گڑھے کے کنارے اندھوں کی طرح ٹٹول رہا تھا۔ یک لخت اس نے جست کی اور باہر نکل آیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے برہنہ جسم میں ہزاروں سوئیاں گھونپ دی گئی ہیں۔ چار ماہ تک ایک تاریک اور حد درجہ سیلے مقام میں رہنے کے باعث اس کا جسم اچانک دھوپ کی گرمی برداشت نہ کر سکا کیلی کے حلق سے چیخ نکلی، لیکن قید سے رہائی پانے کی بے پناہ خوشی نے اس تکلیف کا احساس قدرے زائل کر دیا۔ اب وہ چندھوں کی طرح ادھ کھلی آنکھوں سے گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور یہ دیکھ کر اس کے خوف اور حیرت کی انتہا نہ رہی کہ نظروں

کے سامنے بالکل وہی منظر تھا جو اس نے گڑھے میں دفن ہونے سے قبل دیکھا تھا۔ اِس منظر میں سرِمُو فرق نہ تھا۔ اتحادی طیاروں کی بمباری سے اڈّے کو جس طرح نقصان پہنچا تھا اس کی کیفیت بالکل وہی تھی جیسی وہ چھوڑ گیا تھا۔ جا بجا ٹوٹی پھوٹی کرینیں، اُلٹی ہوئی گاڑیاں جلے ہوئے ٹرک اور طیارہ شکن توپیں بھی ناکارہ ہوئی پڑی تھیں۔

"یا خدا، یہ کیا اسرار ہے؟ کیا اِس دوران میں وقت ٹھہر گیا تھا یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔" وہ بڑبڑایا اور اس کی یہ بڑبڑاہٹ بلیچرڈ کے زود حس کانوں تک پہنچ گئی اور اگرچہ وہ بے ہودہ باتیں بکنے کی قسم کھا چکا تھا، لیکن یہ موقع ایسا تھا کہ اُس سے صبر نہ ہو سکا۔ بے اِختیار بول اُٹھا۔

"اگر اجازت دو، تو تمہارے سر پر ایک ہاتھ رسید کر دوں تاکہ پتہ چل جائے یہ خواب نہیں، حقیقت ہے۔"

کیلی نے مڑ کر دیکھا اور لپیٹ گیا: "دوسروں کو بھی آواز دو کہ اُوپر آجائیں۔"

یکے بعد دیگرے سارے قیدی باہر نکل آئے۔ آسمان پر چمکتے ہوئے سورج کی تیز دھوپ میں کسی کی آنکھیں پوری نہ کھُلتی تھیں۔

"خُدا کے لئے کچھ مجھے بھی بتاؤ کہ تم نے کیا دیکھا؟" سارجنٹ رائشر خوشی سے بھرّائی ہوئی آواز میں بولا "کیا اڈّا سارے کا سارا برباد ہو گیا ہے؟ کوئی آدمی چلتا پھرتا نظر آتا ہے یا نہیں؟"

"آہ! آدمی تو نظر آتے ہیں۔" کیلی کی آواز سے مایوسی کا اظہار ہوتا تھا۔ "غالباً وہ تمہارے ہی بھائی بند جرمن ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم پھر تمہاری قید میں ہیں۔"

"جرمن ——— خدا کا شکر ہے، میں تو سمجھا تھا کہ اتحادی آن پہنچے ہوں گے جرمن قوم زندہ باد۔" سارجنٹ رائشر جوش میں آکر چلّایا اور پھر تینوں نرسیں اور پانچوں سپاہی جرمن زبان میں ترانہ گانے لگے۔

"بلیچرڈ اور گریز! کیا تم لوگ میری آواز سُن رہے ہو؟ کیلی چپکے سے کہنے لگا۔" میرے قریب آجاؤ، مجھے تو کچھ معاملہ گڑبڑ نظر آتا ہے۔ وہ دیکھو، سامنے سے ایک گاڑی آرہی ہے۔ اُس

پر کچھ فوجی بیٹھے ہیں۔ وہ اِسی طرف آرہے ہیں ——" کیلی کے لبوں پر عجیب سی مُسکراہٹ نمودار ہوئی، جسے کوئی نہ دیکھ سکا۔ پھر وہ ہنس کر بولا:

"میرا خیال غلط تھا —— وہ جرمن نہیں، روسی ہیں۔ میں انہیں بخوبی پہچان سکتا ہوں، بلاشبہ وہ روسی ہیں، لیکن —— تعجب ہے کہ روسی یہاں کیسے اور کیونکر پہنچ گئے۔ وہ بے شک ہمارے اتحادی ہیں، مگر ——" وہ رُکا اور سارجنٹ رائشر کی طرف مڑ کر بولا:

"بہرحال وہ کوئی بھی ہوں، تم اب ہماری قید میں ہو ——" رائشر کا سُتا ہوا چہرہ اور مرجھا گیا۔ لیکن وہ خاموشی سے کھڑا آنے والی گاڑی کو دیکھتا رہا۔

تیز رفتار گاڑی کے ڈرائیور نے اُن کے نزدیک پہنچ کر پوری قوت سے بریک لگائے ٹائر چیخ اُٹھے اور پھر پانچ قوی ہیکل روسی افسروں نے ان کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ ان کی وردیاں میلی اور پھٹی پرانی تھیں اور ہر ایک کی ٹوپی کے درمیان سرخ رنگ کا ستارہ چمک رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں پستول تھے جن کی نالیاں قیدیوں کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔

"ہم امریکن ہیں —— امریکن۔" کیلی نے ہکلاتے ہوئے اپنی اور اپنے دو ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ —— یہ جرمن ہیں —— ہمارے قیدی۔"

سب سے آگے کھڑے ہوئے روسی نے جو غالباً ان کا افسر تھا، کچھ نہ سمجھتے ہوئے کیلی کی ناک پر بائیں ہاتھ کا گھونسہ مارا۔ یہ ضرب اتنی غیر متوقع اور ناقابلِ برداشت تھی کہ بدنصیب کیلی زمین پر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔

آنکھ کھُلی تو اس نے خود کو ایک آرام دہ کمرے میں بستر پر پڑے پایا۔ دائیں بائیں دو بستر اور تھے جن پر بلینچرڈ اور گریز لیٹے تھے، اور سامنے ایک لمبی چوڑی میز پر کوئی روسی فوجی افسر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ کیلی کو ہوش میں آتے دیکھ کر بلینچرڈ اور گریز اُٹھے اور تسلیاں دینے لگے۔ پھر وہ فوجی افسر مُسکراتا ہوا اُس کے پاس آیا اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے انگریزی میں بولا:

"میرا نام کیپٹن گراف گیمازیوف ہے —— مجھے افسوس ہے کہ آپ کو ہماری وجہ سے زحمت برداشت کرنی پڑی۔ دراصل میرا نائب آپ کو پہچان نہیں سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ لوگ بھی جرمن وردیاں پہنے ہوتے تھے۔ بہرحال میں آپ کے اِن دونوں ساتھیوں سے

ساری داستان سُن چکا ہوں، اور آپ کی ہمت اور آپ کے حوصلے کی داد دیتا ہوں۔ مجھے امید ہے اب آپ کی طبیعت بہتر ہو گئی ہو گی۔ برلن جانے کے لئے ہمارا ایک طیارہ تیار کھڑا ہے۔ جلدی سے اپنا سامان درست کر لیجئے۔ برلن ہی میں مناسب پوچھ گچھ کے بعد آپ کو برطانیہ یا امریکہ جانے کی اجازت دی جائے گی۔"

"برلن؟" کیلی نے حیرت سے کہا۔ "کیا برلن روسیوں کے قبضہ میں ہے؟"

"بے شک" روسی افسر نے سینہ فخر سے تان کر کہا۔ "جنگ تو ختم ہو چکی ہے۔ ہم نے آج سے ایک ہفتہ قبل یعنی ۲۱ر اپریل ہی کو برلن پر قبضہ کر لیا تھا۔"

"سارجنٹ رائنشر اور اس کے ساتھ جرمن سپاہی اور نرسیں تھیں، وہ کہاں ہیں؟"

"چلے گئے۔"

"کہاں؟"

"میں سمجھا نہیں، آپ کیا پوچھ رہے ہیں؟"

"جناب، اپنے جرمن قیدیوں کے بارے میں پوچھ رہا ہوں کہ انہیں آپ لوگوں نے کہاں بھیجا ہے؟"

"میں سمجھا نہیں۔" روسی افسر نے پھر یہی الفاظ کہے۔ اور کیلی سمجھ گیا کہ وہ دیدہ دانستہ انجان بن رہا ہے۔ اس موقع پر بلنچرڈ نے مداخلت کی اور کیلی سے کہا:

"میں بتاتا ہوں، روسیوں نے سارجنٹ رائنشر، نرسوں اور سپاہیوں کو ایک کار میں بٹھا کر کہیں اور بھیجا ہے، انہیں مارا پیٹا بھی گیا تھا۔"

یہ سُن کر غصے سے کیلی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے چلا کر روسی افسر سے کہا: "جناب یہ حرکت خلافِ ضابطہ ہے۔ وہ جرمن ہمارے قیدی تھے، سمجھے آپ؟ انہیں کہیں لے جانے اور ان سے باز پرس کا آپ کو کوئی حق نہ تھا۔"

"میں سمجھا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" روسی افسر نے اس انداز میں کہا جیسے وہ کیلی کی زبان سے نکلے ہوئے ان الفاظ کا مفہوم سمجھنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ کیلی سر پکڑے بیٹھا رہا۔ بے چارہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے سر اٹھا کر کہا:

" میں خوب سمجھتا ہوں کہ تم لوگ نہ سمجھنے کی ایکٹنگ کر رہے ہو۔ بہر حال میں اپنی حکومت کی طرف سے مطالبہ کرتا ہوں کہ ان جرمن سپاہیوں اور نرسوں کو میرے حوالے کیا جائے۔"

" روسی کیپٹن شانے اچکا کر رہ گیا۔ اس مرتبہ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ کیلی پھر بولا؛

" مجھے تحریری طور پر یقین دہانی کرائی جائے کہ آپ لوگ ان کے ساتھ کوئی بُرا سلوک نہیں کریں گے۔"

" میں سمجھا نہیں ——" روسی افسر نے کہنا شروع کیا اور اب کیلی کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ وہ دھاڑا۔

" جہنّم میں جاؤ —— اُلّو کا پٹھّا —— گدھا —— کچھ سمجھتا ہی نہیں —— بدمعاش۔"

یہ گالیاں سن کر روسی کیپٹن کے چہرے کا رنگ بدل گیا، لیکن ضبط کر کے سنجیدہ لہجے میں بولا:

" لیفٹننٹ! آپ تاخیر کر رہے ہیں، طیّارہ تھوڑی دیر میں برلن کی طرف پرواز کرنے والا ہے، براہِ کرم تشریف لے جائیے، ورنہ دوسرا طیّارہ نہ معلوم کب روانہ ہو۔"

برلن میں اُن سے پانچ روز تک پوچھ گچھ ہوتی رہی اور آخرکار جب روسی حکّام پوری طرح مطمئن ہو گئے، تو انہیں لندن جانے کی اجازت دے دی گئی اور ان کی بیان کردہ کہانی پوری تفصیل سے نوٹ کر کے ایک فائل میں محفوظ کر دی گئی اور اب یہ کہانی پہلی مرتبہ شائع کی جا رہی ہے۔

لیفٹننٹ جان کیلی آج بھی زندہ ہے۔ گزشتہ برس اس نے اپنی پچاسویں سالگرہ بڑے شاندار پیمانے پر منائی۔ وہ دو بچّوں کا باپ ہے اور فرصت کے اوقات میں انہیں یہ کہانی سناتا رہتا ہے۔ اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد بھی سارجنٹ رائشر اور نرس سگلینڈ کی یاد اس کے دل سے محو نہیں ہو سکی۔ اُس نے ان لوگوں کی تلاش میں بڑا وقت صرف کیا ہے۔ ہزاروں افراد سے پوچھ گچھ کی ہے۔ برطانوی، امریکی اور روسی سیکرٹ سروسوں کی انگنت فائلیں دیکھی ہیں، لیکن رائشر اور اس کے ساتھیوں کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ خدا جانے انہیں زمین نگل گئی یا

آسمان کھا گیا۔ اب بھی وہ کبھی کبھی روسی حکومت سے اُن کے بارے میں خط لکھ کر دریافت کرتا ہے، مگر ہر بار اسے ایک ہی جواب ملتا ہے:

"ہم نے اپنا ریکارڈ نہایت احتیاط سے دیکھا، لیکن افسوس کہ آپ جن جرمن افراد کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے ہیں، ان کے متعلق کوئی بات اس ریکارڈ میں نہیں ہے۔"

تاہم وہ مایوس نہیں۔ اُسے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنے بچھڑے ہوئے "دشمنوں" سے ضرور مل سکے گا۔

کوکینیا سے فرار

جنگی قیدیوں کے ہسپتال کی خستہ، لیکن وسیع عمارت، شہر ایتھنز کے نواح میں بنی ہوئی تھی. جنگ سے پہلے اس عمارت میں لڑکیوں کا سکول قائم تھا. جرمن فوجوں نے جب یونان اور جزیرہ کریٹ پر قبضہ کیا، تو سکول کی عمارت برطانوی، امریکی اور یونانی جنگی قیدیوں کے ہسپتال میں تبدیل کردی گئی. چاروں طرف دوسری کوئی عمارت نہ تھی، البتہ نصف میل دور مشرق کی طرف یونانی مزدوروں کے چند کچے مکان اور جھونپڑیاں پھیلی ہوئی تھیں. جنگی قیدیوں کا بڑا کیمپ کوکینیا کے مقام پر ہسپتال سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر تھا. یہاں آنے والے قیدیوں کو علاج معالجے کے لئے ہسپتال میں بھیجا جاتا اور برطانوی فوجی ڈاکٹر، جرمن افسروں کی نگرانی میں مریضوں کی دیکھ بھال کرتے. ہسپتال میں بیشتر سہولتیں عنقا تھیں، تاہم جرمنوں کا سلوک مریضوں سے برا نہ تھا. قیدیوں کو دانستہ دکھ یا اذیت دینے کی اُنھوں نے کبھی کوشش نہ کی. اُنہیں صرف اپنے ڈسپلن سے غرض تھی اور ڈسپلن توڑنے والے کو کسی صورت میں معاف نہ کیا جاتا، خواہ وہ انگریز یا امریکی قیدی ہو یا کوئی جرمن افسر. قیدیوں کی نگرانی کے انتظامات اتنے کڑے تھے کہ کسی کو خلافِ ضابطہ حرکت کرنے کی جراُت نہ ہوتی تھی. جونہی کوئی مریض ٹھیک ٹھاک ہوتا، اُسے بہ عجلت ہسپتال سے رخصت کرکے قیدیوں کے کیمپ میں منتقل کردیا جاتا تھا.

ہسپتال اور کیمپ دونوں کا انتظام ایک فوجی کرنل سوڈی ٹن زیش کے ہاتھ میں تھا. میں نے اس شخص کو کبھی مسکراتے نہیں دیکھا. لمبا قد، وزنی جسم، نیلے رنگ کی چمکتی ہوئی آنکھیں، سخت ٹھوڑی اور تپلے تپلے بھنچے ہوئے ہونٹوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نہایت جابر اور سنگدل آدمی ہے. اپنے بنائے ہوئے اُصول اور ضابطے اُسے بے حد عزیز تھے. کبھی کبھار کوئی قیدی یا مریض ان ضابطوں کی خلاف ورزی کرتا،

تو کرنل کی حالت دیکھنے کے قابل ہوتی۔ قیدی و مریض تو اُس کے رحم و کرم پر تھے ہی، جرمن افسر اور سپاہی بھی اس کی صُورت دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگتے۔ کرنل کے معائنے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ آدھا رات کو، صبح سویرے، دوپہر کے وقت۔ بارش ہو یا برف باری کا طوفان، جب جی چاہتا وندناتا ہوا کیمپ یا ہسپتال میں آ جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ قیدیوں کی نگرانی کرنے والے جرمن مسلح گارڈ ہمیشہ چاق و چوبند اور ہوشیار رہتے تھے۔

مجھے یاد ہے ایک بار کرنل زلیش، سورج طلوع ہونے سے کچھ دیر پہلے ہسپتال میں آیا۔ صدر دروازے پر پہرہ دینے والا جرمن سنتری کندھے پر بندوق رکھے ٹہل رہا تھا۔ بے چارہ رات بھر کا تھکا ہوا تھا اس لیئے اس کی چال میں وہ چُستی نہ تھی جو ڈیوٹی دیتے وقت ایک محافظ کی چال میں ہونی چاہیئے۔ میں اس وقت اپنی بیرک سے جھانک رہا تھا۔ کرنل زلیش کو دیکھتے ہی سپاہی اٹن شن ہو گیا، مگر کرنل نے اس کے جبڑے پر گھونسا مارا۔ سپاہی تیورا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

کرنل زلیش کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک غیر شادی شدہ ہے اور دُنیا میں اس کا کوئی عزیز اور رشتے دار نہیں۔ وہ اپنی زندگی نازی ازم اور جرمن قوم کی فلاح و بہبود اور برتری کیلئے وقف کر چکا تھا۔ مریضوں کا معاینہ کرتے وقت۔ جب وہ کسی انگریز کو تکلیف سے کراہتے دیکھتا، تو اس کے لب بھنچ جاتے اور نفرت و حقارت سے اس کی بھنویں تن جاتیں۔ انگریزوں سے اتنی بڑھی ہوئی نفرت کی وجہ مجھے کبھی معلوم نہ ہوئی، البتہ یونانیوں کے بارے میں وہ کسی قدر نرم رویہ اختیار کرتا تھا۔ ایک مرتبہ کوئی یونانی قیدی کیمپ سے فرار ہونے کی کوشش میں پکڑا گیا، تو کرنل زلیش نے کڑی سزا دینے کے بجائے اُسے تین دن تک بھُوکا رکھا۔ یونانیوں کے بارے میں اس کی رائے یہ تھی کہ یہ بے چارے لڑنا بھڑنا کیا جانیں انہیں تو خواہ مخواہ جنگ میں گھسیٹ لیا گیا ہے۔

انہی دنوں برطانوی اور امریکی قیدیوں کے علاوہ نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے بہت سے جنگی قیدی بھی اس کیمپ میں منتقل کیئے گئے۔ نئے قیدیوں کی کھیپ نے یہ اثر ڈالا کہ ہمیں جو راشن دیا جاتا تھا وہ اور بھی کم ہو گیا۔ ناشتے میں چائے کا ایک کپ اور باسی روٹی کا ایک ٹکڑا ملنے لگا۔ دوپہر کے کھانے میں وہی روٹی کا ٹکڑا تھوڑے سے پنیر کے ساتھ اور رات کا کھانا بے مزہ شوربے کے پیالے اور ایک روٹی پر مشتمل ہوتا تھا، ہسپتال میں پڑے ہوئے مریضوں کے لیے یہ برائے نام غذا شاید کچھ سہارا بنتی، مگر کیمپ میں رہنے والے

ہٹے کٹے جوانوں کے لیئے اُونٹ کے منہ میں زیرے والی مثال تھی۔

نیوزی لینڈ کے جنگی قیدیوں نے کیمپ اور ہسپتال کی مجروح زندگی میں جان ڈال دی۔ ان لوگوں کو احساس ہی نہ تھا کہ وہ دشمن کی قید میں ہیں۔ گانے بجانے، ننھے رگنے اور اُچھل پھاند کے سوا اُنہیں کچھ نہ آتا تھا۔ اکثر قیدیوں کے پاس عجیب عجیب قسم کے ساز اور ڈھول تاشے بھی تھے۔ رات کے وقت خوب دھما چوکڑی مچاتے، حتیٰ کہ جرمن پہریداروں اور افسروں کی ڈیوٹی میں خلل پڑنے لگا، لیکن قیدیوں نے چونکہ کرنل زیش سے اس اُودھم بازی کی خاص طور پر اجازت لے لی تھی اس لئے کسی کو دم مارنے کا حوصلہ نہ ہوتا۔

شروع شروع میں جرمنوں نے ریڈکراس کی یونانی شاخ کو ہسپتال میں آکر مریضوں کو تحفے تحائف دینے کی اجازت دی تھی، مگر کچھ عرصے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ بعض قیدی ریڈکراس کے ذریعے ایتھنز کی اُن تنظیموں سے رابطہ قائم کیئے ہوئے ہیں جو قیدیوں کو فرار ہونے پر اُکسا رہی ہیں؛ چنانچہ ریڈکراس والوں کا داخلہ ہسپتال میں روک دیا گیا۔ اس سے پہلے قیدیوں کو ہر دس دن بعد اپنے رشتے داروں کو خط لکھنے کی اجازت ملی ہوئی تھی، لیکن بعدازآں یہ رعایت ختم کر دی گئی۔ کیمپ اور ہسپتال میں قیدیوں کی تعداد اندازاً ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ تھی اور ان کی حفاظت کے لئے گنتی کے جرمن گارڈ تھے۔ لیکن قیدیوں پر کرنل زیش کی دہشت اتنی بیٹھی ہوئی تھی کہ کوئی شخص بھاگ نکلنے کا خیال بھی دل میں نہ لاتا تھا۔ دوسری قوموں سے قطع نظر مجھے انگریز قیدیوں کی حالت زار دیکھ دیکھ کر تعجّب اور حیرت ہوتی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی ادنیٰ درجے کا آدمی نہ تھا۔ سب کے سب بَرّی، بحری اور ہوائی فوج کے اُونچے عہدوں سے تعلق رکھتے تھے، مگر سب یوں مطمئن اور آسودہ تھے جیسے جرمنوں کی قید میں نہیں، اپنے اپنے گھروں میں ہیں۔

کیمپ کے بارے میں جب مجھے پتہ چلا کہ ایک ہزار قیدیوں کی نگرانی کے لئے صرف چار جرمن محافظ ہیں، تو یقین کیجیئے خون کھول اُٹھا۔ بھلا ایک ہزار افراد کے سامنے چار مسلّح جرمن کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک ہی ہلّے میں ان چاروں کو ہلاک کر کے آزاد ہو جانا کوئی بڑی بات نہ تھی اور پھر قریبی بندرگاہ تک پہنچ جانا کسی نہ کسی جنگی جہاز پر قبضہ کر لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ مگر ان کاموں کے لئے جس عزم، حوصلے اور منصوبہ بندی کی ضرورت تھی، غالباً وہ ان قیدیوں کے بس کی بات نہ تھی۔

ایتھنز اور اس کی نواحی بستیوں کے یونانی لوگ قیدیوں سے دلی ہمدردی رکھتے تھے اور یہ بھی

یقین تھا کہ اگر ہم لوگ ذرا ہمت کریں اور مسلح گارڈوں سے اسلحہ چھین لیں، تو مقامی آبادی ہماری مدد کو آجائے گی، کیونکہ وہ لوگ بھی جرمنوں کی جا و بے جا سختیوں سے نالاں تھے۔ آخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ آزادی کی خفیہ تحریک شروع کی جائے۔ سب سے پہلے اپنے ہم قوم انگریز ساتھیوں سے اس کا اظہار کیا، تو وہ سوچ میں پڑ گئے اور پھر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ دراصل ہم لوگوں تک جنگ کی جو خبریں پہنچ رہی تھیں، اُن سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ جرمنوں کو ہر محاذ پر فتح نصیب ہو رہی ہے۔ غالباً یہی سبب تھا کہ اتحادی جنگی قیدیوں کے دل بیٹھے ہوئے تھے اور وہ ایسا قدم اُٹھانے سے گریز کر رہے تھے جو جرمنوں کی ناراضی کا باعث ہو سکتا تھا۔

یُوں تو فرار ہونے کے نت نئے منصوبے بنانے کے لئے ہر شخص مستعد اور رضامند تھا، مگر ابتدا کون کرے؟ اس مرحلے پر گاڑی رُک جاتی تھی۔ ہمارے وارڈ میں آسٹریلیا کا فوجی افسر روبن سیوج اور نیوزی لینڈ کا سنکلر، دونوں آدمی کچھ زیادہ ہی جوشیلے اور نڈر تھے۔ نت نئی تدبیریں سوچتے۔ ہم نے فرار ہونے کے جو منصوبے بنائے، وہ یقیناً مضحکہ خیز اور ناقابلِ عمل تھے، مگر اُس زمانے میں زیادہ غور و فکر کرنے کا ہوش ہی کہاں تھا۔ پہلی تجویز یہ تھی کہ فیلرن کی بندرگاہ پر پہنچ کر جرمن نیوی کا کوئی طیارہ چرایا جائے اور اس میں ترکی تک پرواز کی جائے۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ یونان سے ترکی تک کا طویل فاصلہ پیدل چل کر طے کیا جائے۔ اس سفر میں اگرچہ صدہا مشکلات اور مصائب نظر آتے تھے، لیکن جرمن گسٹاپو کی نظروں سے محفوظ رہنے کا امکان بھی تھا۔ ممکن ہے ہم اس تجویز پر عمل شروع کر دیتے، مگر اپنے زخموں کا جائزہ لینے کے بعد یہ تجویز بھی رد کر دی گئی۔ میری دائیں ران میں گولی کا زخم تھا جس کی وجہ سے چلنے میں بڑی دِقّت ہوتی تھی۔ روبن اور سنکلر کے چہرے اور جسم کے دوسرے حصّوں میں کئی گہرے زخم تھے۔ جنہیں ٹھیک ہونے کے لئے کم از کم چھ ہفتے کا عرصہ درکار تھا۔ تیسری تجویز یہ تھی کہ ہسپتال میں ایسی فضا پیدا کی جائے کہ تمام مریض قیدی جرمنوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں، ان کے احکامات کی خلاف ورزی کریں اور اس طرح جب انتشار کی کیفیت نمودار ہو تو فرار ہونے کا منصوبہ بنایا جائے۔

ہمیں خوب معلوم تھا کہ جُوں ہی زخم بھرے ہمیں ہسپتال سے نکال کر کیمپ میں پہنچا دیا جائے گا اور وہاں نگرانی کے انتظامات اتنے سخت ہیں کہ فرار ہونا آسان نہ رہے گا، اس لئے ضروری تھا کہ ہم ہسپتال ہی سے بھاگیں۔ اس دوران میں پتہ چلا کہ ایتھنز میں واقعی ایسی تنظیمیں موجود ہیں جو ہماری نہ صرف مدد کریں گی بلکہ ہمیں کچھ عرصے کے لئے چھپنے کے مواقع بھی فراہم کر سکتی ہیں۔

ہسپتال میں صفائی کا کام کرنے کے لئے روزانہ صبح و شام کیمپ سے قیدیوں کی ایک جماعت آیا کرتی تھی۔ اگرچہ ان لوگوں کی آمد اور رخصت کے دوران میں جرمن نگران سر پر مسلط رہتے تھے لیکن پھر بھی ہم ان سے معلوم کر لیتے تھے کہ کیمپ کے حالات کیا ہیں، وہاں محافظوں کی تعداد کا تناسب کیا ہے اور ایتھنز میں یونانیوں کی وہ کون کونسی جماعتیں ہیں جو مفرور قیدیوں کو پناہ دے سکتی ہیں۔ ایک روز صفائی کے لئے آنے والے قیدیوں میں میجر رائے بھی شامل تھا۔ وہ میرے ساتھ مختلف محاذوں پر جرمنوں سے جنگ لڑ چکا تھا۔ جب وہ برآمدے کی صفائی کرتے ہوئے میرے پلنگ کے نزدیک آیا، تو اُس نے مجھے آنکھ کا اشارہ کیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے، لیکن اُس جرمن سنتری کو ہٹانا ضروری تھا۔ جو سائے کی طرح میجر رائے سے لگا ہوا تھا۔ معاً کروٹ بدلتے ہوئے ایک لرزہ خیز چیخ میرے حلق سے نکلی اور میں مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ میری چیخ سُن کر اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے مریض جمع ہونے لگے۔ اور ہر شخص اونچی آواز سے پوچھنے لگا کہ کیا ہوا۔ چند لمحوں کے اندر "وارڈ" میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا جرمن سنتری سخت بدحواس تھے اور مریضوں کو دھکے دے دے کر پرے ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ موقع پا کر میجر رائے میرے قریب آیا اور چپکے سے بولا۔

"اس عمارت سے ڈیڑھ میل دُور مغرب کی طرف سُرخ چھت والا ایک دو منزلہ مکان ہے... سُرخ چھت یاد رکھو —— کسی طرح اس مکان تک پہنچنے کی کوشش کرو —— ہم –" وہ یہیں تک کہنے پایا تھا کہ کرنل زیش کی کرخت آواز کچھ فاصلے پر گونجی اور پھر میرے پلنگ کے گرد جمع ہونے والے قیدیوں کا ہجوم کائی کی طرح پھٹ گیا۔ کرنل میرے قریب آن کھڑا ہوا۔ اس نے میری طرف گھورتے ہوئے کہا:

"کیا تکلیف ہے؟ اتنا شور کیوں مچا رہے ہو؟"

میں نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا: "درد ہو رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی پھر ایک چیخ میرے حلق سے نکل گئی۔ کرنل زیش نے پیچھے کھڑے ہوئے ایک جرمن افسر کو حکم دیا: "ڈاکٹر کو بلاؤ۔" چند لمحے بعد ایک جرمن ڈاکٹر نہایت توجہ سے میرا معائنہ کر رہا تھا۔

شام کو میں نے اپنے ساتھیوں سے میجر رائے کی دی ہوئی خبر کا ذکر کیا۔ روبن کا کہنا تھا کہ سُرخ چھت والے مکان کے بارے میں وہ پہلے بھی کئی افواہیں سُن چکا تھا اور عین ممکن ہے یہ افواہیں

جرمنوں نے اڑائی ہوں تاکہ فرار کا ارادہ رکھنے والے قیدیوں کا ردِعمل معلوم کیا جاسکے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مکان گسٹاپو کا مرکز ہو ــــــــ ہمیں یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ہسپتال میں کچھ مریض ایسے بھی ہیں جن کا تعلق جرمن گسٹاپو سے ہے اور جو بے داغ لہجے میں انگریزی بولنے پر قادر ہیں۔ ان جاسوسوں کو مریضوں میں چھوڑنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ جنگی قیدیوں کی خفیہ سرگرمیوں اور پروگراموں کا کرنل زیش کو باقاعدہ علم ہوتا رہے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ لوگ ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے خوف کھاتے تھے۔

ایک روز دوپہر کے وقت کرنل زیش نے تمام مریضوں کو ہسپتال کے وسیع کمپاؤنڈ میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے سب حیران تھے کہ خدا معلوم اب کونسی افتاد پڑنے والی ہے۔ کرنل زیش ایک میز پر کھڑا تھا غصّے سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور اس کے پیچھے اٹن شن کھڑے ہوئے پانچ فوجی افسروں کے چہرے اُترے ہوئے تھے۔ کمپاؤنڈ کے مختلف کونوں میں پانچ جرمن سپاہی مشین گنیں نصب کئے مستعد تھے۔ یہ صُورتِ حال خاصی نازک اور اہم تھی۔ کرنل نے جرمن نما انگریزی میں تقریر کا آغاز کیا:

"جنگی قیدیو، تم کو آج یہاں پہلی اور آخری مرتبہ جمع کیا گیا ہے۔ یہ بتانے کے لئے کہ کیمپ اور ہسپتال کا جو ڈسپلن ہم نے قائم کیا ہے اُسے توڑنے کی کوشش بے کار ہے، چونکہ تم لوگ اپنی اپنی فوج کی ہائی کمان سے تعلق رکھتے ہو۔ اس لئے فیوہرر (ہٹلر) کے حکم کے مطابق تم پر زیادہ سختی نہیں کی گئی لیکن اس کا غلط مطلب نہ سمجھو اور ہماری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھانے کے منصوبے نہ باندھو۔ میں تم کو بتانا چاہتا ہوں کہ کل نیوزی لینڈ کے دو قیدیوں نے یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی ہے، مگر ہم نے بہت جلد اُنہیں چوہوں کی طرح پکڑ لیا اور وہ دونوں اب دس دن تک قیدِ تنہائی میں رکھے جائیں گے اور اُنہیں صبح کا ناشتہ نہیں ملے گا۔ یاد رکھو ہماری نگاہوں سے بچ کر کوئی شخص بھاگ نہیں سکتا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اُنہیں ایتھنز کے یونانی دستوں سے مدد مل سکتی ہے۔ یہ اُن کا خیالِ خام ہے۔ بہرحال ــــــــ میں زیادہ لمبی تقریر کرنے کا عادی نہیں، اس واقعے کے بعد مجھے فیوہرر کی جانب سے بھاگنے والے قیدیوں کو سزا دینے کے نئے احکامات موصول ہوئے ہیں اور یہ کہ آئندہ کوئی شخص ایسی حرکت کرتے ہوئے پایا گیا تو اُسے بے دریغ گولی سے اُڑا دیا جائیگا۔"

ہیل ہٹلر ——

کرنل زیش تقریر ختم کرکے نیچے اُتر آیا اور قیدیوں کے کمانڈر میکس ویل کو حکم دیا کہ وہ قیدیوں کو اپنے اپنے وارڈوں میں جانے کی ہدایت کرے۔ میکس ویل نے بلند آواز سے زیش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"کرنل میں —— میں جنگی قیدیوں کے کمانڈر کی حیثیت سے آپ کی اس تقریر کے خلاف احتجاج کرتا ہوں۔ ہم میں سے ہر شخص کو آزادی حاصل کرنے کا حق حاصل ہے اور یہ حق ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا —— کیا آپ سمجھتے ہیں کہ گولی سے اُڑا دینے کی دھمکی ہم پر کارگر ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں —— آپ کو یہ حکم واپس لینا ہوگا۔ ورنہ ہم ریڈ کراس کے ذریعے اس ظلم کی آواز دُنیا بھر میں پہنچا دیں گے۔"

قیدیوں نے فلک شگاف نعروں سے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ کرنل زیش کی تقریر سے ہر شخص کو سانپ سونگھ گیا تھا، مگر میکس ویل کے الفاظ نے ان کے اندر جوش و خروش کی زبردست لہر دوڑا دی۔ کرنل زیش کا تمتایا ہوا چہرہ سیاہ پڑ گیا، لیکن صورتِ حال بگڑتے دیکھ کر ضبط کیا اور آہستہ سے بولا:

"اگر تم ڈسپلن کی پابندی کا وعدہ کرو تو میں فیوہرر کو حکم واپس لینے کی تجویز بھیجوں گا۔"

"کون سا ڈسپلن؟" میکس ویل نے کہا۔ "ہم آپ کے ڈسپلن کے پابند نہیں اور نہ آپ ہمیں اپنے اُلٹے سیدھے احکام کی پابندی پر مجبور کر سکتے ہیں۔ جب ہم سمجھیں گے کہ بین الاقوامی جنگی اصولوں کے مطابق آپ ہمیں وہ تمام سہولتیں اور رعایتیں مہیا کر رہے ہیں جو جنیوا کنونشن میں تسلیم کی گئی ہیں، تو ہم بخوشی اُن کی پابندی کریں گے۔"

اور یہ کہتے ہی میکس ویل نے قیدیوں کو "ڈس مس" ہو جانے کا حکم دے دیا۔ قیدی، جرمنوں اور ہٹلر کے خلاف اونچی آواز میں نعرے لگاتے ہوئے اپنی بیرکوں میں واپس چلے گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس صورتِ حال نے کرنل زیش اور دوسرے جرمن افسروں کو سخت بدحواس کر دیا ہے اور وہ ہسپتال کے چاروں طرف نصب کی گئی مشین گنوں پر بیٹھے ہوئے سپاہیوں کو ہوشیار رہنے کی ہدایات کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ کرنل زیش کی تقریر نے قیدیوں پر اُلٹا اثر کیا۔ اس سے پہلے ہم لوگ ہسپتال کے نام نہاد ڈسپلن کی بُری بھلی پابندی کر رہے تھے، لیکن اب تو کُھلم کُھلا بغاوت کرنے کا موقع مل گیا۔

نیوزی لینڈ کے ان دو نوجوانوں نے فرار ہونے کی انوکھی تدبیر سوچی تھی، لیکن قسمت نے ساتھ نہ دیا اور بے چارے عین اس وقت پکڑے گئے جب لب بام دو چار ہاتھ رہ گیا تھا۔ ہسپتال میں مریضوں کے کپڑے وغیرہ دھونے کا کوئی انتظام نہ تھا، اس لئے ایتھنز کی کسی لانڈری سے کپڑے دھلوائے جاتے تھے۔ ہسپتال کے ایک کمرے میں میلے کپڑوں کا انبار لگتا رہتا اور ایک ہفتے بعد جرمن سپاہی کپڑوں کی بہت سی گٹھڑیاں ٹرک میں بھرتے اور لانڈری میں چھوڑ آتے۔ نیوزی لینڈ کے یہ دو جوان ہفتے کے آخری روز صبح سویرے اُس کمرے میں پہنچے اور اپنے آپ کو چادروں کے اندر لپیٹ لیا اور مقررہ وقت پر جرمن سپاہی کپڑوں کی گٹھڑیاں اٹھا لائے، لیکن ٹرک خراب ہو گیا، اس لئے انہوں نے ٹرک ٹھیک ہونے تک گٹھڑیاں دھوپ میں ڈال دیں۔ چادروں میں لپٹے یہ نوجوان دھوپ میں پڑے تپتے رہے، لیکن اُف نہ کی۔ آخر ٹرک ٹھیک ہوا اور گٹھڑیاں لاد کر ایتھنز روانہ ہو گیا۔ دو گھنٹے تک دھوپ میں پڑے رہنے کے باعث فرار ہونے والے یہ جوان وقت کا صحیح اندازہ نہ کر پائے اور عین اُس وقت ٹرک سے باہر چھلانگیں لگا دیں۔ جب وہ اطالوی سپاہیوں کی بیرکوں کے قریب سے گزر رہا تھا۔ فوراً ہی انہیں پکڑ لیا گیا اور اتنی پٹائی ہوئی کہ بیان سے باہر اور اب یہ بدنصیب دس دن کی قید تنہائی بھگت رہے ہیں۔

ہسپتال کے چاروں طرف بارہ فٹ اونچی خاردار تار کی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ یہ تار اس طرح لگائی گئی تھی کہ کوئی شخص آسانی سے نہ نکل سکتا تھا۔ اس کے علاوہ کھلے کمپاؤنڈ میں پچاس پچاس فٹ کے فاصلے پر لکڑی کے چار واچ ٹاور بھی بنائے گئے تھے جن پر دن رات مسلح جرمن فوجی پہرہ دیتے تھے اور رات کے اندھیرے میں معمولی معمولی وقفوں کے بعد تیز سرچ لائٹ کی مدد سے ہسپتال کے ایک ایک گوشے کا معائنہ کرتے تھے۔ کرنل زیلش کی تقریر والے دن جب میکس ویل نے احکامات کی پابندی نہ کرنے کا اعلان کیا، تو مسلح گارڈوں کی تعداد بڑھانے کے ساتھ ساتھ خاردار تار کی ایک اور باڑھ بھی نصب کر دی گئی اور مشین گنوں کی تعداد بھی چار سے بڑھا کر چھ تک پہنچ گئی۔ اس کے علاوہ ہر تیسرے چوتھے دن وارڈوں اور مریضوں کی تلاشی لینے کا دستور ہو گیا۔

کرنل زیلش کو خدشہ تھا کہ قیدی خطرناک ارادے رکھتے ہیں، اس لئے ان پر جتنی سختی کی جائے تھوڑی ہے۔ اس نے بہت سے مریضوں کو، جو واقعی زخمی تھے اور جنہیں کچھ دن اور ہسپتال میں

رہنا چاہیئے تھا، جبراً صحت مند قرار دے کر کیمپ میں بھجوا دیا، کیونکہ ہم نے سنا تھا کہ کیمپ کی نگرانی کے لئے ایک نیا کمانڈر آنے والا ہے اور کرنل زیش کوشش میں ہے کہ نیا کمانڈر ہی یہ تمام مصیبتیں بھگتے۔ قیدیوں کو پہلے سگریٹ پینے کی اجازت تھی، مگر اب سگریٹ کی سختی سے ممانعت کی گئی مگر ہم نے اس حکم کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی اور اب ہر وہ شخص جو سگریٹ کا عادی نہ تھا سگریٹ پیتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ کرنل زیش کی آمد کے وقت تو وارڈوں اور کمروں میں اتنی کثرت سے تمباکو نوشی ہوتی کہ ہر طرف دھواں ہی دھواں نظر آتا۔

کرنل زیش سب کچھ دیکھتا اور تلملا کر رہ جاتا۔ آخر اس نے مریضوں کو تنگ کرنے کی ایک تدبیر سوچی۔ خواہ مخواہ ہر ایک کی پٹیاں کھلوا کر زخم دیکھتا اور ہسپتال سے خارج کر کے کیمپ میں بھجوانے کا حکم صادر کر دیتا۔ اس نے بیس پچیس آدمیوں کو اسی طرح زبردستی کیمپ میں بھجوایا، حالانکہ ان میں سے اکثر ایسے تھے جن کے زخم خطرناک حالت میں تھے۔ کرنل کا کہنا تھا کہ یہ لوگ بدمعاشی کرتے ہیں اور جان بوجھ کر ہسپتال میں پڑے ہوئے ہیں۔ ایک رات میرے قریب پڑے ہوئے ایک آسٹریلین قیدی کا معائنہ کرتے ہوئے اس نے زخم اس زور سے دبایا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔ کرنل کی اس حرکت پر آسٹریلین قیدی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ آدمی ہٹا کٹا تھا، سوچے سمجھے بغیر اس نے کرنل کے جبڑے پر اس زور سے گھونسا رسید کیا کہ وہ الٹ کر گرا اور خون تھوکنے لگا۔ کرنل کے ساتھ آئے ہوئے جرمن ڈاکٹر نے اسے سنبھالا۔

اردگرد پڑے ہوئے قیدی سہمی ہوئی نظروں سے کرنل کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ آسٹریلین نے گھونسا مار کر حماقت کی ہے اور اب یہ شخص نہ صرف خود مصیبت میں مبتلا ہو گا، بلکہ دوسروں کو بھی آزمائش سے گزرنا پڑے گا۔ کرنل نے رومال سے اپنا چہرہ صاف کر کے آسٹریلین کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کے بھنچے ہوئے لبوں پر ایک عجیب سا تبسم نمودار ہوا۔ اس نے جرمن زبان میں ڈاکٹر سے کچھ کہا، آسٹریلین سے معذرت طلب کی اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

کرنل زیش اگرچہ جرمن تھا اور ہمارا دشمن، لیکن اس کے کردار کی بلندی کا نمونہ ہمارے لئے باعثِ حیرت تھا۔ اس کے جانے کے بعد جرمن ڈاکٹر نے آسٹریلین قیدی کی اچھی طرح مرہم پٹی کی اور خلافِ معمول

اُسے دُودھ پلانے کا حکم بھی دیا۔ اُس نے بتایا کہ کرنل اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہے اور چاہتا ہے کہ ہم لوگ اس حادثے کو فراموش کر دیں۔

ممکن ہے یہ حادثہ فراموش ہو جاتا مگر اگلے ہی روز ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں، گسٹاپو پولیس نے اپنے آدمی مریضوں کے بھیس میں جنگی قیدیوں کے اندر چھوڑ رکھے تھے۔ یہ جعلی مریض ذرا ذرا سی خبر اپنے افسرِ اعلیٰ تک پہنچایا کرتے؛ چنانچہ روبن اور سنکلر ان لوگوں کی تلاش میں تھے، لیکن کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ وہ کون ہیں۔ اُنہوں نے کئی آدمیوں پر شبہہ کیا، مگر وہ گسٹاپو کے آدمی نہ نکلے۔

دوپہر کے وقت قیدیوں کو روٹی تقسیم کی جا رہی تھی اور تقسیم کرنے والا جرمن سنتری تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ قطار میں کھڑے ہوئے پانچویں آدمی کی طرف بار بار معنی خیز انداز میں دیکھتا ہے۔ مجھے شک ہو گیا۔ قطار میں کھڑا ہوا پانچواں آدمی اگرچہ ہمارے لئے اجنبی تھا، کیونکہ اس سے بات کرنے کا موقع نہ ملا تھا لیکن اتنا معلوم تھا کہ وہ یونانی ہے۔ میں نے اپنے حصے کی روٹی لینے کے بعد روبن اور سنکلر کو اس شخص کے بارے میں بتایا اور پھر ہم اس کی نگرانی کرنے لگے۔ جرمن سنتری جب روٹی بانٹ چکا، تو سٹور رُوم کی طرف چلا اور چند لمحے بعد وہ پُراسرار یونانی جس کی دونوں ٹانگوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور بیساکھی کے سہارے چلتا تھا، آہستہ آہستہ سٹور رُوم کی طرف بڑھنے لگا۔ اس وقت سب قیدی اپنی اپنی روٹی کھانے اور باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ کسی نے یونانی لنگڑے کی طرف دھیان نہ دیا، لیکن ہم کن انکھیوں سے اُسے دیکھتے رہے۔ وہ دونوں آگے پیچھے سٹور رُوم میں داخل ہو گئے۔ روبن نے بھی وہاں داخل ہونے کا ارادہ ظاہر کیا، لیکن میں نے اُسے روک دیا۔ چند منٹ بعد جرمن سنتری سٹور رُوم سے نکلا اور ایک طرف چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی ہم تینوں دوست سٹور رُوم میں داخل ہو گئے۔ لنگڑا یونانی باہر آنے کے لئے دروازے سے نکل رہا تھا۔ کہ روبن نے اُسے کمرے میں دھکیل دیا۔ اور ہمیں اندر داخل کر کے دروازہ بند کر دیا۔

"کیا بات ہے؟ آپ لوگ گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟" یونانی نے حیرت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں، سب ٹھیک ٹھاک ہے۔" روبن نے سخت لہجے میں کہا۔ "مہربانی کر کے ہمیں یہ پٹیاں کھولنے کی اجازت دے دو۔"

اس نے لنگڑے کی ٹانگوں پر بندھی ہوئی پٹیوں کی طرف اشارہ کیا اور میں نے دیکھا کہ یہ سنتے ہی اس کا رنگ اُڑ گیا۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"مگر..... مگر..... یہ آپ کو ہوا کیا ہے؟ میرے زخم کھل کر خراب ہو جائیں گے۔ کیا آپ میں سے کوئی صاحب ڈاکٹر بھی ہیں؟"

"میں ڈاکٹر ہوں۔" سنکلر نے آگے بڑھ کر کہا۔ "اب زیادہ باتیں نہ بناؤ اور پٹیاں کھول کر زخم دیکھنے دو۔ تم اتنے دن سے ہسپتال میں ہو اور تمہارے زخم ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئے"

لنگڑے یونانی کے چہرے پر ایک رنگ آتا، ایک جاتا۔ بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے راہِ فرار تلاش کر رہا ہے اور اس سے پہلے کہ وہ باہر نکلنے کے لئے اپنے خطرناک ارادے کو عمل میں لائے، روبن نے جھپٹ کر اپنی آہنی انگلیوں سے اُس کا گلا دبا لیا۔ ہم نے بہت جلد یونانی کو فرش پر گرا کر اُس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تاکہ چلانے نہ پائے۔ سنکلر نے اس دوران میں اس کی پٹیاں کھول ڈالیں۔ اس کی ٹانگیں صحیح سلامت تھیں اور اُن پر زخم کا ہلکا سا نشان بھی نہ تھا۔

"کیوں بے سچ سچ بتا، یہ کیا بدمعاشی ہے؟" روبن غنڈہ پن پر اُتر آیا۔ "ہمیں پہلے ہی معلوم تھا کہ تو گسٹاپو سے ملا ہوا ہے۔ اب بول تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔؟"

"میرا خیال ہے کہ باقی لوگوں کو بھی خبر کر دیں۔" میں نے کہا۔ "تاکہ سب کی رائے کے مطابق کام کیا جائے۔"

"ابھی سب سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔" سنکلر نے دانت پیس کر کہا۔ "اس کا یہیں کام تمام کر کے لاش ہسپتال کے پچھواڑے گڑھے میں پھینک دو۔"

لنگڑے یونانی نے ہاتھ پیر مار کر روبن اور سنکلر کی گرفت سے آزاد ہونے کی سر توڑ کوشش کی، مگر ہم تین آدمیوں کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ گئی، بلکہ روبن نے گھونسے اور تھپڑ مار مار کر اس کا مزاج اچھی طرح درست کر دیا۔ حتیٰ کہ اس پر غشی طاری ہونے لگی۔

"دیر نہ کرو۔" میں نے کہا۔ "اوروں کو بھی خبر کر دو۔"

"ہاں، ٹھیک ہے۔" روبن بولا اور اس کا اشارہ پاتے ہی میں نے سٹور کا دروازہ کھولا۔ اور باہر نکل آیا۔ اتفاق کی بات کہ سامنے ہی کمانڈر میکس ویل کھڑا ایک برطانوی ڈاکٹر سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اُسے مختصر الفاظ میں سارا قصہ سنایا اور پھر آہستہ آہستہ یہ خبر بہت سے قیدیوں کو معلوم ہو گئی۔ سٹور کے سامنے ہجوم ہونے لگا۔ ہر شخص گسٹاپو کا جاسوس دیکھنے کے لئے بے قرار تھا، ہم

اُسے گھسیٹ کر اندرونی کمرے میں لے گئے اور سب کو دکھایا کہ کس طرح اس شخص نے اپنی صحیح سلامت ٹانگوں پر پٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ یکایک اس بدنصیب پر گھونسوں، مُکوں، تھپڑوں اور لاتوں کی بارش ہونے لگی۔ قیدیوں نے مار مار کر اُس کا حُلیہ بگاڑ دیا۔ اب وہ بلاشبہ زخمی ہو چکا تھا۔ روبن نے اس کی ٹانگوں پر پٹیاں باندھتے ہوئے کہا:

"اب تم صحیح معنوں میں ان پٹیوں کے مستحق ہو۔ جاؤ جا کر اپنے آقاؤں کو خبر کر دو کہ تمہارا کیا حشر ہوا ہے۔"

اس کے بعد ہم نے دوبارہ اس شخص کو ہسپتال میں نہیں دیکھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ گشٹاپو والے اپنے آدمی کی یہ حالت دیکھ کر آگ بگولا ہو گئے۔ عجب نہیں کہ ہم پر مزید ظلم و ستم توڑے جائیں اور یقیناً وہ کرنل زینش کو بھی اس واقعے سے آگاہ کریں گے، مگر کئی روز گزر گئے۔ کسی نے ہم سے اس حادثے پر بازپُرس نہ کی۔

ریڈ کراس کے آدمیوں کو ہسپتال میں آنے سے روکنے، تفریحی پارٹیوں کو مریضوں کا دل بہلانے کی اجازت نہ دینے اور رشتے داروں سے قیدیوں کی خط و کتابت پر پابندی کے خلاف ہم نے احتجاج کی یہ صُورت نکالی کہ ترکاریوں خصوصاً ٹماٹروں کے چھلکے اور چھوٹے چھوٹے پتھر رات کی تاریکی میں ڈیوٹی دینے والے جرمن پہرے داروں کے سروں پر مارتے اور ہسپتال کی دیواروں پر کوئلے یا چونے سے جرمنوں کے خلاف فحش گالیاں اور نعرے لکھے جانے لگے۔ کچھ لوگوں نے جرمن سپاہیوں کی سائیکلوں میں پنکچر کرنے کا کام خوش اسلوبی سے ادا کرنا اپنے ذمّے لے لیا اور پھر ایسے گانے بھی ایجاد کر لئے گئے جنہیں کورس میں گایا جاتا اور جنہیں سُن کر جرمنوں کا خوُن کھول اٹھتا، لیکن وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ اُن دنوں ایک گانا خاصا دلچسپ تھا جس کا ابتدائی مصرع یہ تھا:

بھاگ رے ہٹلر بھاگ۔

بھاگ رے اوڈلف بھاگ (اوڈلف، ہٹلر کے نام کا پہلا حصّہ ہے۔)

رات کو اتنا ہنگامہ مچتا کہ خدا کی پناہ ——— تالیوں کی تال پر جب ہم بار بار انہی دو مصرعوں کو دُہراتے، تو غصّے سے جرمن سنتریوں کی حالت غیر ہو جاتی اور وہ ہمیں ڈرانے کے لئے ہوائی فائر شروع کر دیتے۔ شروع شروع میں اُن کی یہ تدبیر خاصی کارگر ثابت ہوئی، مگر بعد میں ہم

اس کی پروا بھی نہ کرتے، حالانکہ ہم سنجیدگی سے غور کرتے تو پتا چلتا کہ حرکتیں خود ہمارے لئے نقصان دہ تھیں۔

کرنل زینش ایسے آدمیوں کو چھانٹ چھانٹ کر کیمپ میں منتقل کر رہا تھا جن کے بارے میں اُسے رپورٹ ملتی کہ وہ دوسرے قیدیوں کو بھڑکا رہے ہیں یا نت نئی شرارتیں کرنے میں وہ سب سے آگے ہیں، خصوصاً وہ روبن، سنکلر اور مجھے کڑی نظروں سے دیکھتا۔ کرنل زینش کو دیکھتے ہی سیلوٹ کرنا ہر قیدی کا فرض تھا اور ایسا نہ کرنے کی سزا تین دن کی قیدِ تنہائی تھی ——— ہم لوگ سیلوٹ تو کرتے، لیکن مضحکہ خیز انداز میں۔ ایک مرتبہ روبن نے اُسے سیلوٹ کرتے ہوئے ایسا منہ بنایا کہ کرنل زینش کے پیچھے چلتے ہوئے ایک جرمن سپاہی کی بے اختیار ہنسی نکل گئی۔ اس توہین پر کرنل نے سپاہی کے ساتھ کیا سلوک کیا، ہمیں صرف اتنا پتا چلا کہ تین دن تک بے چارہ اپنی ہڈیوں کی سنکائی کرتا رہا۔

اگست کے شروع میں میری ران کا زخم اس حد تک درست ہو گیا کہ میں سہارے کے بغیر چلنے پھرنے لگا، مگر اس خوف سے کہ کرنل مجھے فوراً ہسپتال سے روانہ کر دے گا، بدستور بیساکھی بغلوں میں دیئے پھرتا رہا۔ ہسپتال میں اگرچہ کھانے کو کچھ نہ ملتا تھا، لیکن محنت مشقت سے نجات ملی ہوئی تھی جبکہ کیمپ کے قیدیوں کو کھانا بھی ہم جیسا ملتا اور اُن سے چھ گھنٹے مشقت بھی لی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ پہرے اور نگرانی کے انتظامات اتنے سخت تھے کہ فرار ہونا محال تھا۔

ایک روز روبن نے مجھے بتایا کہ وہ ہسپتال سے باہر ایک ایسے یونانی سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے جو ہمیں فرار ہونے کے بعد پناہ دینے کے لئے تیار ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ ہم وہ رقم اس کے حوالے کر دیں جو ہمیں بطور قید الاؤنس نازی حکومت کی طرف سے دی جاتی ہے۔
ہم تینوں نے رقم کینٹین میں خرچ کرنے کے بجائے لوکل کرنسی میں تبدیل کرا لی تھی۔ کیونکہ اس کی اجازت جرمنوں سے ملی ہوئی تھی۔ بعض قیدی اپنی اشیائے ضرورت جرمن سپاہیوں کو معمولی رشوت دے کر ایتھنز سے منگوایا کرتے تھے۔ روبن کا کہنا تھا کہ اگر ہم اس شخص کو رقم بھجوا دیں، تو وہ یقیناً ہماری رہائی کی صورت نکالے گا۔ اس تجویز پر غور کرنے کا وعدہ کیا اور پھر باہر کمپاؤنڈ میں ٹہلنے کے ارادے سے نکلا ہی تھا کہ سامنے سے کرنل زینش اپنے بھاری جوتوں سے کھٹ کھٹ کرتا ہوا آن پہنچا۔ میں اُس

وقت روبن کی تجویز پر غور کرنے میں اس قدر محو تھا کہ کرنل کو سلیوٹ کرنا بھول گیا اور ہوش اس وقت آیا جب کرنل کا حکم پلٹتے ہی ایک جرمن سارجنٹ نے میری پشت پر اس زور سے لات ماری کہ میں لڑھکتا ہوا کئی گز دور جا گرا۔

"اس بدمعاش کو اٹھا کر ذرا میرے کمرے میں لے آؤ"، کرنل کی آواز میرے کانوں میں گونجی اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے ڈنڈا ڈولی کر کے لے جایا جا رہا ہے۔ ہوش آیا، تو میں ایک تاریک کوٹھڑی میں بند تھا اور قیدیوں کے چیخنے چلانے اور مشین گنوں کے چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے ہلنے جلنے کی کوشش کی، میرا جوڑ جوڑ فریاد کرنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خوب مرمت کرنے کے بعد مجھے یہاں پھینک دیا گیا ہے۔ بڑی مشکل سے میں حرکت کرنے کے قابل ہوا۔ تاریکی اس قدر تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ٹٹول ٹٹول کر کوٹھڑی کا معائنہ کیا معلوم ہوا کہ مجھے ان زمین دوز کوٹھڑیوں میں سے کسی ایک میں پھینک دیا گیا ہے جو جنگ کے بعد جرمنوں نے خاص خاص قیدیوں کو الگ تھلگ رکھنے کے لئے بنائی تھیں۔ یہاں چھ فٹ اونچی ایک چھوٹی سی کھڑکی کے سوا کچھ نہ تھا جس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور اسی راستے سے ہوا بھی آتی تھی۔ کوٹھڑی کے پانچ فٹ لمبے اور تین فٹ چوڑے فرش پر خشک گھاس بچھی ہوئی تھی۔ میں ایک گوشے میں سکڑ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ تین دن یہاں رکھنے کے بعد کرنل زیش مجھے یقیناً کیمپ میں بھیج دے گا اور فرار کی تمام راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ ہسپتال میں گانے بجانے والے قیدیوں کی آوازیں اور نعرے مدھم ہوتے ہوتے غائب ہو گئے اور ہر طرف گہرا سناٹا چھا گیا۔ جسے جرمن پہرے داروں کے بھاری جوتوں کی آوازیں کبھی کبھی توڑ دیتیں۔ پندرہ پندرہ منٹ بعد سرچ لائٹیں کمپاؤنڈ میں گھومتی ہوئی نکل جاتیں۔ مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی کچھ دیر بعد کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے آسمان پر بادل گرج رہے ہیں اور موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ بارش کے ساتھ ہوا کا زبردست طوفان بھی امڈ آیا جس کا شور بے پناہ تھا۔ کھلی ہوئی کھڑکی میں سے ہوا اور بارش کا پانی فراٹے بھرتا ہوا داخل ہو رہا تھا لیکن میں بھیگنے پر مجبور تھا۔ بجلی کی کڑک چمک دم بدم بڑھتی جا رہی تھی۔ یک لخت مشین گنوں کے چلنے کی آواز بھی اس شور میں شامل ہو گئی۔ پھر میں نے جرمن پہرے داروں

کے بھاگنے دوڑنے اور چیخنے کی آوازیں سُنیں۔ میں نے جلدی سے گھاس کا ڈھیر کھڑکی کے نیچے جمع کیا اور اس کے اُوپر کھڑا ہو کر باہر جھانکنے لگا۔ مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آیا ہسپتال کے قیدیوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر بغاوت کر دی تھی اور وہ وارڈوں سے نکل کر جرمن محافظوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کچھ لوگوں کو میں نے تاروں کی باڑیں پھلانگتے ہوئے دیکھا۔ مشین گنوں کی مسلسل فائرنگ، قیدیوں کے پُرجوش نعرے، جرمن محافظوں کی چیخیں اور طوفان کے شور نے مل جل کر عجب قیامت برپا کر دی تھی۔ کئی قیدی باڑ پر چڑھنے کی کوشش میں گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے۔ اور ان کی لاشیں تاروں میں اٹکی ہوئی جھول رہی تھیں بعض زمین پر بھی پڑے تھے۔ جرمن مشین گنوں نے قیدیوں کو بھون کے رکھ دیا تھا۔ مجھے اپنے دوستوں روبن سنکلر اور میکس ویل کا خیال آیا۔ ممکن ہے وہ فرار ہو گئے ہوں، لیکن ——— گولیوں کی اس ہولناک بارش میں ان کے جسم چھلنی بھی تو ہو سکتے ہیں، پھر میں نے کمانڈر زینش کی للکار سُنی، وہ واچ ٹاور پر پہنچ کر لاؤڈ سپیکر کی مدد سے چلّا رہا تھا۔

"میں تمام قیدیوں کو حکم دیتا ہوں کہ وہ اپنی اپنی بارکوں میں چلے جائیں، ورنہ اُن کا وہی حشر ہوگا جو سامنے تاروں پر لٹکنے والوں کا ہو رہا ہے ——— یہاں سے بھاگ نکلنے میں کوئی شخص کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ہمارے آدمی ایتھنز اور کریٹ کے چپے چپے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بھاگنے والوں کو بہت جلد یہیں آنا پڑے گا ——— واپس چلے آؤ ——— واپس ——— میں صرف دو منٹ کی مہلت دیتا ہوں ——— اس کے بعد مزید آٹھ مشین گنیں تمہارے استقبال کے لئے یہاں پہنچ چکی ہوں گی۔"

اُس نے آخری جملہ ادا کیا ہی تھا کہ کمپاؤنڈ کے باہر گاڑیوں اور بھاری ٹرکوں کے آنے کا شور سنائی دیا اور پھر بے شمار جرمن سپاہی سنگینیں چڑھی ہوئی بندوقیں تھامے دوڑتے ہوئے آئے اور چند لمحوں کے اندر اندر انہوں نے کمپاؤنڈ میں جمع ہونے والے قیدیوں کو گھیرے میں لے لیا۔

تیسرے دن مجھے قیدِ تنہائی سے نکال کر کرنل زینش کے سامنے پیش کیا گیا۔

"بیٹھ جاؤ۔" اُس نے خلافِ توقع نرم آواز میں میز کے سامنے پڑی ہوئی کرسی کی طرف

اشارہ کیا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرنل کا چہرہ پہلے کی نسبت زرد تھا اور آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ کئی راتوں سے نہیں سویا۔ کچھ دیر اپنے آگے رکھے ہوئے کاغذات کا جائزہ لینے کے بعد کہنے لگا:

"کیا تم کمانڈر میکس ویل کی جگہ لینے کو تیار ہو؟"

یہ سوال میرے لئے غیر متوقع تھا۔ میں حیرت سے اس کی طرف تکنے لگا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" میں نے کہا۔ "کمانڈر میکس ویل کو آپ نے کیمپ بھیج دیا ہے۔"

کرنل زیش میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چند لمحے گھورتا رہا، پھر بے پروائی سے بولا:

"میکس ویل کا وہی حشر ہوا جس کی مجھے توقع تھی۔ اس نے قیدیوں کو بھاگنے پر اکسایا، نتیجہ یہ کہ خود بھی مارا گیا اور تیرہ دوسرے آدمیوں کو بھی مروا دیا۔ تم ان کی لاشیں دیکھنا چاہتے ہو؟"

میرا سر گھومنے لگا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ جرمن کمانڈر کی آواز کسی کنوئیں سے آتی سنائی دے رہی تھی۔ میکس ویل، روبن، سنکلر کی شکلیں نظروں کے سامنے ابھرتی ڈوبتی تاریکی پر رقص کر رہی تھیں۔ میں پتھر کے بت کی مانند کرسی پر بیٹھا رہا۔ کرنل زیش نے میز کی دراز کھول کر شراب کی بوتل نکالی اور نصف گلاس پُر کر کے میرے آگے رکھ دیا۔ وہ کہہ رہا تھا:

"کچھ لوگ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن بہت جلد وہ یہاں آ جائیں گے۔ ان قیدیوں کی طرف سے ذمے داری لو کہ وہ ایسی حرکت نہ کریں گے۔"

"فرار ہونے والے کون کون لوگ ہیں؟" شراب کے چند گھونٹ پینے کے بعد میں نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

"ان کے نام تمہیں بعد میں بتا دیئے جائیں گے۔ پہلے یہ فیصلہ کرو کہ تم میکس ویل کی جگہ لینے کے لئے تیار ہو یا نہیں؟ میں مجبور نہ کروں گا، لیکن انکار کی صورت میں ——" وہ مسکرایا۔ "میرا خیال ہے کیمپ کی پُر اذیت زندگی تمہارے لئے مناسب نہ رہے گی۔"

میں لرز گیا۔ کیمپ کی زندگی واقعی عذاب تھی۔ بھوک، پیاس اور جان توڑ مشقت آہنی سے آہنی انسان کو چند دن کے اندر اندر ہڈیوں کے پنجر میں تبدیل کر دیتی تھی۔

"کرنل زیش نے کہا۔" میں یقین دلاتا ہوں کہ قیدی اگر ڈسپلن کی پابندی کریں اور ہمیں پریشان

کرنے کی کوشش نہ کی جائے، تو انہیں مزید مراعات دینے پر غور کیا جا سکتا ہے۔ تم ان کو سمجھا سکتے ہو کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ لوگ تمہاری بات غور سے سنتے ہیں۔ تم قیدیوں میں ہر دلعزیز ہو اور پھر تمہاری ران کا زخم، اسے ٹھیک ہونے میں ابھی کچھ دن لگیں گے۔ ممکن ہے کیمپ میں یہ زخم زیادہ خراب ہو جائے اور تمہیں اپنی ٹانگ سے محروم ہونا پڑے۔"

میں کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرا جسم کانپ رہا تھا۔ "میکس ویل کی جگہ لینے کے لئے تیار ہوں۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ کرنل زیش بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی اور جرمن سنتری کے ساتھ مجھے رخصت ہونے کا اشارہ کیا۔

اپنی بیرک میں پہنچا، تو بہت سے قیدیوں نے مجھے گھیر لیا۔ سب کے چہرے اداس اور اترے ہوئے تھے۔ ساتھیوں کے مارے جانے کا غم ہر شخص کو شدت سے تھا۔ بعض تو مجھے دیکھ کر رو پڑے۔ معلوم ہوا کہ روبن اور سنکلر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، کیونکہ مرنے والوں میں ان کی لاشیں شامل نہ تھیں۔ یہ سُن کر مجھے کچھ اطمینان ہوا اور پھر میں نے سب کو اپنی نئی ذمے داری سے آگاہ کیا اور انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ میرے احکامات کی پُوری پُوری تعمیل کریں گے۔

آہستہ آہستہ دن گزرنے لگے۔ ہسپتال کی زندگی میں ایک ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔ کرنل زیش کے سخت رویے میں بھی نرمی آ گئی۔ ریڈ کراس والوں کو بھی ہسپتال میں آنے جانے کا حکم مل گیا۔ قیدیوں کو ہفتے میں ایک بار خط لکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ اور خوراک میں بھی کسی قدر اضافہ کر دیا گیا۔ رات کے وقت جب قیدی گاتے بجاتے یا تفریح کی محفلیں سجاتے، تو کرنل زیش خود ان میں شریک ہونے لگا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ بہت جلد یہاں سے تبدیل ہونے والا ہے اس لئے نہیں چاہتا کہ اس کا "ریکارڈ" خراب ہو۔"

گسٹاپو کی سر توڑ کوششوں کے باوجود فرار ہونے والوں میں سے اب تک کوئی آدمی نہیں پکڑا جا سکا تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ گسٹاپو والے اتنے ہوشیار اور مستعد نہیں، جتنا ان کے بارے میں پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ کرنل زیش کے اچھے رویے اور اخلاق کا اثر صرف ہسپتال کی چار دیواری تک تھا۔ ورنہ باڑ کے باہر جرمن سپاہیوں کو حکم تھا کہ جو شخص بھی باڑ کے نزدیک آئے، بے دریغ گولی مار دی جائے۔ عمارت کے نزدیک سے ایتھنز کے نیک دل لوگ بائیسکلوں پر گزرتے، تو قیدیوں کے

لیے تحائف کے بنڈل باڑ کے نزدیک پھینک جاتے اور جرمن سپاہی یہ بنڈل اٹھا کر ہمیں دے دیتے مگر بعد ازاں لوگوں کو اُدھر سے گزرنے کی سزا یہ ملی کہ پانچ بے گناہ یونانیوں کو شوٹ کر دیا گیا۔ محض اس خبر پر کہ ایک جرمن گارڈ نے کرنل زیلش سے شکایت کی تھی کہ اس پر کسی نے رائفل سے فائر

دو ہفتے بعد میں اس قابل ہوا کہ آسانی سے چل پھر سکوں۔ اب ہسپتال میں پڑے رہنا کچھ اچھا معلوم نہ ہوا اور بھاگ نکلنے کے منصوبے باندھنے لگا۔ کرنل زیلش سے میرے تعلقات خاصے خوشگوار تھے اور میں چونکہ قیدیوں کا کمانڈر تھا، اس لئے دن رات کسی بھی لمحے کرنل زیلش کے بیرونی چوکی پر بلا روک ٹوک داخل ہو سکتا تھا۔ ایک روز شیو بناتے وقت میں نے اپنی صورت پر غور کیا، تو ایسا احساس ہوا کہ میری اور کرنل زیلش کی صورت میں کچھ مشابہت ہے۔ میں کچھ دیر تک مختلف زاویوں سے اپنے آپ کو جانچتا اور پرکھتا رہا۔ چہرے مہرے، قدوقامت اور چال ڈھال میں بلاشبہ کرنل زیلش کا بھائی نظر آتا تھا۔ اس عجیب انکشاف پر دیر تک سناٹے کی سی کیفیت طاری رہی۔ کبھی خیال آتا کہ یہ فریبِ نظر کے سوا کچھ نہیں، کبھی سوچتا میرا دماغ چل گیا ہے۔ کاش، کرنل زیلش کی وردی چند لمحوں کے لئے مجھے مل جاتی، تب صحیح اندازہ ہوتا۔ بہرحال ایک خطرناک، بلکہ مہلک تدبیر میرے ذہن میں نمودار ہوئی۔ دو راتیں غور کرنے کے بعد اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور موقع کی تلاش میں رہا۔

ایک دن سکاٹ لینڈ کے قیدی ڈاکٹر نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے چپکے سے کہا:

”آج شام کو پریڈ کے بعد مجھ سے مل لینا۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی پیغام مجھے دینا چاہتا ہے۔ سہ پہر کے بعد جنگی قیدی ہلکی سی پریڈ کر لیا کرتے تھے اور اس پریڈ کے بعد آپس میں باتیں کرتے اور ایک دوسرے کو پیغام بھیجنے کا موقع مل جاتا تھا۔ پریڈ کے بعد میں ڈاکٹر کے پاس پہنچا، تو اس نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد کہا: ”روبن اور سنکلر نے پیغام بھیجا ہے کہ وہ جمعرات کی رات کو ایک بوسیدہ مکان میں تمہارا انتظار کریں گے۔ یہ مکان خاردار باڑ سے مغرب کی جانب کوئی پانچسو گز دور ہے۔ اگر تم اس روز کسی طرح باڑ عبور کر سکو، تو وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ترکی جانے کے سارے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں اور وہ اب تک اس لئے نہیں گئے کہ انہیں تم سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا ہے کہ تینوں دوست اکٹھے ہی چلیں گے۔“

"آپ کو روبن اور سنکلر کا یہ پیغام کیسے ملا؟" میں نے پوچھا۔
"باورچی خانے میں نیوزی لینڈ کا آدمی کام کر رہا ہے اور وہ جرمنوں کے ساتھ اجناس اور سبزیاں لینے شہر جاتا ہے اور کسی نہ کسی طرح دوستوں سے رابطہ قائم کر لیتا ہے۔ یہ پیغام اسی باورچی کی معرفت ملا ہے۔ بہتر ہے کہ تم اس سے مل لو۔"
میں نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا اور باورچی کے پاس پہنچا۔ اس سے تفصیلات دریافت کیں، تو وہ فوراً مکر گیا اور کہنے لگا:
"میں کسی روبن اور سنکلر کو نہیں جانتا اور نہ میں پیغام لانے لے جانے کا کام کرتا ہوں۔ کسی نے آپ کو غلط اطلاع دی ہے۔"
"دیکھو جھوٹ نہ بولو، یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ اگر تم میرے کسی کام آسکتے ہو، تو اس سے دریغ نہ کرو۔" یہ سُن کر وہ کچھ پسیجا، پھر کچھ غور کرتے ہوئے بولا۔
"آپ منگل کو مجھ سے مل لیجئے۔ کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی، لیکن وعدہ کیجئے کہ اگر آپ پر کوئی مصیبت آئی تو میرا نام نہ لیں گے۔"
میں نے وعدہ کیا اور اپنی بیرک میں چلا آیا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جمعرات کے روز کس طرح باڑ پھلانگ کر اپنے دوستوں تک پہنچوں گا۔ بہرحال میں نے طے کر لیا کہ اگر باورچی نے میری مدد نہ کی، تو میں اسی تدبیر پر عمل کروں گا جو چند روز پہلے طے کر چکا تھا۔ اس دوران میں میں نے سفر کا سامان تیار کر لیا۔ سامان ہی کیا تھا۔ باسی روٹی کے کچھ ٹکڑے، ایتھنز کا ایک چھوٹا سا نقشہ جو میں نے بیت الخلا میں استعمال ہونے والے پتلے کاغذ پر بنایا تھا اور یونانی کرنسی کے پچاس نوٹ جو قیدالاؤنس کی صورت میں میرے پاس جمع تھے۔ سب سے بڑی ضرورت شہری لباس کی تھی۔ جو مجھے کسی نہ کسی طرح حاصل کرنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ فرار کے بعد اپنی وردی پہنے پھرنا موت کو دعوت دینا تھا۔ میں نے کوشش کر کے ایک نیلا پاجامہ، سفید قمیص اور امریکن ہیٹ مختلف قیدیوں سے چند کرنسی نوٹوں کے عوض خرید لیا اور اپنے فوجی اوورکوٹ کے بدلے میں ایک آسٹریلین سے دو نئے جوتے۔ لئے جو اُسے کسی یونانی نے تحفے میں دیئے تھے۔ میں نے پاجامہ اور قمیص تکیے کے پرانے غلاف میں چھپائے اور نئے جوتوں کو ریڈ کراس کے

کاٹ کر بھدا بنا دیا اور ران پر مٹی مل دی تاکہ پرانے دکھائی دیں۔

منگل کے دن جب میں باورچی سے ملنے گیا، تو اس نے کاغذ کا ایک پرزہ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا:

"میں اس سے زیادہ آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتا، کیونکہ میں نہایت بزدل آدمی ہوں۔ آہ خدا کے لیے یہاں سے ٹل جایئے، گسٹاپو کے جاسوس اب یہاں ہسپتال میں موجود ہیں۔ اگر کسی نے کرنل زیشس کو خبر پہنچا دی، تو مجھ پر مصیبت آ جائے گی۔"

کاغذ کا پرزہ مٹھی میں دبائے سیدھا اپنی جگہ پہنچا۔ اس پر لکھا تھا:

"ہم تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ ہسپتال کی پشت پر رات کے وقت صرف ایک جرمن سنتری پہرہ دیتا ہے۔ اگر تم اسے زیر کر لو، تو باڑ عبور کر کے مغرب کی جانب رینگنا شروع کر دینا۔ تقریباً پانچ سو گز دور ایک مکان کے کھنڈر دکھائی دیں گے۔ ہم دس بجے تک یہیں رہیں گے۔

"رابن، سنکلر"

ہسپتال کی پشت پر جرمن آفیسروں اور سپاہیوں کی بارکیں بنی ہوئی تھیں۔ شاید اسی لیے انہوں نے صرف ایک پہرے دار کی ڈیوٹی مقرر کی تھی کہ اس جانب سے فرار ہونے کا کوئی شخص تصوّر بھی نہ کر سکتا تھا۔ ہسپتال کا یہ شمالی حصّہ زیادہ عمدہ اور کشادہ تھا اور جرمن بارکوں سے اندازاً تیس فٹ کے فاصلے پر باڑ شروع ہو جاتی تھی۔ اگر کوئی شخص جرمن بارکوں تک پہنچ جائے تو سنتری کی نگاہ بچا کر باڑ عبور کرنا مشکل نہ تھا، مگر دشواری یہ تھی کہ سورج غروب ہوتے ہی ہسپتال کا شمالی دروازہ جرمن بارکوں کی طرف سے بند کر دیا جاتا تھا اور اسی وقت کھلتا تھا جب کرنل زیشس یا کوئی اور جرمن افسر دستک دیتا۔ دروازہ بند ہونے سے پہلے پہلے کسی جرمن بارک میں چھپنے کا موقع مل سکے، تو اس طرف سے بھاگ نکلنا آسان ہوتا مگر جرمن بارک میں چھپا کیسے جائے؟ ناممکن بات تھی تاہم میں نے کوشش ضرور کی۔ منگل کے روز سورج نکلنے سے کچھ دیر پہلے ہی میں ٹہلتا ہوا شمالی دروازے کے نزدیک پہنچا اور جرمن گارڈ سے پوچھا "کرنل زیشس کہاں ہے، میں اس سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے بتایا "کرنل یہاں نہیں ہے۔ کیمپ کے معائنے پر گیا ہوا ہے اور آدھے گھنٹے بعد آئے گا، میں مایوس ہو کر لوٹ آیا۔

بدھ کا دن بھی اسی تگ و دو میں گذر گیا۔ مگر جرمن بارکوں میں گھسنے کا موقع نہ ملا۔ میں اپنی قسمت کو کوسنے لگا۔ جمعرات کے روز پھر سکاٹ ڈاکٹر نے مجھے روبن کا پیغام یاد دلایا اور التجا کی کہ اگر بھاگ نکلنے کی کوئی تجویز میرے ذہن میں ہے، تو اسے آگاہ کیا جائے، دراصل ڈاکٹر خود بھی میرے ساتھ فرار ہونے کا خواہشمند تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ فی الحال کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی ہے۔ بہر حال وقت کا انتظار کرنا چاہیئے۔ سچ پوچھیئے تو میں خود حد درجے مایوس اور ناامید ہو چکا تھا۔

جمعرات کے روز رات کے آٹھ بجے یکایک ایک جرمن سنتری میرے پاس آیا۔ میں بستر پر لیٹا سوچ رہا تھا کہ روبن اور سنکر آج رات میرا انتظار کریں گے اور جب میں مقررہ جگہ پر نہ پہنچوں گا۔ تو یقیناً مایوس ہو کر اینفز سے رخصت ہو جائیں گے۔

"تمہیں کرنل بلاتا ہے۔" جرمن سپاہی نے میرا شانہ ہلا کر کہا۔

"کیا کام ہے؟ کہاں ہے کرنل؟" میں نے پوچھا۔

"اپنے کوارٹر میں ——— اس کی طبیعت کچھ خراب ہے ———" یہ کہہ کر جرمن مسکرایا پھر کہنے لگا "کرنل بولتا ہے تم شطرنج کے بہت اچھے کھلاڑی ہو۔ تمہیں اس کا دل بہلانے کے لئے شطرنج کھیلنا ہوگی۔ جلد میرے ساتھ چلو، وہ انتظار کر رہا ہے۔"

"ٹھہرو، ابھی آتا ہوں، ذرا پیشاب کر آؤں" قدرت کی اِس بروقت مدد پر دل ہی دل میں حیران ہوتا ہوا میں بیت الخلا کی طرف روانہ ہوا۔ لیکن اُدھر جانے کے بجائے سیدھا سٹور روم کے نزدیک گیا، جہاں لکڑی کی ایک بوسیدہ الماری کے پیچھے میں نے اپنا تکیہ چھپا رکھا تھا۔ زیادہ سامان لینے کا وقت نہ تھا، صرف کرنسی نوٹ جیب میں ڈال لئے اور دھڑکتے دل کے ساتھ واپس آیا۔ جرمن سنتری میرا انتظار کر رہا تھا۔ چند منٹ بعد ہم تاریک کمپاؤنڈ کو عبور کرتے ہوئے شمالی دروازے کے قریب کھڑے تھے، جرمن نے دروازہ کھلوایا اور مجھے لے کر سیدھا کرنل زبش کی چھوٹی سی، لیکن خوبصورت کوارٹر نما بارک میں داخل ہوا۔ کرنل زبش کمبل اوڑھے بستر پر لیٹا تھا اور اس کے چہرے پر تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے اسے مسکرا کر سیلوٹ کیا، تو وہ اُٹھ بیٹھا اور جرمن سنتری کو دروازہ بند کرنے کا اشارہ کر کے مجھ سے مخاطب ہوا۔

"معاف کرنا، تمہیں اس لئے تکلیف دی کہ میرے ماتحت جرمن افسروں میں سے کوئی شخص شطرنج کا ایسا کھلاڑی نہیں جیسے تم ہو، مجھے نیند نہیں آ رہی تھی، سوچا دو تین بازیاں کھیل لوں۔ امید ہے تم کو ناگوار نہ ہوگا۔ شراب کی بوتل وہ سامنے رکھی ہے اور سگار کا ڈبہ اس میز پر پڑا ہے، بے تکلف ہو کر بیٹھو۔"

شراب کی بوتل اور سگار کا ڈبا اٹھاتے ہوئے میں نے کمرے کا سرسری نظر سے جائزہ لیا۔ کمرہ زیادہ بڑا نہ تھا۔ مشرق کی طرف ایک بند دروازہ غالباً دوسرے کمرے میں کھلتا تھا۔ ایک جانب چھوٹا سا غسل خانہ بنا ہوا تھا۔ جس کے قریب ہی آتش دان میں آگ بھڑک رہی تھی اتنی دیر میں کرنل چھوٹی سی میز پر شطرنج بچھا کر مہرے رکھ چکا تھا۔ کھیلنے کو تو میں نے کھیل کا آغاز کر دیا، لیکن دماغ کہیں اور تھا۔ بھاگ نکلنے کا نادر موقع مجھے مل گیا تھا اور اگر اب فائدہ نہ اٹھاتا تو اپنی بزدلی پر مجھے ہمیشہ افسوس رہتا۔ بار بار میری نظریں اس کلاک کی طرف جاتیں جو نظروں کے سامنے دیوار پر لگا ہوا تھا۔ اس کی سوئی آہستہ آہستہ نو کے ہندسے پر پہنچ رہی تھی۔ مجھے جلد از جلد کچھ کرنا چاہیئے۔ کرنل زیشش کھیل میں محو تھا اور اس دوران میں وہ شراب کی پوری بوتل پی چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر اسے مزید کچھ دیر کھیل میں الجھائے رکھوں تو کامیابی قدم چوم سکتی ہے۔ باہر کمپاؤنڈ میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کبھی کبھی باڑ کی جانب ٹہلنے والے جرمن سپاہی کے جوتوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ وقت پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے کلاک کی سوئیاں ساڑھے نو بجانے لگیں۔ کرنل پانچویں بازی جیتنے کے بعد ایک نیا سرور محسوس کرتے ہوئے اٹھا ـــــ میں نے دیکھا کہ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ ہے۔ وہ الماری کھول کر نئی بوتل نکال رہا تھا۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر آتش دان کے قریب رکھی ہوئی آگ کریدنے والی آہنی سلاخ اٹھالی اور جونہی کرنل مڑا، میرا ہاتھ اونچا ہوا اور سلاخ کرنل زیشش کی پیشانی پر پڑی۔ ایک ثانیے کے لئے میں نے اس کی آنکھوں میں دہشت کے آثار دیکھے۔ اس کی پیشانی سے خون کا فوارہ اچھلا اور اس سے پہلے کہ وہ دھڑام سے فرش پر گرے، میں نے اسے سنبھال لیا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ کرنل زیشش بے ہوش ہو گیا، لیکن میں نے احتیاطاً رومال اس کے منہ میں ٹھونس کر بستر پر ڈال دیا۔ اب میں وقت ضائع کئے بغیر نکل جانا چاہتا تھا۔ مشرقی دروازہ

کھول کر دوسرے کمرے میں داخل ہوا، کرنل کی وردی لٹک رہی تھی۔ میں نے سُرعت سے اپنے کپڑے اتارے، کرنل کی وردی پہنی، ریوالور اور کارتوسوں کی پیٹی باندھی، ہیٹ کا چھجا پیشانی پر جھکا لیا اور میز پر پڑے ہوئے شیونگ کِٹ کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ مجھے خود پر کرنل زیش کا دھوکا ہونے لگا۔ میں نے جلدی جلدی مختلف الماریوں اور دروازوں کی تلاشی لی، مگر کام کی اور کوئی چیز نہ ملی، البتہ بسکٹوں کا ایک ڈبا مل گیا، جسے میں نے جیب میں ڈال لیا۔ کرنل زیش ابھی تک بے ہوش پڑا تھا اور چہرہ ہلدی کی مانند زرد ــــ میں سمجھا شاید چل بسا، لیکن دل پر ہاتھ رکھنے سے پتہ چلا کہ ابھی زندہ ہے۔ یکایک ایسی آواز آئی جیسے کوئی شخص کرنل کے کوارٹر کی طرف آ رہا ہے۔ یہ ضرور کوئی جرمن سپاہی یا افسر تھا۔ میں نے جلدی سے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے آہستہ سے دستک دی اور جرمن زبان میں کچھ کہا۔ جس کا مطلب میں نہ سمجھ سکا، لیکن اتنے عرصے جرمنوں میں رہنے سے اس زبان کے چند الفاظ بولنا سیکھ گیا تھا۔ میں نے کرنل زیش کا سا کرخت لہجہ بنا کر بلند آواز سے کہا:

"دفع ہو جاؤ، مجھے پریشان نہ کرو۔"

دستک کی آواز اُسی وقت رُک گئی اور آنے والا چند لمحے بعد جدھر سے آیا تھا، اُدھر چلا گیا۔

رُخصت ہونے سے پہلے میں نے کرنل زیش کو اٹھا کر غسل خانے میں ڈال دیا اور دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ شمالی دروازے کے قریب کھڑا ہوا گارڈ میرے قدموں کی آہٹ پاتے ہی اٹین شن ہو گیا۔ میں نے کنکھیوں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے کرنل زیش کی جیپ گاڑی نظر آئی۔ اسی پر وہ کیمپ کا معائنہ کرنے جاتا تھا۔ میں سیدھا جیپ کی طرف گیا اور اسے سٹارٹ کر کے دروازے کی طرف لایا۔ گارڈ نے فوراً دروازہ کھولا اور ایک منٹ بعد میں اس منحوس ہسپتال کی چار دیواری سے آزاد ہو چکا تھا۔ ابھی میری جیپ بمشکل پچاس ساٹھ گز دُور گئی تھی کہ اس کا انجن رُک گیا۔ میں اسے سٹارٹ کرنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ ہسپتال کی چھت کے چاروں طرف لگے ہوئے سائرن بھیانک آوازوں میں چیخ اُٹھے۔ سرچ لائٹیں روشن ہو گئیں اور واچ ٹاوروں کے اوپر لگی ہوئی سرخ بتیاں بار بار جلنے بجھنے لگیں۔ انہیں

میرے فرار کا علم ہو گیا تھا۔ میں نے جیپ کو وہیں چھوڑا اور اندھا دھند مغرب کی طرف دوڑنے لگا۔ چند لمحے تک سائرن بجتے رہے۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ میں نے ایک ٹیلے کی آڑ میں رُک کر سانس درست کیا۔ اچانک جرمن سپاہیوں کے دوڑنے بھاگنے اور ایک دوسرے کو خبردار کرنے کی آوازیں کان میں آئیں۔ وہ میرے تعاقب میں روانہ ہو چکے تھے۔ میں پھر دوڑنے لگا۔ لیکن محسوس ہوا کہ کرنل زیش کی وردی کا بھاری اوورکوٹ بھاگنے میں رکاوٹ پیدا کر رہا ہے۔ اسے اتار کر پھینکنا حماقت تھی، کیونکہ اس سے جرمنوں کو پتہ چل جاتا کہ میں کس طرف گیا ہوں۔ بہرحال میں ہانپ ہانپ کر دوڑتا رہا اور کچھ دیر بعد میں نے ایک بڑے مکان کے کھنڈر دیکھے جو بمباری سے تقریباً تباہ ہو چکا تھا اور اس تاریکی میں بدروحوں کا مسکن نظر آتا تھا۔

ایک گری ہوئی دیوار تلے ٹھہر کر میں غور سے دیکھنے لگا۔ وہاں کوئی ذی روح نہ تھا۔ میں نے آہستہ سے روبن کو آواز دی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ ایک ایک لمحہ نازک تھا۔ جرمن سپاہی لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہے تھے۔ میں نے زور سے آواز دی، دفعتاً دائیں جانب سے فائر ہوا اور گولی شائیں سے میرے سر کے بال چھوتی ہوئی دیوار میں پیوست ہو گئی۔

"ٹھہرو! اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔" میں نے روبن کی گرجدار آواز سنی "تم کون ہو؟"

اب میں نے دیکھا کہ دائیں جانب سیاہ کپڑوں میں ملبوس دو آدمی کھڑے ہیں۔ ایک کے ہاتھ میں پستول تھا۔ دوسرے نے فوراً ٹارچ روشن کی۔ دراصل انہوں نے میری جرمن وردی سے دھوکا کھایا تھا "ارے یہ تو تم ہو" وہ دونوں میری صورت دیکھ کر چلائے۔

"خدا کے لئے یہاں سے بھاگو" میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "جرمن میرے تعاقب میں ہیں، کوئی دم میں آیا چاہتے ہیں۔"

لیکن اس سے پہلے کہ ہم اپنی حفاظت کے لئے کوئی قدم اٹھاتے، گولیوں کی ایک بوچھاڑ سروں پر سے گذر گئی۔ میں نے دیکھا تین جرمن سپاہی ہاتھوں میں سٹین گن تھامے ہمارے بالکل قریب پہنچ چکے ہیں۔ وہ اندھا دھند گولیاں برسا رہے تھے۔ انہوں نے دوسری باڑ ماری، میں زمین پر لیٹ گیا۔ روبن اور سنکر کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ گولیاں ان کے جسموں کو چھیدتی ہوئی نکل گئیں اور وہ کوئی آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گئے۔ جرمن سپاہی اب اچھل

روشن کر کے آگے بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے للکار کر جرمن زبان میں کہا۔

"مکان سے باہر نکل آؤ۔"

میں نے کرنل زینس کا بھرا ہوا ریوالور اندرونی جیب سے نکالا اور فائر کر دیا۔ ایک سپاہی الٹ کر گرا اور اس کے گرتے ہی دونوں جرمن دیواروں کی اوٹ میں ہو گئے۔ موت کے بھیانک سائے میرے تعاقب میں تھے۔ لیکن اپنے عزیز دوستوں کی لاشیں دیکھ کر جوش کے باعث میں سوچنے سمجھنے کے قابل نہ تھا۔ میں نے وزنی کوٹ اتار کر پھینکا، دوسرے ہاتھ میں بسکٹوں کا ڈبہ تھا اور رینگتا ہوا دوسری جانب نکل گیا۔ جرمن سپاہی تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد فائر کرتے، مگر میں بہت دور نکل چکا تھا۔ پھر میں تیزی سے دوڑنے لگا۔ کتنی ہی بار ٹھوکر کھا کر گرا اور زخمی ہوا۔ میری کہنیاں اور گھٹنے بری طرح چھل چکے تھے اور سانس پیٹ میں نہ سماتا تھا، لیکن جان بچانے کی خاطر وحشی ہرن کی طرح دوڑتا رہا۔

اب میں ایک ویرانے میں نکل آیا تھا۔ جہاں خودرو جھاڑیاں اور ٹیلے کثرت سے تھے۔ صبح ہونے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے اور یہی وہ وقت تھا کہ میں جرمنوں سے جتنی دور ہو جاتا اتنا ہی میرے حق میں بہتر تھا، مگر سوال یہ تھا کہ جاؤں کہاں؟ مجھے اس مکان کا خیال آیا جس کے بارے میں سکاٹ ڈاکٹر اور نیوزی لینڈ کے باورچی نے ذکر کیا تھا۔ میں سوچنے لگا کیا وہاں جانا چاہیئے؟ لیکن میں تو نہ جانے کہاں نکل آیا تھا اب وہ مکان ڈھونڈنا سخت دشوار تھا۔ بہرحال میں نے اپنے آپ کو قسمت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اتنا تو اطمینان تھا کہ یونانی ہمارے دشمن نہیں اور اگر میں گسٹاپو کے کسی جاسوس کی نظروں میں نہ آیا، تو یونانیوں سے مدد حاصل کرنا کچھ مشکل نہ ہوگا۔

صبح ہونے سے کچھ دیر پیشتر میں نے اپنے آپ کو ایک بلند پہاڑ کے دامن میں پایا۔ رات بھر کی بھاگ دوڑ، شدید سردی اور زخموں کے باعث میری حالت اس درجے ابتر تھی کہ بیان سے باہر، میں نے پہاڑ کی ایک تاریک کھوہ میں پناہ لی اور بہت جلد مجھ پر غشی طاری ہو گئی۔ آنکھ کھلی تو آسمان پر سورج چمک رہا تھا اور شمال مغرب کی جانب سے سرد ہوا کے پے در پے جھونکے آ رہے تھے۔ جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ سمندر نزدیک ہے۔

میں نے کھوہ سے نکل کر دیکھا۔ دور کسی چھوٹی سی بستی کے آثار نظر آئے۔ دفعتہً طیارے کی گونج دار آواز سنائی دی۔ ایک چھوٹا سا جرمن جہاز بہت نیچے پرواز کرتا ہوا میری طرف آرہا تھا۔ میں لپک کر کھوہ میں داخل ہو گیا۔ طیارہ کچھ دیر تک چکر لگاتا رہا۔ پھر میں نے دیکھا بستی کی طرف گیا اور وہاں بھی کئی چکر لگانے کے بعد نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جرمن مجھے سرگرمی سے تلاش کر رہے ہیں۔ شام تک میں وہیں دبکا رہا۔ چونکہ اس دوران میں طیارہ پرواز کرتا ہوا کئی بار ادھر سے گذرا۔ تھکن اور بھوک کے ہاتھوں جان لبوں پر آچکی تھی اور سردی سے میرا جسم کانپ رہا تھا۔ سورج ڈوبنے سے کچھ دیر پہلے میں بستی کی طرف روانہ ہوا۔ بستی کے باہر ایک چھوٹا سا باغ نظر آیا جس کے درمیان دو منزلہ پرانا مکان بنا ہوا تھا۔ جونہی میں باغ میں داخل ہوا۔ ایک کتا بھونکتا ہوا میری طرف لپکا اور مجھ پر حملہ کر دیا اور میری حماقت دیکھیے کہ میں نے بدحواس ہو کر کتے پر فائر کر دیا۔ گولی کتے کو تو نہ لگی، مگر فوراً ہی سرخ بالوں والی ایک نوجوان حسین لڑکی دوڑتی ہوئی آئی۔ کتا مسلسل بھونک رہا تھا۔ لڑکی نے جونہی مجھے دیکھا، چیخ مار کر پیچھے ہٹی۔ پھر اس نے کتے کو آواز دے کر اپنے پاس بلا لیا۔

"تم کون ہو؟" اس نے یونانی زبان میں پوچھا۔

میں کسی قدر یونانی زبان سمجھ تو سکتا تھا۔ لیکن بولنے پر قادر نہ تھا۔ میں نے اسے اشاروں میں سمجھانے کی کوشش کی، مگر وہ مزید خوفزدہ ہوئی اور بھاگ اٹھی۔ شاید اس نے میرے ہاتھ میں پستول دیکھ لیا تھا۔ میں نے وہاں سے رفوچکر ہونا چاہا، مگر پیروں نے جنبش نہ کی۔ تھوڑی دیر بعد دس پندرہ یونانی جوان وہاں آئے اور انہوں نے مجھے پکڑ لیا۔ ان میں سے ایک شخص انگریزی جانتا تھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے اپنی رام کہانی سنائی۔ اس نے دوسروں کو آگاہ کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ انہیں میری حالت پر ترس آگیا ہے۔ ایک عمر رسیدہ اور باوقار یونانی نے میرا ہاتھ پکڑا اور مکان میں لے گیا۔

میں دس روز تک یونانیوں کا مہمان رہا۔ اسی دوران میں مجھے پتہ چلا کہ جرمن اب تک میری تلاش میں ہیں، چونکہ سلاخ کی شدید ضرب سے کرنل زیشن مر چکا تھا۔ انہوں نے ایک بار اس بستی کا رُخ بھی کیا۔ ایک ایک گھر کی تلاشی لی۔ لوگوں کو میرے متعلق کچھ بتانے پر انعام دینے کا وعدہ بھی کیا، مگر یونانی ان سے ایسی نفرت کرتے تھے کہ میرا پتا بتانا تو درکنار، جرمنوں سے بات تک کرنے کے روادار نہ تھے۔ میرے میزبان کا نام کیریانی تھا اور اس سے پہلے کئی مفرور اتحادی قیدیوں کو پناہ دے کر ترکی اور لیبیا تک پہنچا چکا تھا۔ جرمنوں کے خلاف اس کے غم و غصّے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے یونان پر قبضے کے دوران میں اس کی بڑی لڑکی کو اغوا کر کے بے آبرو کیا، حتیٰ کہ وہ بدنصیب لڑکی موت کی آغوش میں پہنچ گئی۔

لیکن جرمنوں اور گسٹاپو کے جاسوسوں نے بستی کے اردگرد اپنا جال بچھا رکھا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ میں بستی میں موجود ہوں۔ دن رات کے کسی بھی حصّے میں وہ آجاتے اور مکانوں کی تلاشیاں لیتے۔ لیکن کیریانی کے مکان میں بنے ہوئے خفیہ تہہ خانے تک ان کی رسائی ناممکن تھی۔ اس تہہ خانے میں چھپے ہوئے ایک مہینہ گزر گیا۔ جرمن اب بھی میرا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ مجھے تلاش کرنے میں ان کی ناکامی کا اصل سبب کیریانی کے مقرر کردہ وہ یونانی جاسوس تھے جو جرمنوں کی نقل و حرکت کی خبریں کیریانی کو پہنچایا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اتحادی آبدوزیں کبھی کبھار سمندر کے اس حصّے میں آنکلتی ہیں اور وہ کسی آبدوز کے انتظار میں ہیں تاکہ مجھے کسی نہ کسی طریقے سے آبدوز میں سوار کرا سکیں۔ دوسرے مہینے کے پہلے ہفتے کی ایک تاریک رات کا ذکر ہے کہ برطانوی رائل ایئر فورس کے بمبار طیاروں نے میٹونی کے ہوائی اڈّے پر زبردست حملہ کیا اور اتنی شدید بمباری کی کہ ہوائی اڈّے پر کھڑے ہوئے جرمن طیاروں میں لگی ہوئی آگ کے شعلے میلوں دور سے نظر آتے تھے۔ تاریک رات اور بمباری سے فائدہ اٹھانے کا یہ سنہری موقع تھا۔ کیریانی نے لکڑی کے تین بڑے بڑے ڈرم ایک دوسرے سے باندھ کر تیار کر رکھے تھے۔ درمیانے ڈرم میں میرے لیٹنے کی جگہ بنائی گئی تھی اور بقیہ ڈرموں میں کھانے پینے کی چیزیں اور کپڑے بھر دیئے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر مجھے اس ڈرم میں چھپا کر سمندر میں چھوڑ دیا جائے تو کوئی

جرمن جہاز ان بہتے ہوئے ڈرموں پر شک نہ کرے گا اور ممکن ہے کہ میں کسی اتحادی جہاز یا آبدوز کو متوجہ کر سکوں۔ جان بچانے کی یہی صورت تھی، ورنہ جرمن ایک نہ ایک روز مجھے ضرور پکڑ لیتے اور کرنل زیش کو ہلاک کرنے کے جرم میں شوٹ کر دینا ان کے لئے معمولی بات تھی۔

بحر روم میں لکڑی کے تین ڈرم فاقہ زدہ ہڈیاں نکلے ہوئے جنگی قیدی کو سینے سے لگائے بھٹکتے رہے، لیکن کسی جرمن جہاز اور کسی اتحادی آبدوز نے اس کی طرف دھیان نہ دیا۔ ڈرم کا تنہا، جاں بلب مسافر موت کی آرزو کرتا رہا۔ مگر موت نہ آئی۔ اسے اپنی منزل کے بارے میں کچھ خبر نہ تھی، کبھی کبھی ڈرم کا ڈھکنا اٹھا کر نیلے آسمان اور چمکتے ہوئے سورج کو دیکھتا اور پھر لکڑی کی قبر میں چھپ جاتا۔ دن میں ان گنت مرتبہ جرمن، برطانوی، امریکی اور اطالوی طیارے اس کے اوپر سے گزرتے اور افق پر گم ہو جاتے، لیکن کسی کو اس کی طرف دیکھنے کی فرصت نہ تھی۔ کئی بار جنگی جہاز اس کے قریب سے گزرے، اس نے چیخ چلا کر اور چیخ چیخ کر جہاز والوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کی، مگر بے سود، آخر وہ دل بھی اُگیا۔ جب اس کے پاس پینے کے لئے پانی تھا نہ کھانے کے لئے کوئی چیز۔ اس کے بازو چیخ چلاتے چلاتے شل ہو چکے تھے اور آنکھیں اُبلی پڑتی تھیں۔ اس کا حافظہ جواب دے گیا۔ اسے کچھ یاد نہ رہا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے اور کدھر جا رہا ہے۔ کبھی کبھار اس کی نظروں کے سامنے ایک عورت اور تین معصوم بچوں کی تصویریں ضرور گھومتیں، جو انگلستان کے کسی چھوٹے سے گاؤں میں اس کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ ٹھیک ایک ماہ بعد بن غازی کی بندرگاہ کے قریب سمندر کی پرسکون لہروں میں ایک دوسرے سے بندھے ہوئے تین ڈرم بہتے دکھائی دیے۔ ایک برطانوی جنگی جہاز کے کپتان نے دوربین سے دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ بارودی سرنگیں ہیں جو جرمنوں نے اتحادی جہازوں کو تباہ کرنے کے لئے سمندر میں ڈال رکھی ہیں اور انہیں فائر کر کے اڑا دینے کا حکم دینے ہی والا تھا کہ ایک شوریدہ سر موج نے تینوں ڈرموں کو اچھال کر جہاز کے نزدیک پہنچا دیا۔ تھوڑی دیر بعد چند انگریز ملاح اسے جہاز پر کھینچ لانے میں کامیاب ہو گئے انہوں نے ڈرم کا ڈھکنا اٹھایا، تو اندر ایک عجیب الخلقت سوکھا ہوا آدمی

نظر آیا۔ اسے فوراً جہاز کے ہسپتال میں لے جایا گیا اور ڈاکٹروں نے اس کی جان بچانے کی ان تھک کوششیں شروع کر دیں۔ ایک گھنٹے بعد بدنصیب شخص نے آنکھیں کھولیں اور سب سے پہلے جو چیز اس کی نظروں کے سامنے آئی وہ سر ونسٹن چرچل کی تصویر تھی۔

"کون ہو تم اور کہاں سے آئے ؟" ایک ڈاکٹر نے اس پر جھک کر پوچھا مفرور قیدی کے ہونٹوں پر تبسم کی ایک ہلکی سی لہر نمودار ہوئی۔ "ایتھنز سے" اس نے جواب دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

فرار ہونے کے بعد

گرفتاری کے بعد یہ تیسرا دن تھا، ہم مسلسل مارچ کرتے ہوئے کیلے اور ایمینز کے ایک درمیانی ریلوے جنکشن ہیڈن تک پہنچ گئے۔ وہ ہمیں فرانس سے جرمنی کی طرف لے جا رہے تھے۔ ان تین دنوں میں جرمن محافظوں نے نہ خود آرام کیا اور نہ ہمیں سستانے کا موقع دیا۔ نہ معلوم یہ لوگ کس مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ دن رات چلنے کے باعث ہمارے جسم تھک کر چور ہو گئے تھے۔ چہرے پژمردہ اور گردیں اٹے ہوئے تھے۔ داڑھیاں بڑھی ہوئیں اور وردیاں میلی کچیلی۔ اس روز ہم نے صبح چار بجے سے جو چلنا شروع کیا۔ تو شام پانچ بجے تک چلتے رہے۔ درمیان میں صرف دس پندرہ منٹ سستانے اور کھانے پینے کا موقع ملا۔ تیرہ گھنٹے میں ہم نے پچیس میل کا فاصلہ طے کر لیا۔ اس روز قیامت کی گرمی پڑی، پیاس کے مارے ہماری زبانیں سوکھ گئیں۔ لیکن جرمن محافظوں نے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ ایک مرتبہ بھی رک کر کسی نالے یا چشمے پر پیاس بجھا لیتے۔ وہ ہمیں جلد سے جلد کیمپ میں پہنچا کر اپنی ذمّے داریوں سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔

قیدیوں میں فرانسیسی اور برطانوی سپاہیوں اور افسروں کی تعداد چار سو کے لگ بھگ تھی۔ اور ہم لمبی قطار میں چل رہے تھے۔ پندرہ پندرہ اور بیس بیس فٹ کے فاصلے پر مسلّح جرمن محافظ ہمارے ساتھ تھے، لیکن اس کے باوجود کئی قیدی

چھکے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ میں نے خود دیکھا کہ ایک چھوٹا پل عبور کرتے ہوئے جیک پول نامی ہمارا ساتھی کمال ہوشیاری سے نیچے کود کر لمبی لمبی گھاس میں غائب ہو گیا۔ اگر محافظ اُسے دیکھ لیتے تو نہ جانے کتنی گولیاں اس کے جسم سے پار ہو جاتیں۔

میرے ساتھیوں نے یکایک فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا، کیونکہ ہم نے محسوس کر لیا تھا کہ جرمن بھی تھکے ہوئے ہیں۔ اور ساری رات جاگنے کے باعث اونگھنے لگتے ہیں، ٹام ایکٹن اور رمی نے چلتے چلتے میرے کان میں کہا:

"کسی طرح آگے نکلنے کی کوشش کرو، میں نے دیکھ لیا ہے کہ آگے محافظوں کی تعداد کم ہے۔ ہم آسانی سے کہیں رُو پوش ہو جائیں گے"

یہ کہہ کر انہوں نے تیز تیز قدم اُٹھانے شروع کر دیئے اور مجھے بھی اُن کا ساتھ دینا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد ہم قطار میں اگلے آدمیوں کے ساتھ قدم ملا کر چل رہے تھے۔ چند منٹ میں ہم ایک کھلے میدان میں پہنچ گئے۔ فاصلے پر چند گاڑیاں اور فوجی ٹرک کھڑے تھے۔ دیکھتے دیکھتے اُن میں سے جرمن نکل کر ہماری صفوں میں گھس گئے۔ اور قیدیوں کی گھڑیاں، نقدی اور اسی طرح کی چیزیں چھیننے لگے۔ ہم نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اور جو کچھ انہیں دے سکتے تھے، دے کر پیچھا چھڑایا۔ خدشہ تھا کہ اگر انہوں نے ہماری تلاشیاں لیں تو نہ جانے ایسی کتنی چیزوں سے محروم ہونا پڑے گا جو بھاگنے کے بعد ہمارے کام آ سکتی تھیں۔

ہسڈن تک فرار ہونے کا کوئی موقع نہ ملا کیونکہ کھلا میدان تھا اور ہم کسی طرف بھی محافظوں کی نگاہوں سے بچ کر نہ جا سکتے تھے۔ ہسڈن سے نئے اور تازہ دم محافظ آگئے اور ساری رات ہمارے سروں پر رائفلیں اور سنگینیں تان کر ٹہلتے رہے۔

ہمیں بتایا گیا کہ ابھی ایک دن کا سفر اور ہے؛ چنانچہ اگلے روز صبح ساڑھے

پانچ بجے ہمیں پھر بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک دیا گیا۔

اب ہم جس سڑک پر چل رہے تھے۔ وہ نہایت تنگ اور دشوار گزار کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد تھے۔ ہمارے قدموں کی آوازیں سُن کر گا کے بچے بوڑھے گھروں سے باہر نکل آتے اور حیرت و افسوس سے ہمیں دیکھتے تک مسلسل چلنے کے بعد ہمیں ٹھہرنے کا حکم ملا۔ محافظوں کے افسروں نے قیدیوں کی گ کی اور اُسے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ دو آدمی کم ہیں۔ اس نے ٹوٹی پھو فرانسیسی میں کہا:

"میں تم لوگوں کو تنبیہہ کرتا ہوں کہ بھاگنے کی کوشش فضول ہے ہم بھاگ والوں کو جہنّم سے بھی کھینچ لائیں گے۔"

اور واقعی اس نے سچ کہا تھا، کیونکہ تھوڑی دیر بعد ہی ہمارے بھاگنے وال دو ساتھی ایک جیپ میں بٹھا کر لائے گئے۔ ان کے ہاتھ پُشت پر بندھے ہو تھے۔ انہیں دوبارہ قطار میں شامل کر دیا گیا۔ اِن میں سے ایک تو وہی جیک لوئی تھا اور دوسرا کوئی اور برطانوی سپاہی جس کا نام مجھے معلوم نہ تھا۔ اب پہلی بار مجھے اور میرے ساتھیوں کو احساس ہوا کہ جرمن کس قدر ہوشیار اور چوکنّے ہیں۔ اور ان جرمن فوجیوں کو فریب دینا آسان کام نہیں، سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا پڑے گا۔

مَیں نے اپنے ساتھی چارلس کلے سے اس صورتِ حال کا ذکر کیا۔ چارلس کلے رائفل بریگیڈ سے تعلّق رکھنے والا نہایت جری اور طاقت ور نوجوان تھا وہ بار بار نفرت سے اپنی مُٹھیاں بھینچتا اور کہتا: "خدا ان جرمنوں کو غارت کرے۔ نہ جانے ہمیں کب تک چلاتے رہیں گے۔" چارلس نے چند لمحے غور کیا پھر چپکے سے کہنے لگا۔

"فکر مت کرو، مَیں جلد ہی کوئی تدبیر سوچتا ہوں۔ تم اِن راستوں کو غور سے دیکھتے رہو۔ ہمیں اِن کا نقشہ اپنے ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ کمپاس میری جیب میں ہے تمہارے پاس کیا کچھ ہے؟"

خشک گوشت کے دو چھوٹے ڈبے، ایک درجن بسکٹ، پنیر کے چند ٹکڑے چار سو فرانک نقد جو جرمن لیڈروں کی دست برد سے نہ جانے کیسے بچ گئے تھے، برانڈی کی بوتل اور ایک کمبل، یہ تھی ہماری کُل کائنات، ہسڈن سے دو میل دور سڑک یکایک ایک گھنے جنگل میں داخل ہوگئی۔ جنگل دیکھتے ہی ہمارے حوصلے بلند ہوگئے۔

چارلس نے میرے کان میں کہا:

"خدا کی قسم، اگر اب بھی ہم نے فائدہ نہ اُٹھایا، تو ساری زندگی پچھتانا پڑے گا۔"

یہ کہہ کر اُس نے اِرد گرد دیکھا۔ قیدی لڑکھڑاتے قدموں سے چلے جا رہے تھے، کوئی کسی سے بات نہ کرتا تھا۔ سب اپنی اپنی جگہ سوچ میں گم تھے۔

"کچھ سوچو . . . . کچھ کرو . . . . یہ سنہری موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا"

چارلس کی لرزتی ہوئی آواز مجھے سُنائی دی۔ "فکر نہ کرو۔ کسی طرح اِن کے نرغے سے نکل جاؤ۔"

دفعتہً ایک انوکھی تدبیر میرے ذہن میں آئی۔ مَیں نے اپنے پیچھے چلتے ہوئے رچرڈ وڈ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ مسکراہٹ اُس کے لبوں پر نمودار ہوئی۔ وہ میرا مفہوم سمجھ گیا۔ زخمی ہونے کے باوجود وہ مسلسل ہمارا ساتھ دے رہا تھا۔ مَیں نے اس سے کہا:

"دیکھو رچرڈ، تمہاری ذرا سی مدد سے ہماری مشکل حل ہو جائے گی۔ تم زخمی ہو . . . . جوں ہی تم محسوس کرو کہ اگلے قیدیوں کا گروپ جنگل میں داخل ہو رہا ہے، چیخ مار کر زمین پر گر جانا . . . . . . سمجھ گئے؟ جرمن تمہاری طرف متوجہ ہو جائیں گے . . . . . . بس اتنا ہی کام ہے۔ بولو کرو گے؟"

اُس نے گردن ہلائی۔ مَیں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور ہم دونوں قطار کے اگلے حصّے میں پہنچ گئے۔ آنے والے لمحات کے خیال سے میرا دل دھڑک رہا تھا۔ مَیں نے محسوس کیا کہ چارلس کا چہرہ شدّتِ جذبات سے سُرخ ہو رہا ہے۔ جونہی قیدی جنگل میں داخل ہوئے۔ مَیں نے مُڑ کر رچرڈ کی طرف دیکھا۔ وہ لڑکھڑایا،

اُس کے حلق سے چیخ نکلی اور زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ اِس کے گرتے ہی قریب سے گزرتے ہوئے جرمن محافظ رُک گئے۔ چند لمحوں کے لئے قیدیوں نے گردنیں موڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا، کچھ ہلچل مچی، ابتری سی پھیلی اور دوسرے ہی لمحے ہم تیر کی طرح قطار سے نکل کر اندھا دھند دوڑتے ہوئے چالیس فٹ کے فاصلے پر ایک گڑھے میں کود گئے۔

"یہاں ٹھہرنا خطرناک ہے۔" چارلس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "جنگل کے گھنے حصّے کی طرف نکل چلو، ممکن ہے وہ ہماری تلاش میں اِدھر آئیں۔"

"میرا خیال ہے ابھی یہیں دبکے رہنا چاہیئے۔ کسی جرمن محافظ نے ہمیں بھاگتے ہوئے نہیں دیکھا، تاہم احتیاط ضروری ہے۔"

ہم دونوں بندروں کی طرح ہاتھ پاؤں کے بل چلتے ہوئے خندق سے نکلے اور جنوب کی طرف بھاگ اُٹھے۔ اب سڑک ہم سے اندازاً تین سَو گز دُور تھی اور جرمن محافظوں کے چیخنے چلّانے کی آوازیں صاف سُنائی دے رہی تھیں۔ چند لمحوں تک ہم دھڑکتے دلوں سے یہ آوازیں سنتے رہے۔ وہ قیدیوں کو آگے بڑھنے کا حکم دے رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد قیدیوں کی لمبی قطار ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ اپنے سامان کی جانچ پڑتال کی اور گھنے جنگل میں تیزی سے چلنے لگے۔

توقع کے برعکس اتنی جلد آزاد ہو جانے کی جو مُسرت ہمیں حاصل ہوئی، اُس نے ساری تھکن دُور کر کے ہمارے جسموں میں بجلی سی بھر دی۔ شاہ بلوط کے درختوں کے گھنے جھنڈ میں ہم رُکے اور خرگوشوں کی طرح ایک طرف دبک گئے۔ ابھی دن کا بڑا حصّہ باقی تھا۔ طے پایا کہ رات کو سفر کریں گے اور دن کو کہیں چھپ جائیں گے۔

ایک دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد سب سے پہلے ہم نے اپنا حُلیہ درست کرنے کی تدبیر کی۔ چارلس کے پاس اُسترا نکل آیا۔ اس سے ہم نے کئی روز کی بڑھی ہوئی داڑھیاں بنائیں۔ اِدھر اُدھر پانی تلاش کیا۔ تو ایک جگہ چھوٹا سا برساتی نالہ دکھائی دیا۔ جس کی

تھہ میں پانی موجود تھا۔ یہاں پیاس بجھائی، ہاتھ پیر دھوئے اور تازہ دم ہو گئے۔ اب ہم نے اپنے سامان کا جائزہ لیا۔ ٹین کے ان ڈبّوں میں سے جن کی پالش رات کے اندھیرے میں نظر آسکتی تھی چیزیں نکال کر جیبوں میں بھریں اور ڈبّے گڑھا کھود کر دبا دیئے۔ کپڑے کا ایک فالتو تھیلا بھی ضائع کرنا پڑا۔ خوراک اتنی تھی کہ احتیاط سے استعمال کرتے تو کئی دن کے لیے سہارا ہو جاتا۔ تاہم اُمید تھی کہ فرانسیسی کسانوں یا کسی اور ذریعے سے کھانے پینے کی چیزیں حاصل کر لیں گے۔ پانچ گھنٹے سونے کے بعد جب ہم بیدار ہوئے تو شام کا اندھیرا تیزی سے پھیل رہا تھا اور درختوں پر بسیرا کرنے والے پرندے واپس آ رہے تھے۔ یہ تو ظاہر تھا کہ یہاں دیر تک ہمارا قیام ٹھیک نہیں، کیونکہ مختلف راستوں پر ہم نے فوجی گاڑیوں کے پہیّوں کے نشان بھی دیکھے۔ عین ممکن تھا کہ ادھر سے گزرتے ہوئے جرمن ہمیں دیکھ لیتے اور ہم دوبارہ دھر لیے جاتے۔ سورج ڈھلنے سے کچھ دیر پہلے ہم خدا کا نام لے کر ایک طرف چل پڑے۔ کئی مرتبہ چلتے چلتے دائیں بائیں پُراسرار سی آوازیں سنائی دیں، جیسے کوئی دبے پاؤں ہمارا تعاقب کر رہا ہو۔ ہم فوراً کسی جھاڑی کے اندر گھس کر سانس روک لیتے اور دیر تک بیٹھے رہتے۔ یہ بات ہمیں بعد میں معلوم ہوئی کہ ہماری طرح اُس روز کئی اور برطانوی قیدی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

اور وہ بھی جنگل میں چھپے ہوئے تھے۔ ہم ایک دوسرے کی آہٹ سے ڈر جاتے اور سمجھتے کہ جرمن ہماری تلاش میں پھر رہے ہیں۔ میرے ذہن میں بار بار جرمن افسر کا فقرہ گونج رہا تھا:

"یہاں سے بھاگنے کی کوشش فضول ہے۔ ہم بھاگنے والوں کو جہنّم سے سے بھی کھینچ لائیں گے۔"

پتّا بھی کھڑکتا، تو دل دہل جاتے۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے، رات کی تاریکی میں ہم آگے بڑھتے گئے اور جنوب کی طرف ایک بلند پہاڑی ٹیلے تک کسی مصیبت کا سامنا کئے بغیر پہنچ گئے۔ یہاں کچھ ایسے آثار نظر آئے جن سے شبہہ ہوا

کہ جرمنوں نے ان پہاڑی ٹیلوں کے پیچھے اپنے خفیہ ٹھکانے بنا رکھے ہیں۔ لہٰذا ادھر جانا خطرناک تھا۔ جنگل بہر حال ہمیں پناہ تو دے سکتا تھا، چنانچہ ہم نے مغرب کی طرف جانے کا فیصلہ کیا اور نہ جانے کتنی کھائیوں، خندقوں اور جھاڑ جھنکار کو عبور کرتے ہوئے ایک ایسے مقام پر جا نکلے جہاں یقیناً برسوں سے کسی انسان نے قدم نہ رکھا ہوگا۔

رات کا بقیہ حصہ ایک کھائی کے اندر گزارا۔ یہاں سانپوں اور زہریلے کیڑے مکوڑوں کا خطرہ تھا۔ لیکن ہم نے جرمنوں کے ہاتھوں عذاب سہنے کے بجائے یہ خطرہ مول لینا مناسب سمجھا۔ خیر گزری کہ کسی سانپ یا بچھو نے ڈسنے کی کوشش نہیں کی اور ہم صبح تک بے خبر سوتے رہے۔ آنکھ کھلی، تو بھوک کا احساس ہوا، ہم نے بسکٹ نکالے اور کھانے لگے، ابھی منہ چلا ہی رہے تھے کہ بالکل قریب آہٹ ہوئی جیسے کوئی شخص فوجی بوٹ پہنے خشک پتوں اور شاخوں پر چل رہا ہو۔ یہ آواز سن کر دہشت سے ہماری گھگھی بندھ گئی اور منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ہم دونوں کے ذہن میں ایک ہی خیال آیا۔ شاید جرمن ہماری تلاش میں یہاں تک آن پہنچے۔ بھاگنے کا موقع نہ تھا۔ ہم بے حس و حرکت وہیں پڑے رہے۔ چند لمحے بعد جوتوں کی آواز اور قریب سے آئی جیسے کوئی کھائی کے اندر کودا ہو۔ میری روح کھنچ کر حلق میں آگئی اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ دفعتہً کسی نے شستہ انگریزی میں کہا:

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں پریشان کیا، لیکن خوش قسمتی سے میں بھی تمہاری طرح بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ تم یہیں کہیں چھپے ہوئے ہو۔"

ہم نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ہمارے سامنے ڈِک پیگ نامی برطانوی توپچی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ ہمارے قریب بیٹھ گیا۔ اس کی وردی پھٹی ہوئی، چہرہ اور جسم خاک و خون میں اٹا ہوا تھا۔ لیکن آزاد ہو جانے کی بے پایاں مسرت کا اظہار اس

کی ایک ایک حرکت سے ہوتا تھا۔

اس نے ہنستے ہوئے کہا:

"میں نہایت شکرگزار ہوں۔ میں تو اپنے آپ کو جرمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ چکا تھا۔ تمہیں نکلتے دیکھ کر میری غیرت نے للکارا اور میں سوچے سمجھے بغیر بھاگ نکلا، اب بتاؤ تمہارا اگلا پروگرام کیا ہے؟"

وہ اس بے پروائی اور اطمینان سے باتیں کر رہا تھا جیسے ہم اس جنگل میں سیر و تفریح کے لئے آئے ہیں اور ہمیں کوئی غم یا فکر نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس لمبے تڑنگے برطانوی افسر کے آجانے سے ہمیں بڑی تقویت ملی۔ میری اُس سے معمولی سی شناسائی تھی۔ البتہ بعض دوستوں کی زبانی اس کی بہادری، موقع شناسی اور جرأت کی داستانیں سن چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے ڈک ہمارے لئے فرشتۂ رحمت بنا کر بھیج دیا ہے۔

اُس نے بے تکلفی سے چند بسکٹ اٹھائے اور منہ میں ڈال لئے پھر وہ وہیں ایک طرف لیٹ گیا اور بولا:

"دوستو، رات بھر کا تھکا ہوا ہوں، کچھ دیر سونا چاہتا ہوں۔ امید ہے آپ لوگوں کو ناگوار نہ ہوگا"

یہ کہتے ہی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور چند لمحے کے بعد وہ واقعی خرّاٹے لینے لگا۔

"عجیب آدمی ہے۔ کم بخت نے میری جان ہی نکال لی تھی ـ" چارلس نے کہا۔

"چلو اچھا ہوا، ہمیں ایک ساتھی اور مل گیا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ہمارے لئے نہایت مفید ثابت ہوگا۔"

وہ سہ پہر کو اٹھا، اپنی جیبوں سے نہ جانے کیا کیا چیزیں نکالیں گھڑی، پنسل، ڈائری کچھ سکّے، کچھ نوٹ، ماچس کی ایک ڈبیا اور تار کاٹنے کا ایک چھوٹا سا

پلاس، نہ جانے پلاس جیسی خطرناک چیز اُس نے جرمنوں کی عقابی نگاہ سے کیونکر چھپائی ہوگی۔ یہ چیزیں ہمارے سپرد کر کے وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا، اور مخصوص انداز میں کہنے لگا:

"دیکھو یارو، غم مت کھاؤ۔ یہاں سے رفو چکر ہونے کی کوشش کرو، جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے کوٹ کی کسی خفیہ جیب سے کاغذ کا ایک پُرزہ نکالا، اس پر پنسل سے نقشہ بنایا ہوا تھا۔

"یہ نقشہ اِس علاقے کا ہے اور مَیں نے حافظے کی مدد سے بنایا ہے۔" اُس نے بتایا:

"یہ رہا ایٹلپیز، یہ ہیسڈن اور یہ ڈولنز۔ ان اطراف میں ظاہر ہے کہ ہم نہیں جا سکتے۔ یہاں جرمنوں کے اڈّے ہیں۔ صرف جنوب کا علاقہ ایسا ہے۔ جو ہمیں پناہ دے سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہم احتیاط سے کام لیں اور سوچ سمجھ کر نقل و حرکت کریں۔ اب مَیں ذرا اِرد گرد کا علاقہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ تاکہ کوئی مناسب راستہ اختیار کیا جائے آپ لوگ میری واپسی تک یہیں قیام کریں، تو مناسب ہوگا۔"

چلتے چلتے اس نے مجھ سے چند بسکٹ چھینے اور سیٹی پر کسی گانے کی دُھن بجاتا ہوا چلا گیا۔

"مجھے تو یہ پاگل معلوم ہوتا ہے۔ کسی آفت میں نہ پھنسوا دے۔" چارلس نے حیرت سے کہا: "ذرا اس کی بے پروائی اور بے نیازی تو دیکھو۔ بخدا، مَیں یہ سوچ سوچ کر لرز رہا ہوں کہ جرمنوں نے ہمیں دوبارہ پکڑ لیا۔ تو ہمارا کیا حشر ہوگا اور یہ شخص کس اطمینان سے سیٹی بجاتا ہوا جا رہا ہے۔"

"بھئی سچ پوچھو، تو مجھے اب جرمنوں کا ڈر نہیں رہا ہے۔ مَیں نے ڈِک پیگ کے اتنے قصّے سُنے ہیں کہ عقل حیران ہے۔ وہ نہایت ہوشیار اور بیدار مغز آدمی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے ضرور کوئی انوکھی تدبیر سوچ لی ہوگی۔"

ہم دیر تک اس کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ سورج غروب ہونے کے تھوڑی دیر بعد وہ دفعتہً ہماری پُشت پر کسی چالاک درندے کی طرح دبے پاؤں چلتا ہوا نمودار ہوا۔ اس نے اپنے بھاری جُوتے ایک ڈوری میں لپیٹ کر کندھے سے لٹکا رکھے تھے اور ان کی جگہ ربڑ کے بالکل نئے جوتے پہنے ہوئے تھا یہی وجہ تھی کہ ہم نے اس کی آہٹ نہ سُنی۔

"کہو، کیا خبر لائے؟" چارلس نے بے چین ہو کر پُوچھا۔

"خبر یہ ہے کہ عنقریب جرمن ہماری تلاش میں آنے والے ہیں۔" اس نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن ہم اس سے پہلے رفوچکر ہو جائیں گے۔"

"پورا قصّہ سناؤ۔" ہم دونوں نے بدحواس ہو کر بیک زبان پوچھا۔

"جب میں یہاں سے گیا۔ تو ایک میل دُور شمال کی طرف میں نے دو جرمن سپاہیوں کو دیکھا۔ وہ تیزی سے ایک طرف جا رہے تھے۔ میں بھی ان کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ دراصل جرمنوں نے درمیانی پہاڑی پر طیارہ شکن توپیں نصب کر رکھی ہیں اور وہاں سپاہیوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ غالباً یہ دونوں سپاہی قیدیوں کے نکل بھاگنے کی خبر لے کر جا رہے تھے۔ راستے میں وہ ایک چشمے پر پانی پینے اور سستانے کے لئے بیٹھ گئے۔ کم بختوں نے اپنی رائفلیں کندھوں سے نہیں اتاریں، ورنہ بڑی آسانی سے میں اُن پر قبضہ کر سکتا تھا۔ بہر حال ربڑ کے یہ جوتے میرے ہاتھ لگ گئے اور میں اِدھر بھاگ آیا۔ چلو، اب یہاں سے چلنے کی فکر کرو۔"

رات بے حد تاریک تھی اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ہم ڈِک کی رہنمائی میں اندھوں کی طرح جنوب کی طرف چلنے لگے۔ اس پرہول سنّاٹے میں ہمارے حواس نہایت تیز ہو گئے تھے۔ بار بار کچھ ایسی آوازیں آتیں جن سے شبہ ہوتا کہ جرمن ہمارے تعاقب میں آ رہے ہیں، لیکن رفتہ رفتہ ہماری آنکھیں اس اندھیرے سے مانوس ہو گئیں اور ہم ٹھوکریں کھانے کے بجائے دیکھ بھال کر آگے بڑھنے کے

قابل ہو گئے۔ کبھی کبھی گیدڑ یا جنگلی خرگوش ہمارے دائیں بائیں بھاگتے ہوئے غائب ہو جاتے۔ ان جانوروں نے ہمیں بہت ڈرایا، ذرا سی آہٹ پر ہم جھاڑیوں کی طرف لپکتے۔ مگر اپنی بدحواسی پر نادم ہو کر ہنسنے لگتے۔ ڈک بندروں کی طرح اُچھلتا کودتا مسلسل آگے بڑھ رہا تھا اور ہم دونوں اس کے پیچھے پیچھے ہانپتے کانپتے چلے جا رہے تھے۔ دفعتہً چارلس کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ لرزتی ہوئی آواز میں کہنے لگا:

"زمین پر لیٹ جاؤ۔ سامنے یقیناً جرمن کھڑے ہیں"

مَیں نے نظر اُٹھا کر دیکھا، کچھ فاصلے پر واقعی دھندلے دھندلے نقوش اُبھر رہے تھے۔ ڈک ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا، اور یہ ایسا موقع نہ تھا کہ ہم اُسے آواز دے کر خبردار کر سکتے۔ لیکن جب ہم نے غور سے دیکھا، تو معلوم ہوا کہ یہ جرمن نہیں، بلکہ انسانی قدو قامت کے برابر جنگلی پودے ہیں، جنہیں ہمارے اندرونی خوف نے جرمن سپاہی بنا کر کھڑا کر دیا ہے۔ اپنی اس حماقت پر بڑی شرم آئی۔ آگے ڈک ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی بولا:

"تم لوگ اگر اِسی طرح خوف کھاتے رہے، تو مجھے بھی کسی مصیبت میں مبتلا کر دو گے۔ بس تھوڑا سا سفر اور ہے، پھر کہیں آرام کریں گے۔"

ہمیں معلوم تھا کہ فرانس کے ان تمام حصّوں میں جن پر نازی فوجیں قبضہ کر چکی ہیں، صبح دس بجے سے لے کر رات نو بجے تک کرفیو لگایا جاتا ہے — اور خلاف ورزی کرنے والوں کو گولی سے اڑا دیا جاتا ہے۔ جرمن گاڑیاں قصبوں اور دیہاتوں میں مسلسل گشت کرتی رہتی ہیں، باغوں اور پارکوں کے گرد خاردار تاروں کی اونچی اونچی باڑیں بھی لگا دی گئی ہیں اور ان کی سختی سے نگرانی کی جاتی ہے لیکن ان تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود علاقہ جس میں ہم گھوم رہے تھے، نازیوں کی دست بُرد سے ابھی تک آزاد تھا اور اس کی وجہ محض یہ گھنا اور دشوار گزار جنگل تھا۔

ہم نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ معلوم ہوا کہ ہمبڈن کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ کیونکہ جرمن فوجی ٹرکوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ بتیوں کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں اور کبھی کبھی انجنوں کی آوازیں بھی سناٹے کو چیرتی ہوئی ہمارے کانوں تک پہنچ جاتی تھیں۔

رات کے دو بج رہے تھے اور تھکن کے باعث ہمارے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ میں نڈھال ہو کر بیٹھ گیا۔ مجبوراً ڈِک کو بھی ٹھہرنا پڑا۔

"بھئی اب نہیں چلا جاتا۔ تھکن اور نیند کے مارے بُرا حال ہے۔ تھوڑی دیر آرام کر لیں، پھر چلیں گے۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"آرام ہی کرنا تھا۔ تو بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔" ڈِک نے ناراض ہو کر کہا۔ "یہاں ٹھہرنا خطرناک ہے، بہرحال پانچ منٹ کی مہلت دے سکتا ہوں۔"

ٹھیک پانچ منٹ بعد ڈِک نے چلنے کا حکم دیا۔ ہم نے تعمیل کی، لیکن حال یہ تھا کہ آنکھیں آپ ہی آپ بند ہوئی جاتی تھیں۔ پیر سَو سَو من کے ہو گئے تھے۔ قدم رکھتے کہیں تھے اور جاتے کہیں۔ اس وقت مجھے پتا چلا کہ رُکے بغیر مسلسل چلنے کی جو سزا امریکہ میں بعض مجرموں کو دی جاتی ہے۔ اُس سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ یہ عذاب حقیقتاً ناقابلِ برداشت تھا۔ میرا ذہن اس وقت ماؤف ہو چکا تھا۔ یہ بھی یاد نہ تھا کہ میں کہاں ہوں، میرا نام کیا ہے اور کس لیے یہاں گھوم رہا ہوں۔

میں کہہ نہیں سکتا کہ چارلس کی حالت کیا تھی۔ اتنا ضرور احساس تھا کہ وہ دل ہی دل میں ڈِک کو گالیاں دے رہا ہو گا۔ لیکن ڈِک کی کیفیت یہ تھی کہ بار بار ہم دونوں کو سنبھالتا، بُرا بھلا کہتا، دھکے دیتا مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ کمپاس سے راستے کا اندازہ کرتا، چند لمحے سوچتا اور پھر نئے رُخ سے چلنے لگتا۔

تین بج رہے تھے کہ ہم ایک بستی کے نواح میں پہنچ گئے۔ یہ بستی پہاڑی کے دامن میں آباد تھی۔ مشرق کی طرف سے پَو پھٹنے کے آثار نمودار ہو رہے تھے

اور جنگلی پرندوں کی آوازیں ہمارے سروں پر ہتھوڑوں کی مانند برس رہی تھیں۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ پناہ کہاں لیں؟ جس جگہ ہم کھڑے تھے، وہاں سے سڑک سو گز دُور تھی اور قریب ترین مکان پچاس ساٹھ گز دُور ہوگا۔ گاؤں کے مشرقی حصّے میں ایک نشیبی میدان تھا جہاں خشک گھاس کے دو بڑے اونچے ڈھیر لگے ہوتے تھے۔

"کیوں نہ اس گھاس کو اپنا گھر بنایا جائے؟" ڈِک کی آواز سنائی دی مصیبت یہ ہے کہ یہاں پانی بھی نہیں ملے گا۔ اور دن کے وقت نکل بھی نہ سکیں گے۔ بہرحال دن نکلنے سے پہلے پہلے ہمیں اس میں چھپ جانا چاہیئے۔"

ہم نے جلد جلد گھاس کے ایک ڈھیر کو کھود کر جگہ بنائی، اس کے اندر کمبل اور کوٹ اتار کر بچھائے اور لیٹ گئے۔ رات بھر جنگل میں پھرنے اور اس میں بھٹکنے سے جو ٹھنڈ ہماری ہڈیوں میں سرایت کر گئی تھی، وہ گھاس کی گرمی نے زائل کر دی اور چند لمحے بعد ہم بے خبر سو رہے تھے۔ ابھی بمشکل دو گھنٹے ہی ہوئے ہوں گے کہ ایک عجیب زنّاٹے دار آواز سے ہماری آنکھ کھُل گئی ۔ یہ آواز مدھم ہو جاتی کبھی بہت تیز۔ کبھی دُور سے آتی اور کبھی بالکل قریب، گھاس کے عین اُوپر سے ۔ ہمارے دل خوف سے دھڑکنے لگے۔ ڈِک نے گھاس کے ڈھیر سے سر نکال کر دیکھا اور ہمیں ڈرانے کے لئے کہنے لگا۔

"ایک چھوٹا سا جرمن ہوائی جہاز ہم جیسے بھگوڑوں کی تلاش میں اُڑ رہا ہے۔"

ابھی اس نے یہ جملہ ادا ہی کیا تھا۔ کہ جہاز نے غوطہ لگایا اور گرجتا ہوا ہمارے اُوپر سے گزر گیا۔

"خدا کے لئے یہاں سے نکل چلو،" چارلس نے سہم کر کہا۔ "انہیں شبہ ہو گیا ہے کہ یہاں کوئی چھپا ہوا ہے۔"

"بس ڈر گئے!" ڈِک نے ہنس کر کہا اور وہ چھوٹا سا سوراخ بند کر دیا۔ جو

اُس نے طیّارہ دیکھنے کے لئے بنایا تھا،
فرض کرو، انہیں پتا چل گیا ہو، تب بھی یہاں پہنچنے کے لئے اُنہیں بڑا وقت چاہیئے۔ اتنے میں ہم کہیں سے کہیں جا چکے ہوں گے۔ میرا اندازہ ہے کہ طیّارے کی یہ پرواز معمول کے مطابق ہوگی۔ اس لئے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اچھا، مَیں تو سوچکا۔ تم لوگ بے خوف وخطر نیند کے مزے لوٹو۔ مَیں ذرا باہر نکل کر تازہ آکسیجن سے اپنا پیٹ بھرلوں۔ میری واپسی تک خبردار یہاں سے نکلنے کا تصوّر بھی نہ کرنا۔"

چند منٹ بعد جب طیّارے کی آواز آنی بند ہوگئی، تو ڈِک نے گھاس میں سے سر باہر نکالا اور ہمیں حیران پریشان چھوڑ کر نہایت اطمینان سے اُس مکان کی طرف چلنے لگا۔ جو ڈھیر میں سے صاف نظر آرہا تھا۔

"عجیب مسخرا ہے۔" چارلس نے میری طرف دیکھ کر کہا، "لیکن اس میں شک نہیں کہ ہے بہت ہوشیار، بہرحال مَیں تو ذہنی طور پر اپنے آپ کو اس کا بند قیدی دام محسوس کرتے لگا ہوں . . . ."

"یہی حال میرا ہے۔" مَیں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اچھا۔ اب جلدی سے اپنی نیند پوری کرلو۔ ورنہ بعد میں سونے نہ دے گا۔"

٭ ٭ ٭

بیس منٹ بعد ہی وہ واپس آگیا۔ اور دو ہتڑ مار مار کر ہمیں اٹھا دیا۔

"یارو، قسمت ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔" اُس نے اپنے خاص انداز میں کہنا شروع کیا۔ "مَیں یہاں سے نکلا، سامنے ایک پُر فضا باغ نظر آیا۔ اس باغ کے قریب ایک بڈّھے کسان سے ملاقات ہوئی۔ وہ چاک پر برتن بنا رہا تھا۔ مَیں نے ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں اُسے سارا ماجرا سنایا۔ بڈھا غور سے سُنتا رہا۔ پھر اس نے لمبی تقریر کی۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس گاؤں کا نام ڈال ہے، اور ہسڈن یہاں سے دس میل دُور ہے۔ گاؤں میں اسّی نوّے گھر ہیں اور آبادی چار

سو افراد پر مشتمل ہے۔ جرمن سپاہی گاؤں کے اندر کبھی نہیں آتے۔ البتہ ہر روز دو مرتبہ ایک جرمن سپاہی موٹر سائیکل پر کھانے پینے کی چیزیں لے جاتا ہے۔ یہ سپاہی گاؤں میں آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں ٹھہرتا۔ گھاس کے ڈھیر، جن میں ہم چھپے ہوئے ہیں، محفوظ نہیں۔ بڈھا کسان ہمیں چھپنے کے لئے اپنا ایک کھتّا دینے پر تیار ہے لہٰذا اِسی وقت وہاں چلنا ہو گا۔ چلو، اٹھو، اپنی چیزیں سمیٹو۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔"

پندرہ منٹ بعد ہم اس کھتّے میں کھڑے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نہایت محفوظ اور آرام دہ جگہ تھی۔ اس کے مختلف حصّے تھے۔ کہیں اناج بھرا ہوا تھا اور کہیں مویشیوں کے لئے چارہ۔ ہم نے گھاس کو اس ترتیب سے رکھا کہ خطرے کے وقت چند سیکنڈ کے اندر اندر اس میں چھپ سکیں۔ اس کے علاوہ کھتّے کی دیواروں میں ہم نے ایسے سوراخ ڈھونڈ لئے جہاں سے بڑی سڑک اور وہ راستہ دیکھا جا سکتا تھا۔ جو کھتّے کی طرف آتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد فرانسیسی کسان ڈِک کے ہمراہ آیا۔ اس کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ ہو گی۔ اس نے معذرت بھرے انداز میں جلدی جلدی کچھ کہا جس کا مفہوم ہمارے پلّے یہ پڑا کہ وہ اس سے زیادہ ہماری مدد نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ خود پناہ گزین ہے۔ اور ردبیکس سے اجڑ کر یہاں آیا ہے۔ ردبیکس فرانس کا وہ علاقہ ہے جہاں نازی جرمنی نے سب سے پہلے حملہ کیا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ خوراک کے علاوہ ضرورت کی جو چیزیں اُسے مل سکیں، مہیّا کرے گا۔ چنانچہ دوپہر سے پہلے پہلے اُس نے ہمارے لئے تازہ روٹی، پنیر، انڈے، چاکلیٹ، چند برتن، ریزر بلیڈ، صابن اور تولیے بھیج دیئے۔ بعد ازاں دودھ کی ایک بوتل اور اس علاقے کا ایک نقشہ بھی مہیّا کر دیا۔ جس کی ہمیں اشد ضرورت تھی۔ یہ نقشہ ریلوے اور ادمنی بس ٹائم ٹیبل کی پشت پر چھپا ہوا تھا۔ اور ایک انچ مساوی سولہ کیلومیٹر کے حساب سے تیار کیا گیا تھا۔ اس میں صرف ریلوے سٹیشن

اور بڑی بڑی سڑکوں کی نشاندہی تفصیل سے درج تھی۔ البتہ جنگلوں، پہاڑوں، اور دریاؤں کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ ان خامیوں کے باوجود یہ ہمارے لئے بے حد مفید ثابت ہوا۔

اُس روز کئی ہفتے بعد ہمیں گرم پانی سے نہانے کا موقع ملا۔ پیٹ بھر کر تازہ اور لذیذ غذا کھانے کو ملی، ہمارے ہوش ٹھکانے آئے، تو اطمینان سے آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے بیٹھے۔ نقشہ سامنے رکھ کر غور کیا اور بچاؤ کی جو ممکن صورت نظر آئی، وہ یہ تھی کہ ہم والکس سے پہلے مشرق کی طرف اور شمال میں اراس اور دُوائی کی طرف روانہ ہوں، ہماری آخری معلومات کے مطابق یہ دونوں مقامات یقیناً برطانیہ اور بلجیم کی فوجوں کے قبضے میں تھے۔ اِن دونوں شہروں کا درمیانی علاقہ نازیوں کے پاس تھا اور یہاں انہوں نے بڑی تعداد میں ٹینک جمع کر رکھے تھے۔ والکس سے شمال مشرق کی طرف اراس ۴۰ میل دور تھا۔ اتحادی فوجوں کے لئے اس پر قابض رہنا اس لئے بھی ضروری تھا کہ اس طرح ڈنکرک اور اوسٹینڈ جیسی اہم بندرگاہوں کی حفاظت کی جاسکتی تھی۔ اراس کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد نازی فوجوں کی یلغار کو روکنا ناممکن تھا۔ ڈک جنرل ہیڈ کوارٹر میں رہ چکا تھا۔ اس لئے اسے یقین تھا کہ اگر ایک مرتبہ ہم اراس پہنچ جانے میں کامیاب ہوگئے، تو آسانی سے اپنے ساتھیوں سے جا ملیں گے۔ لیکن اس راہ میں کئی رکاوٹیں ایسی تھیں، جنہیں عبور کرنا جان پر کھیل جانے کے مترادف تھا۔ اراس تک پہنچنے کے لئے ہمیں ان تمام راستوں سے گزرنا پڑتا تھا، جن پر جرمنوں کی آمدورفت تھی، پھر کئی پُلوں پر اُنہی کا قبضہ تھا۔ پُلوں کو عبور کرنے کے بعد ہمیں میدانِ جنگ سے گزرنا تھا۔ عین ممکن تھا کہ میدانِ جنگ میں پہنچ کر یا تو جرمنوں کے ہاتھوں مارے جائیں یا اتحادی فوجی ہمیں جاسوس سمجھ کر گولی کا نشانہ بنا دیں۔ ان تمام خدشوں کے علاوہ ہمیں پچاس میل کا سفر طے کرنا تھا۔ اگر اراس بھی جرمنوں کے قبضے میں چلا گیا ہو، تو یہ فاصلہ سو میل ہو جاتا ہے۔ پھر گسٹاپو اور جرمن

پولیس کے آدمیوں سے بھی قدم قدم پر سابقہ پڑسکتا ہے۔

چارلس کی رائے تھی کہ اگر ہم ایبی وائل کے مقام پر دریائے سومی کو عبور کرنے میں کامیاب ہوجائیں، تو بیڑا پار ہوسکتا ہے اور ممکن ہے کہ اُس کے دونوں کنارے ابھی تک فرانسیسی فوج کے قبضے میں ہوں۔ سومی تک پہنچنے میں اگرچہ اتنی رکاوٹیں نہ تھیں، جتنی اراس تک پہنچنے میں پیش آسکتی تھیں، لیکن اس پر عمل کرنے کے لیئے ضروری تھا کہ فرانسیسی فوج کی نقل وحرکت کی صحیح اور تازہ اطلاعات موجود ہوں۔

تیسرا راستہ بھی ہمارے سامنے آیا، اور وہ تھا سمندر۔ نقشہ ظاہر کرتا تھا کہ دریائے سومی اور ادتھائی کی قریبی بستیوں اور آبادیوں تک اگر ہم پہنچ سکیں، تو وہاں سے کشتی حاصل کرسکتے ہیں۔ کشتی مل جائے، تو کمپاس سے سمت کا تعین کرکے انگلستان کے سامنے تک پہنچ جانا مشکل نہ ہوگا۔ ایک مرتبہ کھلے سمندر میں پہنچ جانے کے بعد کوئی بھی برطانوی جہاز ہمیں پناہ دے سکتا تھا۔ کافی غور وخوض کے بعد فیصلہ ہوا کہ تیسرا راستہ مناسب رہے گا۔

رات کو ساڑھے دس بجے ہم وہاں سے رخصت ہوئے۔ ہمارا ارادہ لی پونشیل کے قریب دریائے ادتھائی کو عبور کرنے کا تھا اور یہی اس کڑی مہم کی پہلی منزل تھی۔ اس دوران میں ہم نے اپنے میزبان سے معلوم کرلیا کہ لی پونشیل کے پُل پر کوئی حفاظتی دستہ مقرر نہیں ہے، البتہ ایک جرمن موٹر سائیکل پر سوار ہوکر رات کو کئی مرتبہ لی پونشیل کے پُل سے ایک اور پُل تک، جو کئی فرلانگ دُور واقع ہے، چکّر لگاتا رہتا ہے۔

بہرحال ہم نے خدا کو یاد کرکے گاؤں سے باہر قدم نکالا۔ ایک کتّے نے بھونک کر ہمیں رخصت کیا۔ رات کے پُرہول سنّاٹے میں کتّے کی آواز سے اِس قدر دہشت طاری ہوئی کہ بیان سے باہر۔

"یہ شگون کچھ اچھا نہیں،" چارلس نے دبی زبان سے کہا۔ "میرا دل کہتا ہے

کہ کوئی حادثہ پیش آئے گا۔"

"کیا کہا؟" ڈِک نے غصّے سے کہا۔ "میرے بھائی، تم کیوں ہمارے ساتھ چلے آئے؟ جاؤ وہیں کھتّے میں آرام کرو۔ مَیں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔"

"چلو، جانے دو، چارلس نے تو مذاق کیا تھا۔ تم بُرا مان گئے۔" مَیں نے کہا۔

سڑک بالکل سنسان پڑی تھی، لیکن ہم نے اس پر چلنا مناسب نہ سمجھا اور سڑک کے ساتھ ساتھ اُگی ہوئی لمبی گھاس میں سے گزرنے لگے۔ ایک گھنٹے بعد ہم لی پونشیں گاؤں کے نواحی حصّے میں کھڑے سوچ رہے تھے کہ اگلا قدم کیا ہوگا۔ والکس کے برعکس، یہ گاؤں خاصا بڑا تھا۔ تنگ گلیاں اور بازار دور تک پھیلے ہوتے تھے۔ کہیں کہیں سے گیدڑوں کے چیخنے چلّانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ دریا کی طرف سے سرد ہوا کے جھونکے بار بار چل رہے تھے۔ پُل ہماری نظروں کے سامنے تھا۔ لیکن اس کے قریب ایک جرمن فوجی ٹرک کھڑا تھا جسے دیکھ کر ہماری سِٹّی گم ہو گئی۔

"اِس ٹرک کے اندر جرمن سپاہی ضرور ہوں گے،" ڈِک نے کہا۔ "لیکن سردی کی وجہ سے وہ اپنے کمبلوں میں دُبک کر یقیناً سو رہے ہوں گے۔ تم دیکھتے ہو کہ اُنہوں نے ٹرک کے چاروں طرف کینوس ٹارپولین ڈال رکھی ہے۔ خدا سے دعا کرو کہ وہ واقعی سو رہے ہوں، پھر ہم آسانی سے پُل پار کر جائیں گے۔ تھوڑی دیر تک وہ منحوس موٹر سائیکل والا بھی آنے والا ہے — آؤ میرے ساتھ . . . ."

ہم سڑک پر چلنے لگے۔ یکایک ڈِک نے ہمارے پیروں پر خونیں نظر ڈالی، اور کہا:

"سخت بے وقوفوں سے پالا پڑا ہے، بھاری جوتے جو دھماکا پیدا کر رہے ہیں۔ کیا تم انہیں نہیں سن رہے؟ اتار دو انہیں۔"

واقعی یہ ہم سے حماقت ہوئی کہ پختہ سڑک پر بھاری فوجی جوتے پہن کر چل رہے تھے۔ ہم نے جلد جلد جوتے اتار کر ہاتھوں میں پکڑ لئے اور دبے پاؤں آگے بڑھے جب ہم ٹرک کے قریب پہنچے۔ تو ڈک کے اشارے سے ہم زمین پر لیٹ گئے اور رینگنے لگے۔ ٹرک کے اندر سے خراٹوں کی بھیانک آوازیں بلند ہو رہی تھیں ڈک نے کینوس کا پردہ اُٹھا کر اندر جھانکا، پھر ہمارے کان میں کہا:

"پانچ آدمی ہیں . . . . . . بے خبر سو رہے ہیں . . . . . . جلدی کرو . . . . پُل کی طرف بھاگو . . . . . میں تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔"

پُل ہم سے صرف سو گز دُور تھا۔ اور پانی بہنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ ہم دونوں پُل کی طرف دبے پاؤں دوڑنے لگے۔

میں نے مُڑ کر دیکھا، ڈک ہم سے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ دفعتاً اندھیرے میں ایک کرخت آواز گونجی۔

"ٹھہرو، کون ہو تم؟ ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔"

یہ آواز نہ تھی، پگھلا ہوا سیسہ تھا۔ جو ہمارے کانوں میں اُتر گیا۔ خون خشک ہو گیا۔ وہی جرمن آواز چند ثانیے بعد پھر سنائی دی۔ اس مرتبہ لہجہ اور سخت تھا۔

"کون ہو تم؟ کوڈ ورڈ بتاؤ، ورنہ میں فائر کر دوں گا۔"

میں نے اندازہ کیا کہ ہمارا اور اس کا درمیانی فاصلہ دس پندرہ گز سے زیادہ نہیں، بھاگنے کی کوشش لاحاصل ہے۔ اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینا چاہیئے مجھے ڈک کا خیال آیا، میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ وہ دکھائی نہ دیا۔ غالباً اس نے یہ آواز ضرور سُن لی ہو گی۔

ہم دونوں ہاتھ اٹھائے کھڑے تھے۔ سامنے سے برقی ٹارچ روشن ہوئی اور ہم نے ایک لمبے تڑنگے جرمن سپاہی کو دیکھا۔ جو اپنی رائفل سے نشانہ لئے آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے ٹارچ رائفل کی نال پر فٹ کر رکھی تھی۔ وہ ہم سے پانچ فٹ دُور ہی رُک گیا۔ روشنی ہمارے چہروں اور

جسم پر پھینک کر اچھی طرح جائزہ لیا۔ پھر کرخت جرمن زبان میں بولا:
"گاؤں سے آئے ہو؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس وقت کرفیو ہے۔"
"ہم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم ۔ ۔ ۔ ۔ ماہی گیر ۔ ۔ ۔ ۔" چارلس نے شکستہ جرمن زبان میں کہنا شروع کیا ہی تھا کہ وہ لمبے لمبے ڈگ بھر کر ہمارے بالکل قریب آگیا۔ اور جوتے کی دو تین ٹھوکریں اس زور سے چارلس کے ٹخنے پر ماریں کہ وہ بلبلا اٹھا۔

"اپنے منہ دوسری طرف کر لو۔" اس نے حکم دیا۔" ہاتھ اوپر ۔ ۔ ۔ ۔ سیدھے آگے چلو، ورنہ کھوپڑی اڑا دوں گا۔"

جرمن نے ٹارچ بجھا دی اور رائفل کی سنگین ہمارے سینے کی طرف بڑھا کر چلنے کا اشارہ کیا۔

عین اسی لمحے مَیں نے ڈِک کو دیکھا۔ وہ سڑک سے ہٹ کر گھاس میں دبکا ہوا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ گھاس میں سے نکلا اور چیتے کی پھرتی سے جرمن سپاہی کی طرف لپکا۔ فضا میں اچھل کر اس نے اپنی دونوں لاتیں اس زور سے اس کی پشت پر ماریں کہ جرمن لڑھکنیاں کھاتا ہوا کئی فٹ دُور جا گرا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس سے پیشتر کہ وہ دوبارہ اُٹھے۔ ہم تینوں بھوکے درندوں کی طرح اس جرمن سے لپٹ گئے۔ چند لمحوں بعد وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

"جلدی کرو، اسے اٹھا کر گھاس میں لے جاؤ۔ مَیں موٹر سائیکل کی آواز سن رہا ہوں۔ ٹرک میں سونے والے سپاہی اُٹھ جائیں گے، رائفل مجھے دے دو۔ جلدی کرو۔"

ڈِک نے رائفل سنبھالی اور کارتوسوں کی پیٹی اُتار کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

موٹر سائیکل کی پُر شور آواز سناٹے کو چیرتی ہوئی ہر آن قریب آ رہی تھی۔ پھر ہم نے اس کی اگلی بتّی بھی دیکھ لی، اور جرمن سپاہی کو اُٹھا کر ہانپتے کانپتے گھاس کے اندر گھس گئے۔ چارلس نے اس کا مُنہ سختی سے دبا رکھا تھا، کیونکہ خدشہ تھا کہ وہ ہوش

میں اگر شور نہ مچادے۔ یکایک میں نے اپنے دائیں شانے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ پلٹ کر دیکھا۔ تو ڈِک تھا۔ اس نے انگلی لبوں پر رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اور رائفل سے موٹر سائیکل پر آنے والے جرمن سپاہی کا نشانہ لینے لگا۔

موٹر سائیکل ٹرک سے گزر کر پل کی طرف آرہی تھی۔ ہم نے اس کی ہیڈ لائیٹس میں دیکھا کہ ٹرک میں سے کوئی محافظ باہر نہیں نکلا۔ شاید وہ موٹر سائیکل والے کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے اور یہ تو انہیں معلوم ہی تھا کہ پل پران کا ایک ساتھی ڈیوٹی دے رہا ہے۔ اس لیے وہ اٹھنے کی زحمت کیوں برداشت کرتے؟

ہم سے پچاس گز کے فاصلے پر موٹر سائیکل رک گئی۔ آنے والے نے موٹر سائیکل کی بتی بجھائی۔ اور اتر کر پل کی طرف بڑھا، پھر اس نے خاص انداز میں آواز دی۔

"فورٹی تھری ناٹ . . . . . فورٹی تھری ناٹ . . . . ."

کوئی جواب نہ آیا، آتا بھی کیسے، فورٹی تھری ناٹ کو تو ہم نے قابو کیا ہوا تھا۔

تین مرتبہ پکارنے کے بعد اسے کچھ شک گزرا۔ وہ جلدی سے موٹر سائیکل کی طرف لپکا۔ لیکن ڈِک اس سے پہلے وہاں پہنچ چکا تھا۔ رائفل دیکھتے ہی جرمن نے ہاتھ اٹھا دیئے۔ چند ثانیے کا وقفہ جس میں دو دشمن ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ ہمیشہ یاد رہے گا۔ ہماری توجہ اسی طرف تھی کہ یک لخت بے ہوش پڑے ہوئے سپاہی نے میرے منہ پر لات جمائی، میں الٹ کر گرا اور اس سے پہلے کہ چارلس اسے پکڑے، وہ جرمن زبان میں چیختا ہوا ٹرک کی طرف دوڑنے لگا۔

" اسے جانے دو، تم ادھر آؤ۔" ڈِک حلق پھاڑ کر چلایا۔ اور ہم دونوں ہی بدحواس ہو کر ڈِک کی طرف بھاگے۔ ڈِک نے رائفل کا کندا زور

سے دوسرے فوجی سپاہی کے سر پہ دے مارا۔ اس کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

"اُسے یہیں پڑا رہنے دو۔" ڈِک نے کہا، "تم دونوں پل کے پار میرا انتظار کرو، یہ لو رائفل۔" اس نے میری طرف رائفل اچھال دی، اور موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اسے سٹارٹ کر دیا۔ اتنی دیر میں ہم پُل پار کر چکے تھے۔ ڈِک نے پُل کے اس طرف آ کر ٹینکی کھولی اور لکڑی کے پل پر پٹرول بہا دیا۔ پھر اُس نے ماچس کی ڈبیا جیب سے نکالی اور رگڑ کر پٹرول پر پھینک دی۔ پُل دھڑ دھڑ جلنے لگا۔

ہم ابھی ڈِک کی پھُرتی اور دُور اندیشی پر عش عش کر ہی رہے تھے کہ ٹرک والے جرمن سپاہیوں نے فائرنگ شروع کر دی، وہ دوڑتے ہوئے پُل کی طرف آ رہے تھے لیکن آگ کے اونچے اونچے شعلے اُن کا راستہ روکے ہوئے تھے۔

"ہمیں سورج نکلنے سے پہلے پہلے کسی محفوظ مقام پر پہنچ جانا چاہیئے" ڈِک نے اطمینان سے کہا۔ "اب سڑک پر جانا درست نہ ہو گا۔ وہ وائرلیس کے ذریعے اگلی چوکی کو ہمارے بارے میں اب تک اطلاع دے چکے ہوں گے۔"

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "آؤ دریا کے ساتھ ساتھ دوڑیں۔ اِدھر دلدلی میدان معلوم ہوتا ہے۔ یہاں وہ اپنی جیپ گاڑیاں یا ٹرک لانے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ اِکا دُکا جرمن سے یہ رائفل نمٹ لے گی۔" اس وقت سوچنے سمجھنے کا موقع نہ تھا۔ ہم دریا کے ساتھ ساتھ نرم اور دلدلی زمین پر دوڑنے لگے۔ چند منٹ بعد جلتا ہوا پل ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا لیکن فائروں کی آواز بدستور آ رہی تھی۔

ہم دریائے اوتھائی کے بائیں کنارے پر تقریباً ڈیڑھ میل تک بھاگتے چلے گئے۔ رات کے تین بج رہے تھے اور حال یہ کہ سانس سینے میں نہ سماتا تھا،

بدن کیچڑ سے لت پت تھے۔ گھنی جھاڑیوں کو پھلانگتے اور اُن میں سے گزرتے ہوئے کانٹوں نے جس طرح ہمیں چھیلا، وہ الگ، لیکن رُکنے کی ہمت نہ ہوتی تھی ہمیں خوب اندازہ تھا کہ ہمارا واسطہ کس دشمن سے ہے۔ جرمن، جو اپنے حریف کو کبھی معاف نہیں کرتے اور اسے جہنّم سے بھی کھینچ لانے کا دعوےٰ کرتے ہیں سورج نکلنے سے پہلے پہلے ہمیں لازماً کسی اچھی پناہ گاہ میں چھپ جانا چاہیئے تھا ورنہ وہ ہمیں گھیر کر آوارہ کتوں کی طرح مار ڈالتے۔

آخر ہم ایسے مقام پر جا نکلے جہاں ایک گہری کھائی تھی۔ خیر گزری کہ پچھلے پہر کا چاند نکل آیا تھا اور اس کی روشنی میں یہ کھائی نظر آگئی۔ ورنہ ہماری ہڈیوں کا بھی سُراغ نہ ملتا۔ سامنے کھائی تھی اور دائیں بائیں گہری دلدلیں۔ اب کیا کریں؟ ہم نے ڈِک کی طرف نظروں سے دیکھا، کیوں کہ اب ہم اس کی صلاحیتوں اور اس کی حاضر دماغی کے اچھی طرح سے قائل ہو چکے تھے۔

دس پندرہ منٹ سستانے کے بعد اس مسئلے پر غور کیا۔ چارلس کی رائے یہ تھی کہ واپس چلنا چاہیئے۔ سورج نکلنے میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں اس دوران میں ہم کوئی اور راستہ تلاش کر لیں گے۔

میری تجویز یہ تھی کہ تیر کر دریا عبور کریں اور لی پونشیل گاؤں میں پہنچ کر کسی کے گھر چھپ جائیں۔ ایک دو روز وہاں آرام کر کے پھر نئی مہم پر روانہ ہوں گے۔ اس دوران میں جرمن بھی ہماری تلاش میں ناکام ہو کر مایوس ہو جائیں گے۔

ڈِک نے ان تجاویز پر بحث کر کے متعدد دلائل سے ثابت کر دیا کہ ہم دونوں نرے احمق ہیں اور یہ تجویزیں ہمیں صرف موت کے مُنہ میں پہنچا سکتی ہیں۔ اس نے فیصلہ کن لہجے میں اپنی تجویز پیش کی:

"ہم واپس جا سکتے ہیں نہ تیر کر دوسرے کنارے پر پہنچنا ہی مفید ہو گا۔

البتہ تیسرا راستہ کھلا ہے۔ اور ہمارے لئے یہی ایک بہترین پناہ گاہ ہے۔"

"کھائی ؟" ہم دونوں نے دہشت زدہ ہو کر کہا۔ "پاگل ہوئے ہو؟ بے شک کھائی میں اُترنا آسان ہے۔ لیکن یہ تو سوچو کہ ہم اِس میں سے نکلیں گے کیسے ؟"

"اگر تم لوگوں نے یہ نقشہ غور سے دیکھا ہوتا، تو سب کچھ تمہاری کھوپڑی میں سما جاتا۔"

ڈِک نے نقشہ پھیلایا اور ہم اُسے جُھک کر دیکھنے لگے۔ "یہ دیکھو، یہ رہی وہ سڑک جس کے ساتھ ساتھ ریلوے لائن گزرتی ہے۔ ہمیں پہلے اِس لائن تک پہنچنا ہے۔ خواہ ہمارے راستے میں کھائی ہو، یا سمندر یا ریگستان۔ اور یہ ہے وہ مقام جہاں اس وقت ہم تشریف فرما ہیں۔ افسوس ہے کہ نقشہ بنانے والے احمق نے اس میں کھائی واضح نہیں کی۔ بہرحال مَیں اس کا معائنہ کر چکا ہوں اور میرا اندازہ ہے کہ یہ کم از کم چار پانچ میل لمبی، دو سو فٹ گہری اور نصف فرلانگ چوڑی ہے۔ اگر ہم ہمّت سے کام کریں، تو اس میں اُترنے چڑھنے کی کوئی محفوظ اور آسان جگہ تلاش کر سکتے ہیں۔ جرمن ہمارے تعاقب میں چل پڑے ہیں۔ اور وہ کوئی دم میں آیا ہی چاہتے ہیں۔"

کھائی میں اُترنے کے لئے واقعی جان پر کھیلنا پڑتا تھا۔ ابھی ہم اِسی کش مکش میں مبتلا تھے کہاں جائیں کہ آسمان پر بادل گرجنے لگے اور بارش کے ساتھ موٹے موٹے اولے برسنے لگے۔ ہم نے مٹی کے ایک ٹیلے کے نیچے پناہ لی۔ مگر تھوڑی دیر بعد احساس ہوا کہ ٹیلا آہستہ آہستہ نیچے کھسک رہا ہے۔ بروقت وہاں سے نِکلے۔ ہمارے نکلتے ہی ایک ہولناک آواز کے ساتھ ٹیلا کھائی کے اندر جا گرا۔

"ابھی زندگی کے کچھ دن باقی ہیں۔" ڈک نے سنجیدگی سے کہا۔ " اگر ہم ایک منٹ اس کے نیچے ٹھہرتے، تو اپنا صفایا تھا۔"

لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ایک دوسری مصیبت سر پہ آن کھڑی ہوئی ہم نے ایک نشیب میں پناہ لے رکھی تھی اور بارش کا پانی بڑی تیزی سے اس میں جمع ہو رہا تھا۔ پانی اس زور سے اوپر سے گرتا کہ ارد گرد کی نرم زمین شق ہو جاتی تھی۔

بمشکل وہاں سے نکلے۔ اب بارش سے بچنے کے لئے اندھی کھائی کے سوا اور کوئی پناہ گاہ نہ تھی۔ ممکن ہے ہم بارش کو برداشت کر لیتے، لیکن ڈک کی چھٹی حس نے اسے یک لخت بے چین کر دیا۔ وہ کان لگا کر غور سے کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شش، خدا کے لئے چپ رہو۔" اس کا چہرہ از حد سنجیدہ تھا۔ وہ اکیلا کھائی کی طرف گیا۔ کچھ سوچتا رہا۔ پھر قریب آکر بولا:

"شاید تمہارے کانوں تک آواز نہیں پہنچی۔ بہر حال ہمارے دشمن قریب آن پہنچے ہیں۔ میں ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ سن رہا ہوں۔"

یہ سن کر میرا دل لرز گیا۔ ہوا اور بارش کے طوفان میں واقعی ہم نے ٹینکوں کا شور نہیں سنا تھا۔ لیکن اب ان کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

"کھائی میں اترنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔" ڈک نے کہا۔ "وہ تینوں طرف سے ہمیں گھیرے میں لے چکے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہم کھائی کو عبور نہیں کر سکیں گے۔ لیکن اس بارش نے ہماری مشکل آسان کر دی ہے، لو، یہ رسّا سنبھالو۔ میں نے ایک جگہ دیکھ لی ہے۔ ابھی بادل چھٹ جائیں گے اور سورج آسمان پر چمکے گا۔ تو ہم اس میں اتر رہے ہوں گے۔ جرمنوں کو یہاں تک پہنچنے میں کم از کم

آدھا گھنٹہ لگے گا، کیونکہ راہ میں سینکڑوں نشیب و فراز حائل ہیں، کہیں کہیں پانی بھی اِن کا راستہ روکے گا، اس وقت تک خدا نے چاہا تو ہم ان کی پہنچ سے باہر ہوں گے۔ آؤ، تمہیں وہ جگہ دکھاؤں۔"

"کھائی کا یہ حصّہ زیادہ گہرا ہے، لیکن تم دیکھتے ہو کہ اس میں اُترنے کے لئے کافی گنجائش ہے۔ ذرا اس اُبھرے ہوئے وسیع ٹیلے کو دیکھو۔ اگر ہم یہاں سے اس پر کُود جائیں، تو کھائی کا بقیہ حصّہ آسانی سے طے کر سکتے ہیں۔"

ڈِک نے جس ٹیلے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ پچیس فٹ نیچے کھائی کی عمودی دیوار میں سے باہر کو نکلا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم پچیس فٹ لمبی چھلانگ لگا کر اس ٹیلے پر کود دیں۔

ممکن ہے عام حالات میں اوپر سے نرم زمین پر پچیس فٹ نیچے کودنا کچھ مشکل نہ ہو۔ مگر جس ماحول اور جن مصائب کا ہمیں سامنا تھا، ان کی موجودگی میں یہ پچیس فٹ ایک پاتال کی مانند محسوس ہو رہے تھے۔ جس کی کوئی اتھاہ نہ ہو۔

"فرض کرو ہم اس ٹیلے پر کُود گئے تب بھی ایک آدھ ہڈی چٹخنے گی یا جبڑا ٹوٹے گا۔" میں نے کہا۔

"اس کا بے شک امکان ہے۔" ڈِک نے تسلیم کیا۔ "لیکن میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی ہے۔ تم لوگ ذرا اپنے کپڑے اتار دو، اور وہ کمبل بھی مجھے دے دو۔"

ہم نے بے چون و چرا تعمیل کی۔ ڈِک نے کمبل اور کپڑے ایک ایک کر کے اس ٹیلے پر پھینک دیئے۔

"اب چوٹ زیادہ نہ لگے گی۔" ڈِک نے کہا۔

کُتّوں کی آواز واضح اور بہت قریب آگئی تھی۔ بادل چھٹ رہے

تھے۔ اور بارش ہلکی ہلکی پھوار میں تبدیل ہو گئی تھی۔ مشرقی اُفق پر روشنی کا ایک ہالہ سا بن رہا تھا۔ سورج کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی چار جرمن ٹینک دُور سے مدھم سایوں کی طرح حرکت کرتے نظر آئے۔

ڈِک کے اشارے پر ہم نے آنکھیں بند کیں اور ایک ایک کر ٹیلے پر کود گئے۔

یہ بھی ایک معجزہ تھا کہ ٹیلے پر گرنے کے بعد ہمارے ہوش و حواس برقرار رہے۔ زناٹے دار ہوا چل رہی تھی اور خطرہ تھا کہ اگر پھاندنے میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی۔ تو تحت الثرےٰ ہی اپنا ٹھکانا بنے گا۔ لیکن قدرت کا نادیدہ ہاتھ ہر گام پر ہماری مدد کے لئے تیار تھا اور اب ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اگر استقلال اور جرات سے قدم بڑھایا جائے، تو منزل کی تمام رکاوٹیں اا دشواریاں ہٹتی چلی جاتی ہیں۔

لیکن چند لمحے بعد ہی ایک نئی اور انتہائی نازک صورتِ حال ہمارے سا تھی۔ جس سے بچاؤ کی کوئی صورت فی الحال ممکن نہ تھی۔ جرمن چند لمحوں کے ا اندر ہمارے سر پر پہنچنے والے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ رسّوں کے ذر کھائی میں اُترنے کی کوشش کریں اور دوسری طرف جب ہم نیچے جھانکتے تھے، تو رُوح لرز جاتی تھی۔

ہمارا اندازہ غلط ثابت ہوا، کھائی تین سو فٹ سے بھی زیادہ گہری تھی اوّل تو اس میں اترنا ہی کارے دارد تھا۔ کہیں نہ کہیں پیر ضرور پھسلتا۔ او بھیانک موت ہمیں دبوچ لیتی۔ اوپر جانے کا تو اب سوال ہی نہ تھا کیو ہمارے پاس رسّے تھے اور نہ کھائی میں پیر جمانے کی جگہ بنانے کے لئے کیلیں، ہتھوڑے اور دوسری چیزیں۔ کھائی کی تہہ میں بارش کا پانی تیزی سے جمع ہو رہا تھا۔ گویا نیچے اُترنے کی راہ پہلے ہی بند ہو چکی تھی۔ ڈِک نہایت ہراساں تھا۔ میں نے اس دوران میں پہلی بار اس کے چہرے پر خوف

آثار پائے۔

مٹی کا وہ ٹیلا جس پر ہم کودے تھے۔ دس فٹ چوڑا اور پانچ فٹ لمبا تھا۔ جس مقام سے یہ ٹیلا کھائی کی دیوار میں سے ابھرا تھا۔ وہاں صرف اتنی جگہ تھی کہ ایک آدمی سمٹ سمٹا کر بیٹھ جائے اور اوپر سے دیکھنے والوں کی نظروں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے۔ لیکن ہم تو تین آدمی تھے۔ جرمن بڑی آسانی سے ہمیں دیکھ کر گولیوں کا نشانہ بنا سکتے تھے۔

ڈِک نے ٹیلے کے ہر حصّے کا بغور جائزہ لیا۔ ہاتھوں اور پیروں سے اس کی مضبوطی کا اچھی طرح امتحان کرنے کے بعد اس نے رائفل پر چڑھی ہوئی سنگین اتاری اور چارلس کی طرف بڑھائی۔

"تم ٹیلے کے اس حصّے کو کھود کر بڑا کرنے کی کوشش کرو۔ جہاں ایک آدمی کے چھپنے کی گنجائش ہے۔ میرا خیال ہے، مٹی نرم ہے۔ ذرا احتیاط سے کھودگے تو دس منٹ میں کشادہ جگہ بن جائے گی، جلدی کرو . . . . میں اپنے دوستوں کا انتظار کر رہا ہوں۔ بس وہ آیا ہی چاہتے ہیں"۔

یہ کہہ کر اس نے رائفل سنبھالی اور ٹیلے کی بائیں جانب دیوار کے ساتھ جم کر بیٹھ گیا۔

"تم چارلس کی مدد کرو اور مٹی آہستہ آہستہ کھائی میں پھینکتے جاؤ۔ لیکن ایسے کہ انہیں اوپر سے پتہ نہ چلے کہ مٹی اُڑ رہی ہے"۔

چارلس دیوانہ وار مٹی کھود رہا تھا۔ اس کے قوی بازو مشین کی طرح حرکت کر رہے تھے۔ تین منٹ کے اندر اندر اس نے مزید تین فٹ کی جگہ نکال لی۔ اب اس میں دو آدمی سما سکتے تھے۔ یکایک کھائی کے اُوپر جرمنوں کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ پھر بہت سے جوتوں کی آوازیں . . . . . . شاید وہ اِدھر اُدھر ہمیں تلاش کر رہے تھے۔ ایک افسر چیخ چیخ کر دوسروں سے کہہ رہا تھا۔

"وہ یہیں ہیں . . . . یہ رہے۔ ان کے جوتوں کے نشان سے . . . . وہ ضرور کھائی میں اُترے ہیں . . . . ذرا جھانک کر دیکھو . . . چلو۔ آگے بڑھو . . . "

ہمارے بدن پتھر کے ہوگئے۔ ڈک نے ہم دونوں کو سوراخ کے اندر گھس جانے کا اشارہ کیا۔ وہ خود دیوار کے ساتھ چپک کر بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ ہم دونوں تین فٹ لمبے اور چار فٹ چوڑے سوراخ کے اندر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھے تھے اور نظریں کھائی کے کناروں پر لگی ہوئی تھیں۔

ہم نے ایک جرمن کو نیچے جھانکتے دیکھا۔ اس کی نظریں ایک سرے سے دوسرے تک کھائی کا جائزہ لینے کے بعد یک لخت اس ٹیلے پر جم گئیں۔ اس نے یقیناً ڈک کو دیکھ لیا تھا۔ ابھی وہ چیخنے کے لئے منہ کھول ہی رہا تھا کہ ڈک کی رائفل نے شعلہ اگلا اور دوسرے ہی لمحے جرمن قلابازیاں کھاتا ہوا کھائی کی اندرونی وسعتوں میں گم ہوگیا۔

چارلس مٹی کھود رہا تھا۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں اعلان کیا: "ڈک، اندر آجاؤ۔ اب تمہارے لیے بھی جگہ نکل آئی ہے۔" یہ سنتے ہی ڈک کھسکتا ہوا ہمارے قریب آیا۔ اور اسی لمحے اُوپر سے جرمن سپاہیوں نے اندھا دھند فائرنگ شروع کردی اور گولیاں ٹیلے کو چھیدتی ہوئی گزرنے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد ایک اور جرمن سپاہی جھانک کر ٹیلے کی طرف دیکھنے لگا۔ اپنے افسر سے کچھ کہنے کے لئے اس نے گردن گھمائی تھی کہ ڈک کی رائفل سے سنتی ہوئی گولی اس کی کھوپڑی کو پاش پاش کرتی ہوئی نکل گئی۔ ایک لرزہ خیز چیخ کے ساتھ وہ بھی کھائی کی سیر کرتا ہوا نظر آیا۔ چند منٹ بعد ہم ٹینکوں کے واپس جانے کی آواز سن رہے تھے۔

جرمن ٹینکوں کے جانے کے بعد ہماری جان میں جان آئی۔ ڈک کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ اس نے باہر سرک کر دو تین مرتبہ اِدھر اُدھر دیکھا اور جب اچھی طرح

اطمینان کر لیا کہ کوئی جرمن سپاہی کھائی کے اوپر چھپا ہوا نہیں تو ہمیں بھی باہر آنے کا اشارہ کیا۔ اب ہمارے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ کھائی میں اُترا کیسے جائے، کیونکہ جرمن کسی وقت بھی دوبارہ نمودار ہو سکتے تھے۔ جس ٹیلے پر ہم نے پناہ لی تھی، اُس سے بارہ فٹ نیچے ایک اور چھوٹا ٹیلا نظر آرہا تھا اور ان دونوں ٹیلوں کے درمیان کہیں کہیں ایسی جگہ موجود تھی جس پر پیر رکھ کر ہم احتیاط سے نیچے اُتر سکتے تھے۔ بارش کی وجہ سے کھائی کی دیواریں گیلی اور چکنی ہو چکی تھیں اور ویسے بھی تہہ کے اندر پانی بڑی مقدار میں جمع ہو چکا تھا ان حالات میں نیچے اترنا حماقت تھی۔

"بُرے پھنسے"۔ ڈک نے کہا۔" اگر جرمن دوبارہ آگئے تو ہم کُتّے کی موت مارے جائیں گے۔"

"مرنا تو ہر صورت میں ہے ہی،" چارلس نے منہ بنا کر اس انداز میں کہا کہ مجھے ہنسی آگئی۔ اس پر وہ چڑ گیا اور کہنے لگا:

"جتنا ہنسنا ہے، ہنس لو شاید پھر موقع نہ ملے۔"

"گھبراؤ مت یار . . . ." ڈک نے کہا۔" ذرا وہ کپڑے اور کمبل تو مجھے تھما دو۔"

اس نے ایک بار پھر نچلے ٹیلے کا جائزہ لیا اور رائفل سے سنگین اتار کر کمبل کی لمبی لمبی پٹیاں کاٹنے لگا۔ ہم دونوں خاموشی سے تماشہ دیکھتے رہے۔ ان پٹیوں کے سرے، پر گانٹھیں باندھ کر اس نے یہ خود ساختہ رسّا نیچے لٹکایا اور سنگین اس کے ایک سرے میں پرو کر نصف سے زائد حصہ اس ٹیلے کے اندر گھونپ دیا جس پر ہم بیٹھے ہوئے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ اگر ہم ذرا ہمت کریں، تو اس طرح کھائی کے اندر اُتر سکتے ہیں۔ پانی ایک گھنٹے کے اندر اندر یقیناً جذب ہو جائے گا۔ آؤ، اب دوسرے ٹیلے پر پہنچیں۔"

ڈک کا کہنا صحیح تھا۔ کھائی کا پانی ایک گھنٹے سے بھی پہلے خشک ہو گیا۔ ہم آہستہ آہستہ کمبل کے بنائے ہوئے رسّے پر پھسلتے ہوئے دوسرے ٹیلے پر اتر گئے۔ اب یہاں سے مزید نیچے اترنے کے لیے ہمیں دوپہر تک انتظار کرنا تھا۔ اس دوران میں ایک

چھوٹا ہوائی جہاز کئی بار کھائی کے اوپر سے گزرا۔ ایک مرتبہ تو وہ اس قدر نیچے اڑ رہا تھا کہ ہمیں یوں احساس ہوا جیسے جہاز کا پائلٹ ہم پر گولیاں برسانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

"یہ جہاز ہماری نگرانی کر رہا ہے۔" ڈک نے کہا۔ "ہمیں آج ہی سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے اس کھائی کو عبور کرنا ہوگا۔"

ڈیڑھ سو فٹ گہری کھائی میں جس طرح جان ہتھیلی پر رکھ کر ہم اترے ہیں، وہ ایسا بھیانک تجربہ تھا جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جسموں پر جا بجا خراشیں، ہاتھ سوجے ہوئے اور کیچڑ میں لت پت بھوت بنے ہوئے ہم اس روز کھائی کے اندر ہی اندر کئی فرلانگ گئے۔ ایک جگہ یہ کھائی کئی شاخوں میں بٹ گئی تھی۔ کہیں دم لیے بغیر ہم آگے بڑھتے گئے۔ ایک مقام پر دلدل میں دفن ہوتے ہوتے بچے، دوسری جگہ سانپوں کے نرغے میں پھنسے، لیکن زندگی کے کچھ دن باقی تھے، ان تمام آفتوں اور سختیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آخر ایسی جگہ آنکلے جہاں سطح آہستہ آہستہ اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ سورج غروب ہونے سے تھوڑی دیر پیشتر ہم نے اپنے آپ کو ایک وسیع و عریض میدان میں پایا جہاں کہیں کہیں بارش کا پانی جوہڑوں اور چھوٹے نالوں کی صورت میں جمع ہو رہا تھا۔ کہیں گہری دلدل تھی، کہیں خشک اور خاردار جھاڑیوں کے سلسلے۔ فوجی ٹرکوں اور جیپوں کے نشان جا بجا پھیلے ہوئے تھے۔ جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ جرمن گاڑیوں کی آمد و رفت ادھر سے بھی ہوتی رہتی ہے۔

سورج چھپنے کے بعد بھی ہم چلتے رہے۔ ڈک کھائی میں اترتے وقت دو مرتبہ گرا تھا اور اس کی حالت ہم سے کہیں بدتر تھی۔ لیکن وہ مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ چارلس بار بار کمپاس سے راستے کی نشاندہی کرتا اور میں نے بچا کھچا سامان اٹھا رکھا تھا۔

مزید چار میل چلنے کے بعد ایک بلند پہاڑی کے آثار دکھائی دیئے۔ جس کے چاروں طرف درختوں کے جھنڈ تھے۔ جب ہم قریب پہنچے، تو یہ دیکھ کر

سیٹی گم ہوگئی کہ پہاڑی کے ارد گرد جرمن فوجی گاڑیاں حرکت کر رہی ہیں۔ اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے، گرتے پڑتے ہم پھر واپس ہوتے اور ایک لمبا چکّر کاٹ کر ایسی جگہ آنکلے۔ جہاں، چند جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں، لیکن ان کے مکیں نہ جانے کہاں جا چکے تھے۔ ایک خالی جھونپڑی کے اندر گھُس کر ہم فرش پر ڈھیر ہوگئے اور اپنے آپ کو نیند کے حوالے کر دیا۔

صبح سات بجے آنکھ کھُلی، تو ارد گرد کا منظر پوری طرح ہمارے سامنے تھا۔ اپنی دانست میں جس پہاڑی سے ہم دُور بھاگ گئے تھے، وہ تین سو گز کے فاصلے پر ہماری نگاہوں کے سامنے موجود تھی اور جرمنوں کی آوازیں ہمارے کانوں تک صاف پہنچ رہی تھیں۔

ڈِک نے دانت پیستے ہوئے کہا:

"خدا ان جرمنوں کو جہنّم رسید کرے، کم بختوں نے پہاڑی پر بھی مورچے بنا رکھے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی نے اپنی دُور بین آنکھوں سے لگالی، تو ہم دیکھ لئے جائیں گے۔ اُنہوں نے اینٹی ایئر کرافٹ گنیں بھی نصب کر رکھی ہیں۔ غالباً وہ کھانے پینے کی چیزیں کسی قریبی گاؤں سے لاتے ہوں گے اور دن بھر نہ جانے ان جھونپڑیوں کے آگے سے کتنی مرتبہ گزرتے ہوں گے۔ یہاں سے ہمیں ہٹ جانا چاہیئے۔"

پہاڑی پر چوں کہ چہل پہل شروع ہو چکی تھی، اس لئے ہم چلنے کے بجائے رینگتے ہوئے جھونپڑی سے نکلے اور ایک گھنٹے کی فنا کر دینے والی جدو جہد کے ساتھ تقریباً دو سو گز پیچھے ہٹے اور ایک محفوظ مقام پر رُک گئے۔ یہاں دلدلی زمین پر قدِ آدم گھاس اُگی ہوئی تھی جس کے اندر ہم جرمنوں کی عقابی نظروں سے بآسانی محفوظ رہ سکتے تھے۔

بھوک اور تھکن کے باعث ہم بے حد نڈھال ہو رہے تھے۔ کھانے کے لئے بسکٹ اور پنیر کے چند ٹکڑے باقی تھے، لیکن ان سے کچھ نہ بنا، بلکہ بھوک

اور تیز ہوگئی۔ پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ ہم نے اِدھر اُدھر جوہڑ تلاش کرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ اس ڈھلوان علاقے میں پانی کہاں رُکتا؟

ایک گھنٹہ آرام کرنے کے بعد ہم نے نقشہ سامنے پھیلایا اور بچاؤ کی تدبیروں پر از سرِ نو غور کرنے لگے۔ یہ بات تو طے تھی کہ ہم صحیح راستے پر جا رہے تھے، کیوں کہ پہاڑی پر بنا ہوا جرمن مورچہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اس تمام راستے پر جرمنوں کا قبضہ ہے اور اس کی اہمیت کے پیشِ نظر یہاں مورچے بنائے گئے ہیں۔

کھائی سے لے کر اس پہاڑی تک کا درمیانی فاصلہ تقریباً آٹھ میل تھا۔ اور اب ہم کھائی کے دوسرے کنارے پر سفر کر رہے تھے۔ چارلس کی رائے تھی کہ اگر کوئی گاؤں نزدیک ہو تو ہمیں وہاں پہنچ کر مقامی باشندوں سے مدد حاصل کرنی چاہیئے۔ کھانے پینے کا سامان لے کر ہی ہم لوگ وہاں سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔

دن کے وقت جرمنوں سے مڈبھیڑ ہونے کا خدشہ بھی سامنے تھا۔ اس لئے ہم رات کے ایک بجے کے لگ بھگ جب کہ چاروں طرف جھینگروں اور مینڈکوں کی آوازیں گونج رہی تھیں، اپنی کمین گاہ سے نکلے اور سایوں کی مانند اس پگڈنڈی پر چلنے لگے جو چکّر کاٹ کر پہاڑی کے عقب میں گم ہو جاتی تھی۔

گاؤں تک پہنچنے کے لئے ہمیں لازماً جرمنوں کے اس مورچے کے قریب سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ دل کڑا کر کے نہایت حوصلے اور استقلال کے ساتھ ہم آگے بڑھنے لگے۔ اور عین پہاڑی کے دامن میں پہنچ گئے۔ ہم مورچوں سے اس قدر قریب تھے کہ پہاڑی کے چاروں طرف لگے ہوئے لکڑی کے کھمبے اور لوہے کے خاردار تار صاف نظر آرہے تھے۔

جرمن سپاہی بیس بیس گز کے فاصلے سے پہاڑی کے اردگرد پہرہ دے رہے تھے۔ وہ اپنی حد میں ٹہلتے جاتے اونچی آوازیں ایک دوسرے سے باتیں بھی کر رہے تھے۔ ہم کچھوے کی طرح زمین پر رینگ رہے تھے۔ اور آنکھیں انہی پہرے داروں پر لگی ہوئی تھیں۔ ہمیں احساس تھا کہ ذرا سی آہٹ پاتے ہی نہ جانے کتنی گولیاں ہمارے جسموں میں پیوست ہو جائیں گی۔

پَو پھٹنے سے کچھ دیر پہلے ہم بل کھاتی ہوئی ایک کچی سڑک پر جانکلے اب مزید آگے بڑھنے کی ہمت نہ تھی۔ وہیں گھاس کے اندر لیٹ کر ہانپتے رہے۔ یکایک ہمارے کانوں میں موٹر سائیکل کی آواز آئی۔ چارلس نے سر اٹھا کر دیکھا، دُور پہاڑی کی جانب سے روشنی کا ایک ننھا سا دائرہ ہماری جانب چلا آرہا تھا۔

"کوئی جرمن پیغام رساں اپنی ڈیوٹی پر جا رہا ہے۔" ڈک نے کہا۔ "ممکن ہے اس کے پاس کھانے پینے کی کچھ چیزیں ہوں، میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی ہے۔ چارلس، جلدی کرو، پگڈنڈی کے عین درمیان بے ہوش بن کر لیٹ جاؤ۔ تھوڑی دیر میں وہ اس طرف سے گزرے گا۔ باقی کام میں سنبھال لوں گا۔"

"اگر وہ مجھ پر توجّہ دیئے بغیر کنی کاٹ کر نکل گیا تو؟" چارلس نے پوچھا۔

"بکو مت، جو میں کہتا ہوں، وہ کرو۔"

چارلس نے خوف زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اُسے وہیں ٹھہرنے کے لئے کہا اور خود رینگتا ہوا سڑک کے عین درمیان لاش کی طرح لیٹ گیا۔

موٹر سائیکل کی آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آرہی تھی۔ پھر وہ میرے بالکل سر

پر آگئی۔

مَیں نے کنکھیوں سے دیکھا، جرمن فوجی مجھے وہاں پڑے دیکھ کر بڑبڑایا۔ شاید گالی دے رہا ہوگا۔ انجن بند کئے بغیر وہ موٹر سائیکل سے اُترا۔ اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا میرے پاس آیا اور جُھک کر دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے یہ دیکھنے کے لئے کہ مَیں زندہ ہوں یا مرا ہوا، میرے دل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ میرے دائیں ہاتھ کا گھونسا اس کے جبڑے پر پڑا۔ وہ اُلٹ گیا۔ اتنے میں میرے دونوں ساتھی بھوکے چیتوں کی مانند اِس پر جھپٹے اور دُک کے چند ہی گھونسوں نے اسے بے جان کر دیا۔

"ذرا اس کی تلاشی تو لو" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "اس کا پستول مجھے دے دو۔ اور کارتوسوں کی پیٹی بھی، بلکہ بہتر یہی ہے کہ وردی بھی اتار لو، ہمارے کام آئے گی"

ہم اُسے گھسیٹ کر گھاس میں لے گئے۔ چارلس نے انجن بند کیا۔ اور موٹر سائیکل کو ایک گہرے کھڈ میں پھینک دیا۔

بدنصیب جرمن کی وردی اتار کر ہم نے اسے بالکل برہنہ کر دیا۔ اس کے پاس کوئی خاص چیز نہ تھی۔ شراب کی ایک چھوٹی سی بوتل، لفافے میں رکھے ہوئے چند سینڈوچز، ایک کنگھا، آئینہ، شیو کا سامان، ٹارچ اور چند کاغذات جن پر جرمن زبان میں نہ جانے کیا لکھا ہوا تھا۔ ہم نے اسی کی پیٹی سے اس کے ہاتھ پیر باندھ کر سڑک کے کنارے لٹا دیا۔ پھر جلدی جلدی بوتل کھولی۔ ایک ایک گھونٹ شراب پی کر حلق تر کیا اور سینڈوچز کھاتے ہوئے وہاں سے بھاگ اٹھے۔

"میرا خیال ہے کہ یہ شخص کسی قریبی گاؤں سے صبح کے ناشتے کے لئے انڈے اور دودھ وغیرہ لینے کے لئے جا رہا ہوگا۔ اگر ہم اسی پگڈنڈی پر دوڑتے رہیں، تو کسی نہ کسی گاؤں میں جا نکلیں گے۔"

چارلس نے کہا۔

"پہلی مرتبہ تم نے صحیح بات کی ہے۔" ڈک نے کہا۔ "لیکن یہ دیکھ لو، کہ سورج نکلنے والا ہے۔ ہمیں اس سے پہلے کہیں پناہ لینی ہوگی۔ یہ علاقہ جرمنوں سے بھرا پڑا ہے۔ وہ اپنے ساتھی کو عنقریب وہاں پڑا دیکھ لیں گے۔ اور پھر خونخوار کتوں کی طرح ہماری تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔"

شراب اور سینڈوچ پیٹ میں جانے سے ہمارے اندر نئی قوت پیدا ہوگئی اور جب سورج کی سنہری کرنیں شفق سے پھوٹنے لگیں تو ہم ایک ویران گاؤں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ باغ اور کھیت اجڑے ہوئے تھے، اور کوئی کسان دکھائی نہ دیتا تھا۔

"عجب معاملہ ہے، آدمی نہ آدم زاد، تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ میں گاؤں کے اندر جاتا ہوں۔" ڈک نے کہا۔ اس نے جرمن سپاہی کی وردی پہنی اور رائفل لے کر بے نیازی سے چلتا ہوا آگے بڑھ گیا اور ہم اس کے صحیح سلامت واپس آجانے کی دعائیں مانگتے رہے۔

آدھ گھنٹے کے بعد کہیں اس کی صورت نظر آئی، اس کے چہرے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔

"گاؤں بھر میں سوائے ایک بڈھے کسان اور اس کی بیوی کے اور کوئی شخص نہیں۔ جرمنوں نے گاؤں کے اکثر افراد کو مار دیا اور کچھ جان بچا کر بھاگ گئے۔ کسان دراصل بیمار ہے۔ اور اس کی بیوی کو تیمارداری کے علاوہ جرمن سپاہیوں کے لئے انڈے، دودھ اور بعض اوقات کھانا بھی پکانا پڑتا ہے۔ مجھے وردی میں دیکھ کر پہلے تو وہ ڈرے، مگر جب میں نے اپنی مصیبت کی داستان سنائی۔ تو مدد کرنے پر تیار ہو گئے۔ اس کی بیوی نے مجھے بتایا، کہ ایک جرمن سپاہی روزانہ صبح شام گاؤں میں آتا ہے اور کھانے پینے

کی چیزیں لے جاتا ہے۔ کسان نے مجھے دیکھتے ہی کہا کہ مَیں کہیں چھپ جاؤ کیونکہ جرمن آنے والا ہے۔ جب مَیں نے اسے بتایا کہ اس جرمن کا ہم نے کیا حشر کیا ہے۔ تو میاں بیوی بے حد خوش ہوئے۔ جرمنوں سے ان کی نفرت کا یہ عالم ہے کہ اگر ان کا بس چلے، تو اُن کو موت کے گھاٹ اُتار دیں۔ انہوں نے مجھے اپنے مکان کا ایک تہہ خانہ دکھایا اور کہا کہ ہم جب تک چاہیں اس میں رہ سکتے ہیں۔"

جب ہم گاؤں میں داخل ہوئے، تو دو تین کتوں نے بھونک کر ہمارا استقبال کیا۔ گاؤں کی حالت دیکھ کر رونا آتا تھا۔ کوئی مکان اور کوئی جھونپڑی سلامت نہ تھی۔ ٹینکوں نے جابجا کھیتوں کو روند ڈالا تھا اور جرمن طیاروں نے خوب بمباری کی تھی۔

آوارہ مویشی اور بھیڑ بکریاں اور کتنے بڑی تعداد میں موجود تھے۔ بوڑھا فرانسیسی کسان اور اس کی بیوی ہمیں دیکھ کر رونے لگے اور انہوں نے التجا کی کہ اگر ہم یہاں سے جانے کا پروگرام بنائیں، تو انہیں بھی ساتھ لے چلیں، کیونکہ خدشہ ہے کہ اگر کسی دن بھی انہوں نے جرمنوں کو کھانا پکا کر نہ دیا تو وہ انہیں مار ڈالیں گے۔

ہم نے انہیں تسلی دی اور اپنی رائفل اور پستول دکھا کر اشاروں سے کہا کہ وہ بالکل فکر نہ کریں، ہم کئی جرمنوں کو جہنم رسید کر کے ہی مریں گے۔

انہوں نے جلدی سے ہمیں تہہ خانے کا راستہ دکھایا۔ اس قسم کے تہہ خانے فرانس کے کسانوں کے ہاں بنائے جاتے ہیں۔ ان میں ضرورت کا اناج اور دوسرا سامان محفوظ رہتا ہے۔ برف باری کے زمانے میں بھی یہ تہہ خانے آرام دہ ثابت ہوتے ہیں۔ ہم جس تہہ خانے میں داخل ہوئے وہ بارہ فٹ لمبا، اسی قدر چوڑا اور چھ فٹ اونچا تھا۔ اس کے فرش پر نرم نرم

گھاس بچھی ہوئی تھی۔ چھت کے عین درمیان میں لکڑی کا ایک تختہ لگا ہوا تھا۔ جسے حسبِ ضرورت ہٹا کر ہم اندر اور باہر آجا سکتے تھے۔ اس مقصد کے لئے ایک چھوٹی سی سیڑھی تہہ خانے میں رکھی ہوئی تھی اور اسی گھاس کے نیچے فرش پر بھی گھاس بچھی ہوئی تھی۔ اور اسی گھاس کے نیچے وہ تختہ چھپا ہوا تھا جس کو اٹھا کر ہمارے میزبانوں نے ہمیں تہہ خانے میں پہنچا دیا تھا۔ دیواروں میں کہیں سوراخ تھے، جن سے تازہ ہوا اندر آرہی تھی۔

کسان کی بیوی ہماری آمد سے بے حد خوش تھی۔ اس نے ہماری خاطر تواضع میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ ہم بڑی مشکل سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کرتے تھے۔

گرم پانی سے اچھی طرح نہائے۔ پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور پھر ایسے بے خبر سوئے کہ اگلے روز صبح سویرے آنکھ کھلی۔ بوڑھا کسان بیمار ہونے کے باوجود نہ جانے کہاں سے اس علاقے کا ایک نقشہ لے کر آیا۔ اس نقشے سے علم ہوا کہ ہم لاٹکس کورٹ، ڈیرون چوکس اور ویڈنی کورٹ نامی دیہاتوں کے درمیان ایک چھوٹے سے گاؤں کرلیبی میں قیام پذیر ہیں۔

بڈھا بار بار کہتا تھا کہ اگر ہم ذرا ہمّت سے کام لیں، تو کوینڈ پلیج کے ساحلی مقام پر کوئی نہ کوئی کشتی ضرور مل جائے گی۔ اس کے لئے دریائے سومی کو عبور کرنا لازمی ہے۔ لیکن یہ افواہیں بھی سُنی جا رہی ہیں کہ جرمنوں نے ان تمام ساحلی علاقوں کی کشتیاں اپنے قبضے میں کر لی ہیں۔

ایک گھنٹے کی بحث کے بعد ہم نے دریائے سومی کو عبور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کرلیبی سے دریائے سومی صرف دس میل دور تھا۔ اِس گاؤں میں زیادہ دیر تک ٹھہرے رہنا نہ صرف ہمارے لئے، بلکہ ان بڈھے میاں بیوی کے لئے بھی مہلک تھا۔

دوپہر کو بُھنے ہوئے گوشت اور تلے ہوئے آلوؤں سے پیٹ بھر نے

کے بعد ہم پھر خراٹے لینے لگے اور ابھی بمشکل آدھ گھنٹہ ہوا ہو گا کہ بڈھے کسان اور اس کی بیوی نے ہمیں جگا دیا۔ اُن کے چہرے فرطِ خوف سے زرد اور ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔

انہوں نے رُک رُک کر بتایا کہ ایک فوجی گاڑی ابھی ابھی گاؤں میں آئی ہے۔ اور مسلّح جرمن سپاہی ایک ایک مکان اور جھونپڑی کی تلاشی لے رہے ہیں۔

"آپ لوگ فوراً اوپر چلے جائیں۔" ڈِک نے کسان اور اس کی بیوی کو اشارے سے سمجھایا۔ "ہم اپنی حفاظت خود کر لیں گے۔ وہ تعداد میں کتنے ہیں؟"

"سات آٹھ ہیں۔" عورت نے کہا۔ اور اپنے شوہر کا بازو پکڑ کر اوپر چلی گئی اور تختہ بند کر دیا۔

"اگر انہوں نے تشدّد سے گھبرا کر ہمارا اَتا پَتا بتا دیا، تو اپنا خاتمہ یقینی ہے۔" چارلس نے کہا۔

"میرا خیال ہے، اس کی نوبت نہیں آئے گی۔" ڈِک نے جواب دیا اور سوراخ کے قریب جا کر جھانکنے لگا۔

"مجھے اُن کا ٹرک نظر آ رہا ہے، دو افسر ٹرک کے پاس کھڑے ہیں، بقیہ سپاہی ہماری تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہے ہوں گے۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ سب سے پہلے اس مکان میں کیوں نہیں آئے؟"

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ ہمیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے جنگل کی طرف نکل گئے۔" میں نے رائے دی۔

ایک لمحے کے لیے ڈِک کی آنکھوں میں مَیں نے وہی چمک دیکھی جو کسی خطرناک فیصلے کے وقت نمودار ہوتی تھی۔ اس نے اپنے آپ پر نظر ڈالی۔ رائفل کے میگزین کا معائنہ کیا اور ٹوپی ترچھی کر کے نصف

چہرہ چھپا لیا۔

"دوستو! میرے ذہن میں اس مصیبت سے بچنے کی ایک تدبیر آئی ہے۔ مَیں اس وقت ایک جرمن سپاہی ہوں، رائفل میرے پاس ہے، مَیں تم دونوں کے ہاتھ اوپر اُٹھوا کر باہر لے چلتا۔ وہ احمق سمجھیں گے کہ مفرور قیدیوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ مَیں تمہیں آہستہ آہستہ ان کے قریب لے جاؤں گا۔ اور جونہی میں ہلکی آواز سے کھنکھاروں تم فوراً زمین پر لیٹ جانا۔ باقی کارروائی میرے ذمّے۔ . . چلو، ہینڈز اپ . . . ."

ہم نے اپنے چہروں پر خوف کے آثار پیدا کئے اور ہاتھ اوپر اُٹھالئے اور تختہ اٹھا کر باہر نکلے۔ تو کسان اور اس کی بیوی نے ہمیں حیرت سے دیکھا اور جب ان کی نظر ڈِک پر پڑی، جو رائفل تانے خونیں نظروں سے انہیں گھور رہا تھا، تو بے چاروں کی چیخیں نکل گئیں۔ ڈِک نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں چپ رہنے کا اشارہ کیا اور ہمیں دھکیلتا ہوا میدان میں لے آیا۔

دونوں جرمن افسر ٹہلتے ہوئے اس مکان کی طرف آ رہے تھے۔ یکایک ان کی نظریں ہم پر پڑیں اور وہ وہیں رُک گئے۔

ڈِک اب بیچ بیچ ٹھوکریں مار کر ہمیں آگے بڑھا رہا تھا اور ہم ہاتھ اٹھائے بڑی بے بسی سے چل رہے تھے۔ ہم نے دیکھا، کہ جرمن افسروں نے قہقہہ لگایا۔ ایک دوسرے سے کچھ کہا اور اکڑتے ہوئے ہماری جانب آئے۔

وہ نازک موقع لحظہ بہ لحظہ قریب آ رہا تھا جب ہمارا اور ان کا درمیانی فاصلہ پندرہ فٹ کا رہ گیا، تو ڈِک یک لخت کھانسا۔ یہ آواز سنتے ہی ہم اوندھے منہ زمین پر گر پڑے۔ پھر ڈِک کی رائفل شعلے اگلنے لگی۔ اور وہ دونوں جرمن افسر پلک جھپکنے میں ہی دوسری دنیا کی سیر کر رہے تھے۔

"اٹھاؤ۔ ان کم بختوں کو اور لے چلو مکان میں ___ فائر کی آواز سن کر

دوسرے بدمعاش بھی آتے ہی ہوں گے۔" ڈک چلّایا۔ "ان کے ریوالور قبضے میں کر لو۔"

ایک منٹ کے اندر اندر ہم نے دونوں جرمن افسروں کی لاشیں اس تہہ خانے میں پھینک دیں۔ جہاں تھوڑی دیر پہلے ہم خود چھپے ہوئے تھے۔ اتنے میں ڈک ٹرک سٹارٹ کر کے مکان کے قریب لے آیا۔ اور کسان سے کہا: "جتنا سامان رکھ سکتے ہو ٹرک میں رکھ لو۔ ہم تمہیں بھی ساتھ لے چلیں گے۔" پھر وہ ہم سے مخاطب ہوا:

"تم لوگ کس مرض کی دوا ہو —— وحشیوں کی طرح میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو —— ان جرمن افسروں کی وردیاں اتار لو، بعد میں ہمارے کام آئیں گی۔"

ہم دوبارہ تہہ خانے میں اترے اور وردیاں اتار ہی رہے تھے کہ ڈک اندر آیا:

"جرمن سپاہی اس طرف آ رہے ہیں۔ غالباً انہوں نے ہمارے فائر کی آواز نہیں سنی۔ وہ تعداد میں آٹھ ہیں۔ تم اپنے اپنے ہتھیار سنبھال لو اور اِدھر اُدھر چھپ جاؤ۔ میں ان سے ہتھیار رکھوانے کی کوشش کروں گا۔"

کسان اور اس کی بیوی گھاس میں چھپ گئے۔ ہم نے ریوالور سنبھالے اور کواڑوں کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ ڈک دوسری جانب دیوار سے چپک گیا۔

چند لمحے بعد جرمن سپاہیوں کے بولنے کی آوازیں ہمارے کانوں میں آئیں۔ پھر وہ بھاری جوتوں سے لکڑی کے فرش پر کھٹ کھٹ کرتے ہوئے اندر گھس آئے۔ اب وہ ہمارے نشانے کی زد میں تھے۔

"اپنی رائفلیں پھینک کر ہاتھ اٹھا لو۔" ڈک نے جرمن لہجے کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ تو جرمن وردی پہنے اپنے ہی ایک ساتھی

کو رائفل تانے دیکھ کر سٹپٹائے۔ بعض اس پُر لطف مذاق پر ہنسنے لگے۔ اور کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا۔ کہ ڈِک کی رائفل سے گولی نکلی اور سامنے کھڑے ہوتے پہلے سپاہی کے بازو میں لگی۔ ایک دردناک چیخ کے ساتھ وہ وہیں گرا۔ اور تڑپنے لگا۔ اتنی دیر میں ہم اپنے ریوالور سنبھالے سامنے آگئے۔ چشم زدن میں جرمن سپاہی اپنی اپنی رائفلیں پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھائے کھڑے تھے۔

" اپنی پشت میری طرف کر لو۔ اور اس دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ"۔ ڈِک نے کہا: " اگر کسی نے شرارت کی تو بھیجا نکال دوں گا"

انہوں نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی۔ ڈِک نے بڈھے کسان کو اشارہ کیا۔ وہ بھاگتا ہوا اندر گیا اور موٹی موٹی رسیاں اٹھا لایا۔ دس منٹ کے اندر اندر ہم نے ان آٹھوں کو اس طرح باندھ کر ڈال دیا کہ وہ کوشش کے باوجود حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے حلق میں کپڑے کی دھجیاں بھی ٹھونس دی گئی تھیں۔

" بہتر ہے کہ تم لوگ بھی اپنی اپنی وردیاں پہن لو"۔ ڈِک نے کہا۔ "کھانے پینے اور ضرورت کی جتنی چیزیں لے سکتے ہو، لے لو۔ دریائے سومی تک اس ٹرک میں ہم آسانی سے مزاحمت کے بغیر سفر کر سکیں گے۔ ممکن ہوا، تو ان بڑے میاں کو بھی راستے میں کہیں اتار دیں گے"۔

تھوڑی دیر بعد ہمارا ٹرک بیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے اس سڑک پر دوڑ رہا تھا جو نقشے کے مطابق سیدھی دریائے سومی کے کنارے پر نکلتی تھی۔ تین میل تک کوئی متنفس راستے میں نہ ملا۔

چوتھا میل شروع ہوتے ہی سڑک کے عین درمیان ایک چھوٹی سی جرمن چوکی نظر آئی۔ جہاں دو مسلح پہرے دار ڈیوٹی دے رہے تھے۔ لکڑی کا ایک کھمبا سڑک بند کئے ہوئے تھا۔ ٹرک کو دیکھتے ہی یہ کھمبا اٹھا لیا گیا۔ پہرے

واردوں نے سیلوٹ کیا۔ اور ہم بھی جواب میں فوجی سیلوٹ کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

"خدا کا شکر ہے ہم اِس چوکی سے نکل آئے" بڈھے نے کہا۔ "اب آپ ہمیں کسی بھی درمیانی گاؤں میں چھوڑ سکتے ہیں"

ہم جس سڑک پر جا رہے تھے۔ اس پر جرمن فوجی گاڑیوں کی آمد و رفت کثرت سے جاری تھی۔ لیکن کسی نے ہمیں روکنے یا کچھ پوچھنے کی کوشش نہ کی۔ مخالف سمت سے آنے والا کوئی ٹرک ہمارے قریب سے گزرتا، تو اندر بیٹھے ہوئے جرمن سپاہی ہماری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتے اور ہنستے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔

کوینڈ کے نواح میں ریلوے پُل کے قریب ایک دوسری چوکی پر ہمیں روکا گیا، کیونکہ ٹریفک ایک طرف سے جاری تھی۔ ہم دھڑکتے دل سے جرمن سنتریوں کو دیکھ رہے تھے، اور یہ ڈر تھا کہ شاید وہ ہم سے کسی پاس کا مطالبہ کریں۔

ڈِک نے کمال ہوشیاری سے چارلس کو اپنی جگہ ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھایا اور مجھے بھی آنکھ کے اشارے سے خبردار رہنے کی ہدایت کی۔ ٹرک کی تینوں سائڈوں میں کینوس پڑا ہوا تھا۔ اور جس کی رسیاں ہم نے پہلے ہی سے کس دی تھیں، تاکہ اندر بیٹھے ہوئے کسان میاں بیوی نظر نہ آئیں۔

ہمارے ٹرک کے آگے تین ٹرک اور رُکے ہوئے تھے، اور جرمن سنتری اُن کے ڈرائیوروں کے قریب کھڑے نہ جانے کیا کھسر پھسر کر رہے تھے ـــــ ڈِک نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا، اور میرے کان میں کہا:

"بُرے پھنسے . . . . وہ ان سے فارغ ہو کر ہمارے پاس بھی

آئیں گے۔ اور مصیبت یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی جرمن زبان روانی سے نہیں بول سکتا۔"

"وہ تعداد میں صرف تین ہیں . . . . . . ان سے نمٹ لینا کچھ مشکل نہیں ۔" چارلس نے جواب دیا اور کھڑکی سے سر باہر نکال کر بڑی ہی بے تکلفی سے ہاتھ ہلا کر جرمن سنتریوں کو اس قسم کا اشارہ کیا۔ جس سے وہ سمجھیں کہ ہم جلدی جانا چاہتے ہیں۔ سپاہیوں نے جواباً ہاتھ ہلایا اور اونچی آواز میں کچھ کہا جس سے ہمارے پلے کچھ نہ پڑا۔

"جیمز، تیار ہو جاؤ۔" ڈک نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ "ٹرک کے پچھلے حصے سے کینوس کھول کر وہیں جا بیٹھو، اپنا ریوالور بھی سنبھال لو، چارلس، تم اس تیسرے سپاہی کا خیال رکھو اور اشارہ ملتے ہی اسے گولی سے اڑا دینا۔ بقیہ دونوں سپاہی ہم سے پوچھ گچھ کرنے آئیں گے۔"

میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ٹرک کے پچھلے حصے میں جا بیٹھا اور کینوس اتنا کھول دیا کہ ضرورت کے وقت آسانی سے باہر کود سکتا تھا۔

دو منٹ بعد ہمارے آگے کھڑے ہوئے تینوں ٹرک سٹارٹ ہوتے اور پل پار کرنے لگے۔ اب سنتریوں نے ہماری طرف قدم بڑھاتے۔ ڈک اپنی کلائی باہر نکال کر بار بار وہ گھڑی دیکھ رہا تھا۔ جو اس نے جرمن افسروں کو مار کر حاصل کی تھی۔ غالباً وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔

دونوں جرمن سنتری ٹرک کی دائیں بائیں کھڑکیوں کے پاس آن کر کھڑے ہو گئے۔ تیسرا پُل کے دروازے ہی پر پہرہ دے رہا تھا۔ میں بے حس و حرکت بیٹھا ترچھی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

بائیں جانب کھڑا ہوا آدمی چارلس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور کچھ کہے

بغیر اپنا ہاتھ اس انداز میں آگے بڑھایا جیسے کچھ طلب کر رہا ہو۔ یقیناً وہ کاغذات دیکھنا چاہتا تھا۔

چارلس نے گردن ہلائی اور ڈِک کی طرف اشارہ کر دیا۔ پہلا سپاہی ہنستا ہوا دوسری طرف جانے لگا۔ میں نے ڈِک کے کھنکارنے کی آواز سُنی اور آہستہ سے کینوس اٹھا کر باہر نکل آیا۔

میں نے ٹرک کی اوٹ سے دیکھا کہ کھڑکی کھلی، ڈِک نیچے اُتر آیا۔ اور پریشانی کے عالم میں اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ دونوں جرمن سپاہی حیرت سے ڈِک کی طرف دیکھ رہے تھے۔

یکایک ڈِک نے گردن جھکائی اور پوری قوت سے آگے کھڑے ہوئے سنتری کی ناک پر ٹکر ماری۔ یہ ضرب اتنی شدید اور غیر متوقع تھی کہ وہ لڑکھڑا کر دُور جا گرا۔ ڈِک چیتے کی مانند اُس پر جھپٹا۔ اور اب میرے لئے راستہ صاف تھا۔ اس سے پیشتر کہ دوسرا سنتری ڈِک پر فائر کرے، میرے ریوالور کی ایک گولی اس کے بھیجے کے پار ہو گئی۔

پُل پر کھڑے تیسرے سپاہی نے یہ تماشا دیکھا، تو اس نے بدحواس ہو کر پُل سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ چارلس ٹرک سے اُتر کر پُل کی طرف دوڑا — ڈِک سنتری کی گھونسوں سے تواضع کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد ہی اس کے کپڑے خون سے تر ہو گئے اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ ہم نے اُسے اٹھا کر کھائی میں پھینک دیا۔ چارلس پُل پر کھڑا فائرنگ کر رہا تھا۔ ڈِک نے اُسے آواز دی:

"وقت ضائع نہ کرو۔ آؤ اب یہاں سے کھسک چلیں، راستہ صاف ہے۔"

اندر کسان اور اس کی بیوی خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ جرمن سنتریوں کا خاتمہ ہوا تو اُن کی جان میں جان آئی۔

ڈک نے ٹرک سٹارٹ کیا اور پوری رفتار پر چھوڑ دیا۔ دو میل کے بعد آبادی کے آثار نظر آئے۔ کسان نے بتایا کہ اس قصبے کا نام مون چکس ہے اور یہاں اس کے رشتے دار رہتے ہیں۔ اگر ہم پسند کریں، تو وہ پناہ دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔

ڈک کا بھی یہی خیال تھا کہ چونکہ شام ہو گئی ہے اور جلد یا بدیر پل پر ہونے والے حادثے کی خبر جرمنوں تک پہنچ جائے گی۔ اس لئے کہیں پناہ لینی ضروری ہے اور اس ٹرک سے بھی پیچھا چھڑانا ہوگا۔

گاؤں میں زندگی کے بظاہر کوئی آثار نظر نہ آتے تھے، ممکن ہے سورج غروب ہونے کے بعد لوگوں کو گھروں سے باہر نکلنے کی اجازت نہ دی جاتی ہو۔ ہم نے کسان اور اس کی بیوی کو گاؤں کی طرف روانہ کیا۔ ٹرک میں سے وہ تمام سامان نکالا جس کی ہمیں ضرورت پڑ سکتی تھی اور ٹرک کو ایک کھڈ کے اندر دھکیل دیا۔

ہر طرف ہیبت ناک سناٹا طاری تھا۔ ہم سڑک سے ہٹ کر درختوں کے جھنڈ میں چلے گئے۔ کیونکہ ٹریفک کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھی۔ پل والے حادثے کے بعد ہمارا یوں مشتبہ حالت میں پھرنا خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ آدھ گھنٹے بعد بڈھا کسان دور سے آتا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ دو نوجوان اور تھے۔ جب وہ سڑک پر کسی جرمن ٹرک کی ہیڈ لائٹس دیکھتے، تو وہیں دبک جاتے اور ٹرک گزر جانے کے بعد آگے بڑھتے۔ جب وہ قریب آئے تو ہم نے اپنی کمین گاہ سے نکل کر انہیں آواز دی۔

بڈھے کے ساتھ آنے والے نوجوان بلجیم کے رہنے والے تھے اور اب اپنے وطن واپس جانا چاہتے تھے۔ لیکن جرمنوں کا خوف اس حد تک اُن پر طاری تھا کہ کوئی فیصلہ کُن قدم اٹھانے سے قاصر تھے۔

بڈھا کسان انہیں ہمارے کارناموں سے آگاہ کر چکا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ ہمارے استقبال کے لئے اپنی جان پر کھیل کر گاؤں سے باہر آگئے تھے۔ کیونکہ جرمن اُن کی تلاش میں تھے۔ معلوم ہوا کہ اُن کا ایک اور ساتھی گاؤں میں موجود ہے۔ اُس کی ٹانگ پر پھوڑا نکل آیا ہے۔ جس کے باعث وہ چل نہیں سکتا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ گاؤں میں پچاس ساٹھ افراد موجود ہیں۔ لیکن وہ سب کے سب عمر رسیدہ ہیں۔

گاؤں میں داخل ہوئے، تو کتّوں نے حشر برپا کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہ موذی حیوان ہماری آمد کے منتظر ہی تھے۔ مون چکس کی گلیاں اور بازار ویران اور مکان تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

ہمارے قدموں کی آہٹ سُن کر کچھ لوگوں نے کھڑکیوں میں سے جھانکا اور ہمیں جرمن سمجھ کر کھڑکیاں بند کر دیں۔ اپنے ساتھیوں کی رہنمائی میں مون چکس کی درمیانی گلی سے گزرتے ہوئے ہم شمال کی طرف بڑھے اور فورٹ موہون تک پہنچ گئے۔ راستے میں بڈھا کسان اور اس کی بیوی ہم سے جدا ہو گئے اور کسان کہنے لگا کہ وہ صبح کسی وقت فورٹ موہون آکر ہم سے ملے گا۔

فورٹ موہون وہ مقام تھا جہاں ہمارے بلجیمی دوست چھپے ہوتے تھے۔ یہ ایک وسیع و عریض دلدلی میدان تھا۔ جہاں قدم قدم پر بے شمار رکاوٹیں کھڑی تھیں اور یہاں جرمنوں کے ٹرک آسکتے تھے نہ جیپ گاڑیاں، اسی لئے بلجیمی نوجوانوں نے اِس مقام کا انتخاب کیا تھا۔ مغرب کی طرف ایک ڈیڑھ فرلانگ گھٹنوں گھٹنوں تک گہری دلدل میں چلنے کے بعد ایک پُرانی اور بوسیدہ عمارت کے آثار دکھائی دیتے۔

دن بھر یہ نوجوان اس عمارت کے ایک تہہ خانے میں چھپے رہتے اور رات کو گاؤں میں آکر کھانے پینے کی چیزیں لے جاتے۔ ابتدا میں انہوں نے بلجیم کی سرحد پار کرنے کی کوشش کی اور ایک مرتبہ تو جرمنوں کے نرغے میں بھی آگئے

لیکن دو ہفتے بعد قید سے نکل جانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ تینوں آدمی انجینئر تھے، اور ان سے جرمنوں نے دن رات پل اور سڑکیں بنوانے کا کام لیا تھا۔

جب ہم تاریک تہہ خانے کے اندر اُترے۔ تو موم بتی کی کانپتی ہوئی مدھم روشنی میں تیسرا شخص گھاس کے بستر پر لیٹا دکھائی دیا۔ اس کی دائیں ٹانگ پر دھجیاں بندھی ہوئی تھیں، ہمیں جرمن وردیوں میں دیکھ کر اس کا منہ دہشت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس نے اُٹھنے کی کوشش کی، مگر کروٹ کے بل گر گیا۔ اُس کے ساتھیوں نے جلدی جلدی ہمارے متعلق اُسے بتایا تو اُسے کچھ حوصلہ ہوا تاہم خوف اب بھی اس کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کھانے پینے کا جو سامان لائے تھے، اس میں نئے دوستوں کو بھی شریک کیا۔

بلجی نوجوانوں نے بتایا کہ دریائے سومی کی کڑی نگرانی کی جارہی ہے اور جرمنوں نے مقامی ملاحوں اور مچھیروں کی تمام کشتیاں اپنے قبضے میں کرلی ہیں۔ اُن کی اجازت کے بغیر کوئی شخص دریا کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا۔ وہاں نہ صرف طیارہ شکن توپیں نصب ہیں، بلکہ اسلحے اور ایندھن کے ذخائر بھی ہیں۔ جرمنوں کو خدشہ ہے کہ برطانیہ کے جاسوس اور مفرور قیدی ان ذخائر کو کسی بھی وقت نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ اس لئے وہ بہت محتاط ہو گئے ہیں۔

"جو واقعات آپ پر گزرے ہیں، وہ ہمارے لئے حیرت انگیز ہیں۔" ایک بلجی نوجوان بولا۔ اس کا نام برزد، دوسرے کارینی اور تیسرے کو کرگیہ کہتے تھے۔ "آپ نے جس طرح یہ جرمن وردیاں اور ہتھیار حاصل کئے ہیں، اس پر ہم آپ کو مبارک باد دیتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ آپ یہاں سے نکل جانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارا کیا بنے گا؟ کیا آپ ہماری کوئی

مدد نہیں کر سکتے؟"

"ہم ہر ممکن خدمت کے لیے حاضر ہیں،" ڈِک نے کہا۔ "دریا یہاں سے بالکل نزدیک ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ چند منٹ آرام کرنے کے بعد آپ میں سے کسی کو دریا تک لے جاؤں اور دیکھوں کہ جرمنوں نے وہاں کیا کچھ انتظام کر رکھا ہے۔ جب تک ان تمام حالات کا بغور جائزہ نہ لیا جائے گا، ہم اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کیا اتحادی طیاروں نے کبھی اس علاقے پر بم برسانے کی کوشش کی ہے؟"

"صرف ایک بار،" کریگ نے جواب دیا۔

"وہ تعداد میں تیس چالیس طیارے تھے، لیکن جب جرمن طیارہ شکن توپوں کے دہانے کھلے، تو ان میں سے بیشتر فضا ہی میں تباہ ہو گئے اور باقی اپنی جانیں بچا کر بھاگ گئے۔ جرمن توپچیوں کے نشانے اس قدر صحیح ہوتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اتحادی بمباروں نے جتنے بھی بم برسائے، ان میں سے بہت کم صحیح نشانوں پر لگے۔ اور اکثر بم تو دریا ہی میں گر جاتے تھے۔"

"کیا دریا کے دونوں کنارے جرمنوں کے قبضے میں ہیں؟" چارلس نے پوچھا۔

"جی ہاں، ہمارے مشاہدے کے مطابق تو یہی صورت تھی۔ ایک ماہ سے ہمیں دریا کی طرف جانے کا موقع نہیں ملا۔ اس لئے یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ اب کیا معاملہ ہے، بہر حال دونوں کناروں پر ان کی طیارہ شکن توپیں نصب ہیں۔ اور جا بجا زمین دوز مورچوں میں ٹینک بھی کھڑے ہیں۔ دریا کی نگرانی دن رات ہوتی ہے اور آمد و رفت ڈبل پُل سے ہوتی ہے۔ جس کے اوپر سڑک ہے اور نیچے ریلوے لائن۔ ہمارے لئے اس پُل کے ذریعے دریا پار کرنا ناممکن ہے، البتہ کشتی کا انتظام ہو جائے، تو بہت آگے جا کر رات کے اندھیرے میں دریا عبور کر سکتے ہیں۔"

اِسی طرح کی باتیں کرتے اور مختلف تجاویز پر بحث کرتے ہوئے ہم اونگھتے رہے۔ رات کے تین بجے تھے کہ مسلسل فائروں کی آواز سے ہم ہوشیار ہو گئے۔ یہ آوازیں گاؤں کی طرف سے آ رہی تھیں۔ پھر دستی بم پھٹنے کے دھماکے بھی سنائی دینے لگے۔ اِن دھماکوں میں مردوں اور عورتوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔

"گاؤں والوں پر آفت آ گئی۔" کمرینگ نے کہا۔ "جرمن آپ لوگوں کی تلاش میں آئے ہیں اور وہ جنگل میں نہ صرف آگ لگائیں گے۔ بلکہ گاؤں کو بھی تباہ کر دیں گے۔ انہوں نے پہلے بھی دھمکی دی تھی کہ اگر کسی شخص نے اتحادی جاسوسوں یا مفرور قیدیوں کو پناہ دی، تو اِس گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔

ہم اپنی کمین گاہ سے آگ اور خون کا یہ کھیل دیکھنے کے لئے باہر نکلے۔ پورا گاؤں شعلوں کی لپیٹ میں تھا اور اِکا دُکا فائروں کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں

"کہیں ایسا تو نہیں کہ جرمن اِدھر آ جائیں؟"

آج تک تو اِدھر نہیں آئے۔ دراصل انہیں دلدل میں گھستے ہوئے ڈر لگتا ہے۔" بلجمی نوجوان نے جواب دیا۔

"بہرحال اب ہمارا زیادہ دیر تک یہاں رُکنا خطرناک ہے۔" ڈِک نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"آپ میں سے ایک صاحب تو چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ ان کے متعلق میں بڑا فکرمند ہوں۔"

"جناب! آپ میری فکر نہ کیجیے۔" زخمی نوجوان نے کہا۔ "میرے ساتھیوں کو کسی نہ کسی طرح اِس منحوس جگہ سے نکال لے جایئے۔ زندگی رہی تو میں بھی ان سے آ ملوں گا۔"

"مجھے اِس وقت جرمن زبان پر عبور نہ ہونے کا سخت افسوس ہو رہا ہے" ڈِک نے کہا، "ورنہ ہم کبھی کے دریا تک پہنچ چکے ہوتے۔ زبان نہ جاننے کے سبب قدریاں

اور یہ ہتھیار سب بے کار ہیں، ہم کسی بھی وقت چوہوں کی مانند پکڑے جا سکتے ہیں، ہم اِن وردیوں کے باعث کسی حد تک بچ بھی سکتے ہیں۔ لیکن آپ لوگ کیا کریں گے!"

"ہم آپ کے ساتھ نہیں جائیں گے، بلکہ آپ کا تعاقب کریں گے۔" رینی نے کہا۔ "آپ کا کام صرف راستہ صاف کرنا ہوگا۔ اور مجھے یقین ہے کہ جیٹی پر ایک بار پہنچ جانے کے بعد آپ کوئی نہ کوئی کشتی حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔"

"کیا جیٹی کی نگرانی نہیں کی جاتی؟" میں نے پوچھا۔

"نگرانی تو کی جاتی ہے۔ لیکن ہماری معلومات کے مطابق صبح چار بجے سنتریوں کی ڈیوٹیاں بدلتی ہیں۔ رات کے جاگے ہوئے سنتری ویسے بھی غنودگی کے عالم میں ہوتے ہیں اور ان کی جگہ آنے والے ہمیشہ چند منٹ کی تاخیر سے پہنچتے ہیں۔ یہی وہ چند منٹ ہیں جب جیٹی خالی ہوتی ہے اور اگر۔ ۔ ۔"

"شش۔ ۔ ۔ ۔ چپ ہو جاؤ۔" ڈک نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سب کو ہی خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنی رائفل اٹھا کر تہہ خانے سے باہر نکل گیا۔ ہمارے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ بلجیمی نوجوان نے جلدی جلدی اپنی ضروری چیزیں سمیٹنا شروع کیں۔ اور کریگ کو خود ساختہ سٹریچر پر لیٹ جانے کی ہدایت کی۔ یکایک ڈک اندر آیا اور کہنے لگا:

"وہ لوگ ادھر ہی آ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ کتے بھی ہیں۔ ۔ ۔ جلدی کرو۔ یہاں سے نکل چلو۔"

پلک جھپکنے میں ہم تہہ خانے سے باہر تھے۔ رینی کی ہدایت کے مطابق ہم مشرق کی طرف بھاگنے لگے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور دور مغربی افق پر بجلی چمک رہی تھی۔ بارش یقیناً ہونے والی تھی۔

"یہ سڑک قصبہ لی کروٹائے کی طرف جاتی ہے۔" رینی نے ہانپتے ہوئے کہا۔ وہ اور ریوزر اپنے زخمی ساتھی کا سٹریچر اٹھائے ہوئے دوڑ رہے تھے۔ "ہم اس سڑک پر کہیں چھپ سکتے ہیں۔ جرمن اِدھر نہ آئیں گے۔ وہ سمجھیں گے کہ ہم شہر

کی طرف نہیں جاسکتے، وہ شمال کی طرف جنگل کا رُخ کریں گے۔"

"میرا خیال ہے۔ آج ہی جیٹی پر قسمت آزمائی کی جائے۔" ڈِک نے کہا "چار بجنے میں دیر ہی کتنی ہے اور اگر بارش شروع ہوگئی تو ہمیں جیٹی تک پہنچنے میں بڑی مدد ملے گی۔"

اب ہم صنوبر کے درختوں کے ایک گنجان جھنڈ میں سے گزر رہے تھے۔ بجلی چمکتی، تو راستہ ایک ثانیے کے لئے نظر آتا اور پھر وہی گھُپ اندھیرا۔ ٹھوکریں کھاتے اور گرتے پڑتے آگے ہی بڑھتے رہے۔ عقب میں کتّوں کے بھونکنے کی آوازیں ہماری رفتار اور تیز کر دیتی تھیں۔

ڈِک کی ہدایت پر ہم نے رُک کر اپنے پیروں سے جوتے کھولے اور ان کے تسموں کو گرہ دے کر گردنوں میں ڈال لیا۔ ان جوتوں کی وجہ سے ہم بار بار پھسلتے تھے۔ دریا کی طرف سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے مسلسل آنے لگے اور ابھی ہم نے ایک ڈیڑھ میل کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ بارش شروع ہوگئی۔ اور اس انداز میں شروع ہوگئی کہ خدا کی پناہ ـــ بارش کے تھپیڑے برچھیوں کی مانند ہمارے چہروں پر پڑنے لگے، لیکن اب رُکنے کا موقع نہ تھا۔

"دریا قریب آگیا ہے۔" ربنی نے بتایا۔ ہم نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر ایک دومنزلہ عمارت کی سب سے اونچی کھڑکی سے وقفوں کے بعد فلش لائٹ چاروں طرف پھینکی جارہی ہے۔ دریا کی طرف سے بھی اس کے جواب میں اسی قسم کی روشنی نمودار ہوتی تھی۔

"آپ لوگ یہیں ٹھہریں۔" ڈِک نے چہرے سے پانی کے قطرے پونچھتے ہوئے بلجمی نوجوانوں سے کہا۔ "ہم کشتی کی تلاش میں جاتے ہیں، کشتی مل گئی تو ہم میں سے ایک آدمی آپ کو بلانے آئے گا، شاید ڈیوٹیاں بدلنے والی ہیں۔"

موسلا دھار بارش میں کریگ کا سٹریچر رکھ دیا گیا اور دونوں بلجمی اس کے قریب بیٹھ گئے۔ ڈِک نے مجھے اور چارلس کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور چند

منٹ کے بعد ہم ہاتھ اور پیروں کے بل چلتے ہوئے اِس دو منزلہ عمارت کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"نہایت احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے" ڈک دبی آواز میں کہنے لگا "مجھے کوئی سنتری نظر نہیں آرہا۔ شاید وہ بارش سے بچنے کے لئے عمارت کے اندر چلے گئے ہیں . . . وہ جیٹی نظر آرہی ہے۔ لیکن وہاں کچھ سپاہی موجود ہیں۔ جیٹی کے قریب کچھ لانچیں اور چھوٹی کشتیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ دریا پوری طرح سے چڑھا ہوا ہے۔ اور ہم اگر کامیاب ہو گئے۔ تو یقیناً بہت جلد سمندر میں داخل ہو جائیں گے"

اب ہم اس عمارت سے صرف تیس فٹ دُور گھاس میں لیٹے ہوئے سوچ رہے تھے کہ کیا کریں۔ یکایک اس کے صدر دروازے سے ایک سپاہی نکلا اور جیٹی کی طرف چلا۔ پھر دوسرا، تیسرا اور چوتھا سپاہی بھی باہر آیا۔ اُنہوں نے برساتیاں پہن رکھی تھیں۔ جیٹی اور اِس عمارت کا درمیانی فاصلہ ڈیڑھ سو گز سے زیادہ نہیں تھا۔

"ڈیوٹی بدل گئی" ڈک نے مضطرب ہو کر کہا "یہ سپاہی جیٹی پر جا رہے ہیں اس کا مطلب ہے کہ اس وقت وہاں بھی چار ہی سنتری ہوں گے۔ اگر ہم انہیں راستے ہی میں جا لیں اور کچھ دیر تک ان پر قابو پالیں، تو پہرے دار سپاہی ٹھیک وقت پر جیٹی چھوڑ کر عمارت کی طرف آجائیں گے۔ پھر ہمیں روکنے والا کوئی نہ ہوگا۔ اور سورج نکلنے تک ہم ان کی قید سے آزاد ہوں گے" پھر وہ چارلس کی طرف مُنہ کر کے کہنے لگا:

"چارلس، بلجی نوجوانوں کو لے آؤ۔ میں جیمز کو ساتھ لئے جاتا ہوں۔ اِن چاروں کو روکنے کے لئے ہم دو کافی ہیں۔ میں جیٹی پر پہنچ کر تمہیں ٹارچ کے ذریعے سگنل دوں گا۔ کسی تاخیر کے بغیر وہاں پہنچنا ہوگا۔ ورنہ تم ہمارے ساتھ نہ جا سکو گے۔ سگنل دینے کے بعد صرف دو منٹ تک انتظار کروں گا، یہ ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ تمہیں

صرف دو منٹ میں طے کرنا ہے۔ سمجھ گئے ؟" چارلس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور پیچھے لوٹ گیا۔

جرمن سپاہی ابھی تیس گز دُور ہی گئے تھے کہ ہم نے ایک چکر کاٹ کر انہیں جا لیا۔ دو سپاہی آگے تھے اور دو ان سے کچھ پیچھے۔ یہ اس مہم کا سب سے نازک اور انتہائی خطرناک مرحلہ تھا اور اس کی کامیابی پر ہماری جانوں کی سلامتی کا دار و مدار بھی تھا۔ وہ ہم سے بے خبر آپس میں باتیں کرتے جا رہے تھے کہ ہم نے پیچھے سے رائفلوں کے کُندے پوری قوت سے دونوں سپاہیوں کے سر پر دے مارے، وہ کوئی آواز نکالے بغیر ہی ڈھیر ہو گئے۔ دونوں طرف سے گھومتی ہوئی فلش لائٹ، بجلی کی چمک اور موسلا دھار بارش کے باعث آگے جانے والے سپاہیوں کو پتہ ہی نہ چلا کہ ان کے دو ساتھیوں پر کیا بیت گئی ہے۔ ہمیں یقین نہ تھا کہ اس آسانی سے یہ مہم سَر ہو جائے گی، ہمارے حوصلے بڑھ گئے۔ جیٹی اب سو گز دُور تھی . . . . اب ہم اگلے دونوں سپاہیوں پر وہی حربہ آزمانے کے لئے بالکل مستعد تھے کہ یک لخت ڈِک کا پیر کیچڑ میں پھسلا اور وہ مُنہ کے بل گرا۔ اس کے گرتے ہی دونوں سپاہی پیچھے مُڑے۔ اب میرے لئے فائر کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ میں نے سٹین گن سیدھی کی اور چند ثانیے کے اندر اندر انہیں بھُون دیا۔

"غضب کر دیا" ڈِک چلّایا "تمہیں فائر ہرگز نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ تم تو خود جرمن وردی میں ہو۔ وہ بلاتحقیق تم پر فائر نہ کرتے، اور اتنی دیر میں ہم ان دونوں پر قابو پا لیتے۔"

وہ کیچڑ میں سے اُٹھا اور جیٹی کی طرف دیکھنے لگا "تعجب ہے۔ فائر کی آوازیں جیٹی پر موجود سپاہیوں نے نہیں سُنیں۔ لو دیکھو، وہ ڈیوٹی ختم کر کے چل پڑے ہیں۔ یہ ان کا خیال ہے کہ دوسرے پہرے داروں سے راستے ہی میں مل لیں گے۔ تم دائیں جانب چکر کاٹ کر جیٹی کی طرف پہنچنے کی کوشش کرو۔ میں بھی تمہاری طرف پیچھے آ رہا ہوں ٹارچ کا خیال رکھنا۔ سگنل کے لئے اس کی ضرورت پڑے گی۔"

جیٹی والے سپاہی بلاشبہ اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے، اور آہستہ آہستہ عمارت کی طرف جا رہے تھے۔ راستہ صاف تھا۔ ہم کچھوؤں کی طرح رینگتے ہوئے جیٹی کی طرف بڑھنے لگے اور پانچ منٹ بعد ہم اس کے بالکل نیچے کھڑی ہوئی ایک جرمن لانچ میں کود گئے۔ جس میں مشین گن لگی ہوئی تھی۔ میں نے ٹارچ سے بار بار اپنے ساتھیوں کو سگنل دیا۔ اس وقت ایک ایک لمحہ صدیوں کی مانند گزر رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد عمارت کی اوٹ سے جواب میں ٹارچ روشن ہوئی اور بجھ گئی۔

"یہ ملجھی انجنیئر سارا کام خراب کر دیں گے۔ اُف . . . . انہیں اب تک پہنچ جانا چاہیئے۔ بخدا، میں دو منٹ سے زیادہ نہ رکوں گا۔ لانچ کا انجن سٹارٹ کر دو، وہ آ رہے ہیں"۔

کچھ فاصلے پر ہم نے چند سایوں کو دوڑتے ہوئے دیکھا۔ ایک دو مرتبہ وہ فلش لائٹ کی زد میں بھی آئے۔ اور ابھی وہ جیٹی سے پچاس گز دُور تھے کہ عمارت پر لگے ہوئے سائرن چلا اٹھے اور اتنی سرچ لائٹیں روشن ہوگئیں کہ دُور دُور تک کا سارا علاقہ روشنی میں نہا گیا۔ عمارت کے سائرن بجتے ہی دریا کی طرف سے بھی سائرن بجنے لگے۔ اور پھر جیسے سینکڑوں مشین گنوں کے منہ کھل گئے۔ گولیاں سنسناتی ہوئی ہمارے دائیں بائیں اور اوپر سے گزر رہی تھیں۔ اور ہم لانچ کے اندر لیٹے دل ہی دل میں ملجھی انجنیئروں کو کوس رہے تھے۔ اگر چارلس ان کے ساتھ نہ ہوتا۔ تو ہم اتنی دیر میں لانچ کو لے کر کہیں کے کہیں نکل گئے ہوتے۔

اتنے میں ملجھی انجنیئر آ گئے۔ انہوں نے پہلے سٹریچر لانچ میں پھینکا۔ پھر خود چھلانگیں لگا کر لانچ میں کُود گئے۔

"چارلس کہاں ہے؟" ڈِک نے غضب ناک ہو کر کہا:

"وہ تھوڑی دیر پہلے ہمارے ساتھ تھا۔ غالباً اُسے گولی لگی ہے۔ اور راستے میں پڑا ہوا ہے"۔

"کتنی دُور؟"

"قریب ہی ہے۔ اس نے کتنی مرتبہ اُٹھنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ ہم اُسے اپنے ساتھ لے آتے، مگر اس نے رائفل ہم پر تان لی، اور کہا بھاگ جاؤ۔ ورنہ فائر کر دوں گا۔ اس کا دماغ اُلٹ گیا ہے۔" رینی تھر تھر کانپتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"کیا خیال ہے جیمز، لانچ چلا دی جائے؟" ڈک نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"ہرگز نہیں" مَیں چلّایا۔ "مَیں چارلس کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا، وہ میرا پرانا دوست ہے، ہم اکٹھے ہی مریں گے۔" اور اس سے پہلے کہ ڈک مجھے روکے، مَیں لانچ سے باہر نکلا۔ برستی گولیوں میں جیٹی پر آیا اور چارلس کی تلاش میں دیوانہ وار دوڑا، لیکن اب پانسہ پلٹ چکا تھا۔ مَیں نے دیکھا کہ چارلس مجھ سے بے خبر لنگڑاتا ہوا جیٹی کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ مَیں نے اُسے لانچ میں کودتے دیکھ لیا تھا۔ میرے بازو میں ایک گولی لگی اور مَیں جیسے تاریکی کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔

جیمز ہارگیسٹ کی خود نوشت داستان یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ گولی لگنے سے زخمی ہو کر وہ بے ہوش ہو گیا۔ اور جرمنوں نے اُسے پکڑ کر دوبارہ کیمپ میں بھیج دیا۔ وہ جنگ ختم ہونے کے بعد رہا ہو کر اپنے وطن پہنچا۔ اس دوران میں ڈک اور چارلس بخیر و عافیت لانچ سمیت اتّحادیوں کے پاس پہنچ جانے میں کامیاب ہو گئے۔

فیوہرر

مضمون نگار ہینز لینگی کا شمار ان افراد میں ہے جنہوں نے جرمنی کے آمر اڈولف ہٹلر کو دس سال تک بہت قریب سے دیکھا ہے اور اس کی پرائیویٹ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں، جس سے وہ واقف نہ ہو۔ یہی وہ آخری شخص ہے جس نے ہٹلر کو زندہ دیکھا اور یہی وہ پہلا شخص ہے جس نے ہٹلر کو مرے ہوئے پایا۔ گیارہ سال تک روسی بیگار کیمپوں میں موت سے بدتر زندگی بسر کرنے کے بعد ۱۹۵۵ء میں ہینز لینگی کو رہا کیا گیا۔ بعد ازاں اس نے جرمنی زبان میں ہٹلر کی زندگی کے چشم دید حالات تحریر کئے ہیں اور اس کتاب کا نام "مائن فیوہرر" رکھا۔ یہ دلچسپ مضمون اسی کتاب سے لیا گیا ہے۔

تیس اپریل ۱۹۴۵ء کی سہ پہر کا ذکر ہے۔ برلن میں ہٹلر کے زیر زمین فوجی ہیڈکوارٹرز اور رہائش گاہ میں ایک ہولناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہٹلر کے ذاتی خدمت گار کی حیثیت سے میں "میپ روم" کے باہر کھڑا تھا۔ چار بجنے میں دس منٹ باقی تھے کہ کمرے میں فائر کی ہلکی سی آواز گونجی جس کا مطلب تھا کہ نازی آمر نے اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیا ہے۔

یہ حادثہ میرے لئے غیر متوقع نہ تھا، کیونکہ کئی روز پہلے مجھے خود ہٹلر بتا چکا تھا کہ وہ اور اس کی محبوبہ ایوا براؤن اکٹھے ہی مرنے کا ارادہ کر چکے ہیں۔ روسی فوجوں نے تقریباً برلن پر قبضہ کر لیا تھا اور دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ہمیں ہر وقت یہی خدشہ رہتا تھا کہ اب ہم ان کے قیدی بننے والے ہیں۔ عین اسی وقت جب میں پتھر کے مجسمے کی مانند اپنی جگہ پر کھڑا تھا، دور فاصلے پر روسی توپ خانے اور مشین گنوں کے چلنے کی آوازیں آئیں۔ اب وقت

ضائع کرنا بے سُود تھا۔ عام حالات میں شاید میرے لئے ہٹلر کے کمرۂ خصوصی میں داخل ہونا ممکن نہ ہوتا، لیکن چونکہ میں اپنے آقا کی وصیت پوری کرنے کا عہد کرچکا تھا۔ اس لئے پوری ہمت اور جرأت کے ساتھ میں کمرے میں داخل ہوُا۔ میں نے جو منظر اس کمرے میں دیکھا اسے میں ساری عمر فراموش نہ کرسکوں گا۔

نازی آمر کی لاش ـــــ جس سے کسی وقت یورپ کی تمام سلطنتیں تھر تھر کانپتی تھیں، ایک آرام دہ کوچ پر اس طرح پڑی تھی جیسے بیٹھے بیٹھے کسی شخص پر غنودگی سی طاری ہوگئی ہو۔ اس کی دائیں کنپٹی پر ایک ننھا سا سوراخ تھا جس میں سے گاڑھے سُرخ خون کی ایک پتلی سی دھار نکل کر اس کے رخسار پر گر رہی تھی۔ فوجی وردی اس کے جسم پر تھی جو میں نے اُسی روز صبح استری کر کے اسے دی تھی۔ لاش کے قریب ہی سات اعشاریہ ۶۵ کا ایک پستول فرش پر پڑا تھا۔ اس پستول سے کوئی ایک گز دور دوسرا پستول بھی مجھے دکھائی دیا۔

فیوہرر کی لاش کے ساتھ ہی اس کی محبوبہ "ایوا براؤن" کا بے روح جسم موجود تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ہٹلر سے چند منٹ پہلے ہی مرچکی تھی۔ اس کی پیشانی یا جسم کے کسی حصے پر پستول کی گولی کا نشان نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے زہر سے بھرا ہوُا کیپسول کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کیا ہے۔ اسے کھا کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ مری نہیں بلکہ سکون کی نیند سو رہی ہے۔

تیس اپریل ۱۹۴۵ء کی یادگار صبح حیرت انگیز واقعات کے ساتھ نمودار ہوئی تھی اور مجھے اس وقت اندازہ ہوگیا تھا کہ آج کا دن فیوہرر پر بھاری ہے کیونکہ صبح ہی سے اس پر اضطراب اور ہیجان انگیز کیفیت طاری تھی۔ وہ کتّے پالنے کا بے حد شائق تھا اور ان کی ذرا سی تکلیف پر بے چین ہو جایا کرتا تھا۔ بلونڈی نام کے ایک السیشن کتّے سے تو اسے عشق تھا۔ اس کے علاوہ دو کتّے اور تھے۔ فیوہرر نے اس روز پہلا کام یہ کیا کہ اپنے ہاتھ سے ان تینوں کتوں کو شوٹ کر دیا۔ اس کے فوجی ساتھیوں اور ماتحتوں میں سے کسی کو جرأت نہ تھی کہ فیوہرر کو اس حرکت سے باز رکھنے کی تلقین کرتا۔ اپنی موت سے پانچ روز قبل .... یعنی ۲۵ اپریل کی دوپہر کو اس نے مجھے اپنے کمرۂ خاص میں طلب کیا۔ یہ کمرہ اس اعتبار سے

بھی تاریخی تھا کہ ہٹلر اسی کمرے میں اپنی جنگی کانفرنسیں منعقد کیا کرتا تھا۔ زمین کے اندر تیس فٹ کی گہرائی میں بنے ہوئے اس خفیہ ہیڈ کوارٹر میں یہی کمرہ سب سے زیادہ پختہ اور خوبصورت تھا۔ اس کا ایک دروازہ فیوہرر کی خواب گاہ میں اور دوسرا ایوا براؤن کے کمرے میں کھلتا تھا۔ اسی کمرے سے متصل ذرا فاصلے پر جنرل گوئبلز اپنے بیوی بچوں سمیت رہتا تھا۔ اور میری رہائش کا کمرہ بھی انہی کے ساتھ تھا۔

جب میں کمرے میں داخل ہوا تو ہٹلر پتھر کے بت کی مانند اپنی وسیع میز کے قریب کھڑا دکھائی دیا۔ اس کا چہرہ ڈھلے ہوئے کپڑے کی مانند سفید اور آنکھیں ویران تھیں۔ فوجی سلاموں کے تبادلے کے بعد اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا ـــــ اُف تو بہ وہ تیر کی مانند قلب و جگر کو چھیدتی ہوئی نظریں آج بھی جب یاد آتی ہیں تو میں کانپ جاتا ہوں ـــــ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کی آنکھوں میں دوسرے کو مسحور کر دینے والی یہ پُراسرار قوت کہاں سے آئی تھی۔ دس سال تک میں ہٹلر کے ذاتی عملے میں رہا اور میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ اس نے دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ بات کی ہو یہی حال اٹلی کے ڈکٹیٹر مسولینی کا تھا۔

میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ کوئی نادر شاہی حکم صادر ہونے والا ہے آخر اس نے کڑکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"لینگی...... میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اپنی ملازمت سے رخصت کر دوں۔ تمہیں اجازت ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ اور اپنے رشتہ داروں کے پاس جا کر رہو۔"

اس کے یہ الفاظ نہیں تھے۔ بلکہ ایک بجلی سی تھی جو میرے ہوش و خرد کے خرمن کو چشم زدن میں جلا کر راکھ کر گئی ـــــ چند سیکنڈ تک ہم دونوں ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ آخر کار میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میرے آقا! میں نے اپنی زندگی کا بہترین وقت آپ کی خدمت میں صرف کیا ہے اور میں آپ سے ہرگز جدا ہونے کا خواہش مند نہیں ـــــ خواہ مجھے کتنی ہی تکلیف کا سامنا کرنا پڑے۔"

فیوہرر کے چہرے پر کسی تاثر کی ہلکی سی لہر بھی نمودار نہ ہوئی۔ البتہ اس نے اپنا دایاں ہاتھ قدرے بلند کیا اور کہا۔

"میں تمہارے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں لینگی۔" پھر ایک لمحے کے تامل کے بعد اس نے اسی تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"مگر تمہارے لئے میرا یہ خصوصی حکم ہے کہ تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ میں نے اور ایوا براؤن نے طے کر لیا ہے کہ ہم دونوں اکٹھے مریں گے اور تمہاری ڈیوٹی ـــــ اور میرا حکم یہ ہے کہ ہماری لاشیں اپنے ہاتھ سے آگ میں جلا ڈالو ـــــ تاکہ میری موت کے بعد کوئی شخص مجھے پہچان نہ سکے۔ پٹرول کی وافر مقدار تمہارے پاس موجود ہونی چاہیئے۔ تم ہماری لاشوں کو کمبلوں میں لپیٹ کر پٹرول میں تر کر لینا اور پھر انہیں جلا دینا ـــــ جب ہماری لاشیں جل جائیں تو تم میرے کمرے میں جانا اور وہاں سے ہر وہ شے جمع کر لینا، جنہیں دیکھ کر میری یاد تازہ ہوتی ہو۔ میری وردی، میری کتابیں، کاغذات، کھانے کے برتن، غرضیکہ ہر وہ چیز جو مجھ سے تعلق رکھتی ہو، اپنے قبضے میں کر لینا اور پھر انہیں بھی باہر لا کر نذرِ آتش کر دینا۔ تمہارا فرض ہوگا۔ مگر یاد رکھو ـــــ میں پھر اپنے الفاظ دہراتا ہوں ـــــ اچھی طرح یاد رکھو کہ میری میز پر فریڈرک اعظم کی جو تصویر رکھی ہے۔ وہ ضائع نہ ہونے پائے۔ کیا تم نے میرے احکامات سمجھ لئے ہیں؟"

میں نے اثبات میں گردن کو جنبش دی اور پھر اسے سلوٹ کر کے کمرے سے باہر چلا آیا۔

شہنشاہ جرمنی فریڈرک اعظم کی تصویر فیوہرر کو بے حد عزیز تھی۔ وہ ہمیشہ اسے اپنی نظروں کے سامنے میز پر رکھتا تھا اور کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ اس تصویر کو وہاں سے ہٹائے یا ہاتھ بھی لگا جائے۔ میں نے بارہا فیوہرر کو اپنی میز پر کام کرتے دیکھا ہے اور اکثر احساس ہوا ہے کہ شاہ فریڈرک کی تصویر اسے محبت بھری نگاہوں سے تک رہی ہے۔

ہٹلر کو دراصل خدشہ یہ تھا کہ روسی اسے گرفتار کر کے ماسکو لے جائیں گے اور اس کی تحقیر و تذلیل میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے، وہ اگر چاہتا تو برلن سے بآسانی فرار ہونے

میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ لیکن آمرانہ مزاج اس سانچے میں ڈھل چکا تھا کہ بھاگنے کی بجائے اس نے خودکشی میں ہی اپنی بہتری سمجھی۔ ہٹلر نے کئی مرتبہ کہا:

"اگر انہوں نے، یعنی روسیوں نے مجھے گرفتار کر لیا تو وہ مجھے ماسکو لے جائیں گے اور پھر مجھے "نمائش" کے لئے عوام کے سامنے پیش کیا جائے گا ___ کیا میں یہ ذلت گوارا کر لوں گا؟"

ایسے مواقع پر اس کی آواز میں گرج پیدا ہو جاتی اور وہ چلا کر کہتا:

"نہیں ___ ہرگز نہیں ___ ایسا کبھی نہیں ہو گا کبھی نہیں ہو سکتا ___ ہرگز نہیں۔"

ہٹلر کی موت سے دس روز پہلے ___ اس کی خفیہ زیرِ زمین رہائش گاہ میں دو معمولی سی تقریبیں بھی منعقد ہوئی تھیں ___ ان میں سے پہلی تقریب بیس اپریل کو ہوئی ___ اس روز ہٹلر نے اپنی سالگرہ منائی تھی۔ اس نے عمر کے چھپن سال طے کر لئے تھے۔ اس روز وہ غیر معمولی طور پر خوش دکھائی دیتا تھا اور اس کے کڑے لہجے میں نرمی اور بھینچے ہوئے جابر ہونٹوں پر تبسم کی ایک معمولی سی لہر بھی میں نے دیکھی۔ جنرل گوئرنگ، جنرل ربن ٹراپ، جنرل کیٹل، جنرل بورمن اور دوسرے کئی بڑے فوجی افسر اس تقریب میں شریک تھے۔ ہٹلر اپنی پسندیدہ چائے پی رہا تھا۔ اس نے خلافِ معمول کئی پیالیاں پئیں۔ حالانکہ اس زمانے میں چائے حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کسی طرح کم نہ تھا اور یہ جنسِ گراں مایہ صرف فیوہرر کے لئے مخصوص تھی۔ دوسرے مہمانوں کی تواضع کافی اور شراب سے کی گئی۔ آخر میں ایوا براؤن نے فیوہرر کی سالگرہ کا جامِ صحت پیش کیا۔ سب لوگوں نے شیمپین شراب کا ایک ایک پیالہ پیا۔ لیکن ہٹلر نے چائے ہی پر اکتفا کی۔ وہ شراب اور تمباکو نوشی کا عادی نہ تھا اور اس کے بعد یہ پُرمسرت تقریب ختم ہو گئی۔

ایوا براؤن کی صحت کے بارے میں ہٹلر کو جس قدر تشویش رہتی تھی۔ اس کا مجھے خوب اندازہ تھا۔ وہ اکثر اسے میرے ساتھ اس تہ خانے سے باہر سیر کے لئے جانے کی اجازت

دے دیا کرتا تھا۔ ان دنوں ہمارا باہر نکلنا اور زندہ واپس پہنچ جانا بھی ایک معجزہ ہی تھا۔ برلن کا کوئی بازار، کوئی عمارت اور کوئی گلی کوچہ ایسا نہ تھا جو روسی بمبار جہازوں کی زد سے محفوظ رہا ہو۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں بمشکل دو تین گھنٹے ایسے گزرتے تھے، جب بموں کے دھماکوں کی آوازیں سنائی نہ دیتی تھیں۔ ورنہ بجلی کے سائرن ہر وقت بھیانک آوازیں چیختے رہتے تھے۔

ایوا براؤن مجھ سے جلد بے تکلف ہو گئی اور خودکشی سے چند روز پہلے، جب کہ ہم دونوں برلن کے کھنڈرات میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"اگر مجھے اور فیوہرر کو موت کے منہ میں جانے سے کوئی معجزہ بھی نہ روک سکا تو بھی میری زندگی کی آخری خواہش یہ ہے کہ ہم دونوں شوہر اور بیوی کی حیثیت میں مریں۔"

فرطِ جذبات سے اس کی آواز بھرا گئی اور بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ ایک معمولی ملازم ہونے کی حیثیت سے میں اس پر تبصرہ یا تنقید کرنے کی جرأت کس طرح کر سکتا تھا۔ میں خاموش رہا۔ غالباً اس نے اپنی اس عجیب خواہش کا اظہار فیوہرر سے بھی کر دیا تھا۔ چونکہ مرنے سے پہلے یعنی ۲۹ اپریل کی صبح فیوہرر نے مجھے اپنے کمرۂ خصوصی میں طلب کیا اور کہا:

"آج میری اور ایوا براؤن کی شادی کی تقریب ہو گی اور اس کی تیاریاں تمہارے ذمے ہیں۔ گواہوں میں بورمین اور جنرل گوئبلز اور اس کی بیوی شریک ہو گی۔ میں نے والٹر ویگنر کو بلوایا ہے وہ اس رسم کو پورا کرے گا۔"

یہ چند جملے کہنے کے بعد وہ مڑا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

پروگرام کے مطابق یہ شادی دوپہر کو ہونی قرار پائی تھی لیکن تلاشِ بسیار کے باوجود والٹر کا کوئی سُراغ نہ ملا۔ آخر نصف شب کے قریب وہ آیا اور تب اس نے گواہوں کی موجودگی میں ہٹلر اور ایوا براؤن کو قانونی طور پر شادی کی زنجیر میں جکڑ دیا اور یہ دوسری تقریب ختم ہو گئی۔ چائے، کافی اور شراب کا دور چلا۔ حالانکہ باہر شدید بمباری ہو رہی تھی اور دشمنوں کے جہاز شہر پر آگ برسا رہے تھے۔

ایوا براؤن کو اس رات میں نے جس قدر خوش دیکھا، گزشتہ دس سال کی مدت میں اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ نازی فوجوں کی دشمنوں پر فتح کے سلسلے میں کئی شاندار تقریبیں منعقد ہوئیں ـــــ اور ایسی پُر مسرت تقریبوں میں ہٹلر بنفسِ نفیس شریک ہوا کرتا تھا۔ شادی کی اس تقریب میں شامل ہونے والے چند ہی لوگ تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ ان میں سے ہر شخص ان کی خوشی میں شریک ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت کون جانتا تھا کہ اگلے روز دلہا اور دلہن دونوں اس دنیا میں موجود نہ ہوں گے۔

میں نے نہایت احتیاط سے ان دونوں کی لاشوں کو کمبلوں میں لپیٹا اور پھر دو کمانڈروں کی مدد سے ہٹلر کی لاش اٹھا کر باہر لے آیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایوا براؤن کی لاش میجر گنیشی نے اٹھائی تھی۔ اس کا لباس ہلکے رنگ کا تھا۔ پاؤں میں اطالوی جوتے اور نائیلون کی جرابیں تھیں اور کلائی پر پلاٹینم کی بیش قیمت گھڑی بندھی تھی۔ جس کے چاروں طرف ہیرے جڑے تھے اور جو کئی سال پہلے ہٹلر نے اسے تحفے کے طور پر دی تھی۔

اس کے بعد پٹرول لایا گیا ـــــ میں نے دونوں لاشوں پر پٹرول کے کئی ٹین الٹ دیے۔ یہ سارا کام زیرِ زمین پناہ گاہ سے باہر کھلی جگہ میں انجام دیا جا رہا تھا۔ آسمان پر دشمنوں کے طیارے مشین گنوں سے گولیوں کا مینہ برساتے ہوئے پرواز کر رہے تھے۔ ایک ایک لمحہ سخت جان لیوا ثابت ہو رہا تھا۔ بالآخر ان لاشوں کو آگ لگا دی گئی ـــــ خدا جانے اس پٹرول میں کیا خرابی تھی کہ کمبلوں میں آگ نہیں لگی۔ تھوڑی دیر کے لئے آگ بھڑکتی اور پھر بجھ جاتی۔ کاش ہمارے پاس پیرافین ہوتا تو یہ لاشیں آناً فاناً جل کر راکھ ہو جاتیں ـــــ ہم چار پانچ افراد کھڑے سوچ رہے تھے کہ اب کیا کیا جائے ـــــ اگرچہ ہٹلر اور ایوا براؤن کے کپڑے جل چکے تھے مگر اب بھی وہ دونوں آسانی سے شناخت کیے جا سکتے تھے جنرل بورمین اور گوئیبلز کو لاشوں کے پاس چھوڑ کر میں فیوہرر کی دوسری وصیت پوری کرنے کے ارادے سے کمرے میں واپس گیا اور جب کافی دیر بعد میں اپنا کام ختم کر کے باہر نکلا تو مجھے بتایا گیا کہ فیوہرر اور ایوا براؤن کی لاشیں انہوں نے کہیں قریب ہی دفن کر دی ہیں۔

بارہ سال تک روسی قید خانوں کی پُرصعوبت اور اذیت ناک زندگی بسر کرنے کے بعد ۱۹۵۵ء میں جب مجھے رہائی ملی تو فیوہرر اور اس کی محبوبہ کے بارے میں طرح طرح کی داستانیں سننے میں آئیں۔ اکثر لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ مرا نہیں، بلکہ روپوش ہو گیا ہے اور کسی آڑے وقت میں ظاہر ہو گا۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں ——— اخبارات نے ایوا براؤن کے بارے میں ایسی ایسی داستانیں وضع کر کے شائع کیں کہ ان کو پڑھ کر پسینہ آجاتا ہے اور جن میں حقیقت کا ذرہ برابر بھی سفر نہیں تھا۔ چونکہ میں نے ہٹلر اور اس کی محبوبہ کو قریب سے دیکھا ہے۔ اس لئے میرا فرض ہے کہ اپنی معلومات کو منظرِ عام پر لاؤں اور جو واقعات میری نگاہوں سے گزرے ہیں۔ انہیں بلا کم و کاست پیش کر دوں۔

ہٹلر اور ایوا براؤن کے تعلقات ۱۹۳۵ء سے بھی پہلے استوار ہو چکے تھے کیونکہ اسی زمانے میں ہٹلر کے ذاتی خدمت گاروں میں میں شامل ہوا تھا اور اس وقت سے لے کر ۳۰ اپریل ۱۹۴۵ء کی سہ پہر تک ان دونوں میں بڑی ہی محبت اور یگانگت رہی۔ یہاں تک کہ وہ اکٹھے ہی موت کے منہ میں داخل ہوئے۔ ایوا براؤن کو خدا نے حُسنِ صورت اور حُسنِ سیرت دونوں ہی خوبیوں سے نوازا تھا۔ بعض اخبارات نے اس کے بے مثال حُسن کے افسانے تراشے ہیں، حالانکہ وہ اتنی حسین نہ تھی۔ البتہ اس نے حیرت انگیز دماغ پایا تھا۔ نہایت خفیہ اور اہم جنگی کانفرنسوں میں فیوہرر، ہمیشہ اس سے مشورہ کر کے قدم اٹھایا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ہٹلر ایوا براؤن کے حسن سے اتنا متاثر نہ تھا جتنا متاثر وہ اس کی ذہانت اور فطانت سے تھا۔

ایوا براؤن میونخ کے ایک سکول ٹیچر کی بیوی تھی۔ جب اس کی عمر انیس سال تھی تو ہینرخ ہاف مین فوٹوگرافر کی سیکرٹری کی حیثیت سے اسے سیلزبرگ میں فیوہرر ہٹلر سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ہینرخ ہاف مین ہٹلر سے قریبی روابط رکھتا تھا۔ خدا جانے ہٹلر کو اس انیس سالہ حسینہ کی کون سی ادا پسند آگئی کہ وہ اسے اپنے ساتھ بیرگ ہاف لے گیا۔ جہاں اس زمانے میں اس کی رہائش گاہ تھی۔ بلاشبہ اس سے قبل بھی ہٹلر کی زندگی میں کئی عورتیں آئیں اور گئیں لیکن آہنی دل رکھنے والا فیوہرر، ایوا براؤن کی زلفِ گرہ گیر میں اس طرح جکڑا گیا کہ دوبارہ آزاد نہ ہو سکا۔ ہٹلر جس وقت ایوا براؤن کے کمرے میں جاتا تو ہمیشہ دروازہ اندر سے بند کر لیا کرتا تھا تاکہ

ان کے رازونیاز میں کوئی اور مخل نہ ہو۔ دس سال کی طویل مدّت میں صرف ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ وہ دروازہ بند کرنا بھول گیا اور رجب میں کسی کام سے کمرے میں داخل ہوا تو ہٹلر کا چہرہ غصے سے سیاہ پڑ گیا۔ ایوا براؤن اگر میری سفارش نہ کرتی تو میں اسی روز ہٹلر کے قہر کا نشانہ بن چکا ہوتا۔ مجھ سے بارہا پوچھا گیا ہے کہ کیا ہٹلر اپنی زندگی کے آخری برسوں میں ذہنی توازن کھو چکا تھا؟ میں نے بہت سی کتابوں اور رسالوں میں مختلف لوگوں کی تحریریں دیکھی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ وہ اپنے غصے پر قابو پانے میں ناکام رہتا تھا۔ غصے کی حالت میں وہ کمرے کا فرنیچر توڑتا، کھڑکیوں کے پردے پھاڑ ڈالتا اور کئی اور مجنونانہ حرکتیں کیا کرتا۔ جہاں تک میرے دس سالہ مشاہدے کا تعلق ہے، خدا گواہ ہے کہ میں نے اسے کبھی ایسے عالم میں نہیں دیکھا۔ حالانکہ مجھے دن رات اس کے پاس رہنے کا موقع ملتا تھا۔ البتہ ایسا ضرور ہوتا تھا کہ غصے کی حالت میں اس کی مٹھیاں بھنچ جاتیں اور آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا ہو جاتی تھی۔

وہ ایک فقید المثال مقرر تھا۔ لیکن مکمل تیاری کئے بغیر وہ کبھی تقریر نہیں کرتا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب کبھی ایسا موقع آتا کہ اسے کسی جلسۂ عام میں یا فوج کے سامنے تقریر کرنی ہوتی تو وہ کئی کئی روز تک شب و روز تقریر کی تیاری میں ہمہ تن مصروف رہتا۔ سیکرٹریوں کی ایک جماعت تقریر کا ڈرافٹ تیار کرتی اور فیوہرر جب تک اس کی نوک پلک اور متن سے مطمئن نہ ہو جاتا، اس وقت تک تقریر پر برابر نظرِثانی ہوتی رہتی تھی۔ تقریر جب مکمل ہو جاتی تو وہ تنہائی میں قدِآدم شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر تقریر کرنے کی مشق کرتا۔ اپنے ہاتھوں کی حرکت، کھڑے ہونے کے انداز، اور کسی خاص جملے پر زور دینے کے لئے جس لہجے کی ضرورت ہوتی، برابر اس کی مشق کرتا تھا۔

عام حروف پر مشتمل چھپی ہوئی یا ٹائپ شدہ تحریروں کو پڑھنے کے لئے وہ عینک استعمال کرتا تھا۔ لیکن مجمع عام میں تقریر کرتے وقت اس نے کبھی عینک استعمال نہیں کی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ:

"فیوہرر کو عینک استعمال کرنا زیب نہیں دیتا۔"

دراصل اس کی "انانیت" اور "آمریت" انتہا سے زیادہ بڑھ گئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس کے قریبی فوجی افسر اس سے اُکتا گئے تھے۔ وہ نت نئے احکام جاری کرتا جنہیں پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مثلاً خاص فیوہرر کی ضرورت کے لئے ایک نیا ٹائپ رائٹر ایجاد کیا گیا۔ جس پر عام ٹائپ رائٹر کے برعکس زیادہ جلی حروف ٹائپ ہوتے تھے اور فیوہرر کے سامنے پیش کی جانے والی تمام تحریریں، اور دوسرے ضروری مسودات اسی ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کئے جاتے تھے تاکہ وہ انہیں آسانی سے بغیر عینک کے پڑھ سکے۔ اس کی تقریریں بھی اسی طرح ٹائپ ہوتی تھیں، لیکن اسے عینک استعمال کرنے کی عادت پرانی تھی، وہ کبھی نہ چھوٹ سکی۔ میں نے اکثر دیکھا کہ بات کرتے کرتے بے اختیار اس کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف جاتا اور وہ عینک نکال لیتا ـــــ لیکن پھر خیال آتے ہی وہ اپنے ہاتھ کو پیٹھ کے پیچھے لے جاتا اور بدستور عینک پکڑے رہتا تھا۔ تقریر کے دوران میں جب وہ جذبات کے کسی نقطۂ عروج پر پہنچتا تو یک لخت اس کی مٹھیاں بھنچ جاتیں اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی نازک سی عینک چکنا چور ہو جاتی ـــــ ایسے موقع کے لئے میں ہمیشہ نئی عینکوں کا سٹاک اپنے پاس رکھتا تھا۔ کیا معلوم، کب ضرورت پڑ جائے۔ مجھے ایسے تیس مواقع یاد آتے ہیں۔ جب فیوہرر نے اپنی عینک مٹھی میں بھنچ کر توڑی اور میں نے اسے بعد میں نئی عینک دی۔

عینک کے بعد اس کی دوسری عجیب و غریب عادات رنگین پنسلوں کے استعمال کی تھی۔ اس کی لکھنے کی میز پر ہمیشہ سُرخ، سبز اور نیلے رنگ کی پنسلیں موجود رہتی تھیں۔ ایک مرتبہ جب کہ وہ خوشگوار موڈ میں تھا، مجھ سے کہنے لگا:

"لینگی جب میں کسی دشمن کے بارے میں لکھتا ہوں تو سُرخ پنسل استعمال کرتا ہوں۔ سبز پنسل اس وقت کام آتی ہے جب کسی دوست کے بارے میں لکھتا ہوں اور نیلی پنسل اس وقت کام میں لاتا ہوں۔ جب میں کسی کی طرف سے کوئی خدشہ محسوس کرتا ہوں۔"

وہ جب غصے میں ہوتا یا کسی بات پر جھنجلاہٹ طاری ہوتی تو وہ پنسل جو اس کے ہاتھ میں ہوتی، وہی کھینچ کر مارتا۔ اس لئے پنسلوں کا بھی کافی سٹاک مجھے ہر وقت حاضر رکھنا

پڑتا تھا۔ فیوہرر کی زندگی کے آخری ایک دو برس اس پر بہت بھاری گزرے۔ اس زمانے میں جنگ کا پانسہ حیرت انگیز طور پر پلٹ گیا تھا اور نازی افواج کو ہر جگہ پے بہ پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ فیوہرر کے قاہرانہ اور آمرانہ مزاج پر ان شکستوں کا اثر بے حد ناگوار ہوتا تھا۔ اس کی صحت روز بروز گرتی چلی گئی اور وہ اپنی عمر سے کئی سال زیادہ بوڑھا دکھائی دینے لگا۔ آواز اور لہجے کا وہ بانکپن، جس سے بڑے بڑے نازی جنرل خوف کھایا کرتے تھے، اب کمزور پڑ گیا تھا۔ اس کی بائیں ٹانگ بے حس ہو چکی تھی اور بائیں آنکھ مسلسل پھڑکتی رہتی تھی اور اس کی بصارت تقریباً ضائع ہو گئی تھی۔ سر کے بال بالکل بھورے ہو چکے تھے۔ فیوہرر کی صحت کے بارے میں از حد احتیاط کی جاتی تھی کہ عوام تک کوئی خبر نہ پہنچے۔

فیوہرر کی دیکھ بھال کے لئے ماہر ڈاکٹروں کی ایک جماعت شب و روز حاضر رہتی تھی۔ لیکن اتنی بدگمان اور پر از وہم طبیعت اس شخص نے پائی تھی کہ سوائے ڈاکٹر تھیوموریل کے کسی دوسرے ڈاکٹر کی رائے پر اعتماد نہ تھا ـــــــ ڈاکٹر تھیوموریل اس کا پرانا دوست اور ساتھی تھا اور ۱۹۳۶ء سے ہٹلر کے ذاتی معالجوں میں شریک ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بے حد ذہین اور طباع تھا اور مریض کی ذہنی کیفیت کو بھانپ لینے کا عجیب و غریب ملکہ رکھتا تھا، لیکن فیوہرر کی عادتوں سے وہ بھی اکتا گیا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے کئی نرالی دوائیں محض فیوہرر کے لئے ایجاد کیں اور انہیں مریض پر استعمال کرتا رہا۔ میں نے کئی بار فیوہرر کے منہ سے ڈاکٹر موریل کے بارے میں تعریفی کلمات سنے ہیں۔

اعصابی سوزش کے علاوہ فیوہرر بے خوابی، قلب اور معدہ کے امراض کا شکار بھی تھا۔ کبھی کبھار اس کے پیٹ میں شدید اینٹھن ہونے لگتی۔ اس وقت اس کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی ـــــــ یہ اس کی خداداد قوتِ ارادی کا کرشمہ تھا کہ وہ اس تکلیف کو برداشت کر جاتا اور کبھی ہلکی سی آہ یا چیخ اس کے منہ سے نہ سنی گئی۔ بے خوابی دور کرنے کے لئے وہ ڈاکٹر تھیوموریل کی تیار کردہ گولیاں استعمال کرتا۔ یہ گولیاں اس قسم کی تھیں جو یکے بعد دیگرے کھائی جاتی تھیں اور خوبی ان میں یہ تھی کہ جتنی بھی زیادہ تعداد میں کھائی جائیں کوئی نقصان نہیں دیتی تھیں ـــــــ عوامی جلسوں میں تقریر سے پہلے یا

فوجی کانفرنسوں میں شریک ہونے سے پیشتر فیوہرر انجکشن بھی لگوایا کرتا تھا تاکہ اعصابی سوزش سے محفوظ رہے۔

اسے اندیشہ تھا کہ اگر ایسے مواقع پر پیٹ کا درد یا کوئی اور تکلیف شروع ہو گئی تو عوام کیا خیال کریں گے۔ پس وہ انتہائی اصرار سے وہ انجکشن لگوایا کرتا تھا۔ ابتدا میں یہ انجکشن خاص خاص مواقع ہی پر لگتے تھے لیکن بعد میں فیوہرر ان کا اس قدر عادی ہؤا کہ ہر دوسرے دن انجکشن لگتے تھے ـــــ کبھی اسے وہم ہوتا کہ اس کے بدن میں چربی بڑھ رہی ہے اور کبھی یہ گمان ہوتا کہ خون کا دباؤ بڑھ رہا ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ سارا فساد اس خوراک کا ہے جو وہ کھاتا ہے۔ چنانچہ پرانے باورچی کو یک لخت موقوف کر کے ایک نیا آدمی رکھا گیا جو "ماہرِ خوراک" ہونے کے ساتھ ساتھ کھانا بھی خود پکاتا تھا۔ فیوہرر اس پر بھی مطمئن نہ ہوا اور کہنے لگا کہ یہ سارا قصور اس زمین کا ہے جس میں خاص اس کے لئے ترکاریاں بوئی جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک دوسرا قطعۂ زمین اس مقصد کے لئے منتخب ہؤا جس میں فیوہرر کے استعمال کی ترکاریاں اور تمام قسم کی سبزیاں بوئی جانے لگیں۔ وقتاً فوقتاً زرعی ڈاکٹروں کی ایک جماعت کو اس زمین کا معائنہ کرنا پڑتا تھا اور وہ پانی بھی، جو اس زمین کو دیا جاتا۔ اسے کئی لیبارٹریوں کے سخت امتحان سے گزرنا پڑتا تھا۔ جنگ کی حالت جوں جوں ابتر ہوتی گئی۔ فیوہرر کی ذہنی اور جسمانی حالت میں زبردست تغیرات رونما ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ سٹالن گراڈ کی شکست کے بعد اس کے بائیں ہاتھ میں تشنج کی سی کیفیت پیدا ہو گئی اور ہاتھ کی اس کپکپاہٹ پر قابو پانا فیوہرر کی زبردست قوتِ ارادی کے لئے ناممکن ہو گیا۔ اگر آپ فیوہرر کی اس زمانے کی تصویریں دیکھیں تو آپ کو صاف دکھائی دے گا کہ یا تو اس نے بائیں ہاتھ کو اپنے جسم کے ساتھ لگا رکھا ہو گا یا دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کے پنجے کو تھام رکھا ہو گا تاکہ یہ کانپنے نہ پائے۔

بائیں ہاتھ کے بے قابو ہونے کے فوراً بعد ہی فیوہرر نے ایک روز ڈاکٹر موریل سے شکایت کی، کہ اب اس کے سر میں بھی شدید درد ہونے لگا ہے اور غالباً خون کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر نے فیصلہ کیا کہ فاسد خون کو نکالنے کے لئے فیوہرر کے بازو میں جونکیں لگائی جائیں۔ یہ علاج فائدہ مند رہا۔ اور کئی روز تک مسلسل بائیں بازو میں جونکیں لگا کر فاسد خون نکالا گیا۔ لوگ جب اسے ملنے کے لئے آتے تو دیکھ کر حیران رہ جاتے کیونکہ وہ پہلے سے

کہیں زیادہ کمزور اور نحیف نظر آتا تھا۔

اب میں ان واقعات و حادثات کا ذکر کرتا ہوں جو ہٹلر کی زندگی کے آخری دن سے پہلے ظہور پذیر ہوئے ـــــ فیوہرر نے اپنی موت سے دس روز پیشتر بیس اپریل ۱۹۴۵ء کو اپنی چھپنویں (۵۶) سالگرہ منائی تھی ـــــ اس روز جنرل گوئبلز نے ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے ایک بار پھر جرمن فوجوں اور جرمن عوام کو فیوہرر پر مکمل اعتماد رکھنے کی ہدایت کی اور کہا:

"اگرچہ تمام محاذوں پر ہماری فوجوں کو اتحادیوں کے مقابلے میں پسپا ہونا پڑ رہا ہے، لیکن اس کے باوجود ہماری فوج اور فیوہرر کے حوصلے بلند ہیں اور امید ہے کہ چند روز تک ہم اس نازک صورت پر پوری طرح قابو پا کر دشمن کو پرے دھکیل دیں گے۔"

جنرل گوئبلز بظاہر فوج کے حوصلے بڑھانے اور جرمن عوام کو فریب دینے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا، لیکن اندرونی طور پر وہ اور اس کے دوسرے ساتھی بخوبی جانتے تھے کہ اب دشمن کے پنجے سے نکلنا ان کے بس میں نہیں رہا۔ اتحادی فوجوں نے برلن کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور کڑی ناکہ بندی کر دی تھی۔ روسی مارشل زوقوف، اوڈور کے مقام پر جرمنوں کو پیچھے دھکیل دینے میں کامیاب ہو گیا تھا اور ہٹلر کی سالگرہ کے دن وہ برلن کی نواحی بستیوں تک پہنچ چکا تھا۔ ادھر امریکی پیدل فوج کے دستے دریائے ایلبے کے کنارے ٹورگوا کے مقام پر روس کی فوج کے شانہ بشانہ کھڑے تھے۔ یہ مقام برلن سے پچھتر میل دور ہے۔ صورت حال بڑی نازک تھی۔ جرمنی دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ اور خشکی کے تمام راستے جرمنوں کے لئے ناقابلِ عبور تھے۔

ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ایسی خطرناک صورت کے ـــــ باوجود ہٹلر نے اپنی سالگرہ منانے کے لئے برسیلز برگ جانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ دس روز پیشتر ہی یعنی دس اپریل ۴۵ء کو اس نے اپنے ذاتی خادموں کی ایک جماعت کو برسیلز برگ جانے کا حکم دے دیا تھا تاکہ وہ اس مکان کو سجائیں جس میں سالگرہ کی تقریب منائی جائے گی۔ اسے اس ارادے سے روکنے کی جرأت کس میں تھی؟ اور ہم سب نے سوچ لیا تھا کہ اب اس کی موت کے دن قریب آ گئے ہیں۔ مگر ان دس دنوں میں حالات نے اتنی تیزی سے پلٹا کھایا کہ ہٹلر نے برسیلز برگ

جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنی محبوبہ ایوا براؤن کو جو وہاں جدائی کی گھڑیاں گن رہی تھی، پیغام بھیجا کہ وہ برلن آجائے۔

برلن میں ہٹلر کا فوجی ہیڈکوارٹر ریخ چانسلری میں تھا کیا شاندار اور عظیم عمارت تھی۔ بڑے بڑے بے شمار ہال کمرے، جن کے دروازے اور کھڑکیاں لوہے کی تھیں اور فرش سنگ مرمر کا، مگر برلن پر دشمنوں کی شدید بمباری کے باعث جب یہ عمارت تباہ ہو کر کھنڈرات میں تبدیل ہو گئی تو فیوہرر نے پرانی چانسلری کے قریب سطح زمین سے پچاس فٹ نیچے ایک نئی پناہ گاہ تعمیر کرنے کا حکم دیا اور بموں کے دھماکوں اور آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے درمیان میں یہ مختصر زیر زمین پناہ گاہ بنائی گئی جسے "فیوہرر بنکر" کا نام دیا گیا اور یہی وہ مقام تھا، جہاں نازی آمریت نے اپنا آخری ڈرامائی کردار ادا کیا تھا۔

چونکہ اس پناہ گاہ کا ذکر میرے مضمون میں جا بجا آئے گا۔ اس لئے بہتر ہے کہ میں پہلے اس کا مکمل نقشہ آپ کو سمجھا دوں۔ اٹھارہ مختصر کمروں پر مشتمل یہ زیر زمین پناہ گاہ نہایت ہی تکلیف دہ تھی۔ پناہ گاہ کا درمیانی راستہ اسے دو حصوں میں تقسیم کرتا تھا اور دونوں حصوں کے درمیانی راستے کو عام گفتگو کے کمرے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بیت الخلاء، گارڈ روم ایمرجنسی ٹیلیفون ایکسچینج اور پاور ہاؤس تھا۔ مرکزی درمیانی راستے کو کانفرنس روم بنایا گیا تھا۔ اور یہاں روزانہ ہٹلر کی صدارت میں سٹاف کانفرنس ہوا کرتی تھی۔ اس کے بائیں جانب ایک دروازہ تھا جو چھ کمروں پر مشتمل ایک علیحدہ حصے کی نشاندہی کرتا تھا اور اسی حصے میں ایوا براؤن کے قبضے میں ایک خواب گاہ، ایک غسل خانہ اور ایک ڈریسنگ روم تھا اور ہٹلر کے پاس دو کمرے تھے۔ ایک کو اس نے خواب گاہ اور دوسرے کو اپنا خاص دفتر بنا رکھا تھا اور یہی وہ تاریخی کمرہ تھا جہاں وہ علیحدگی میں جنگی مسائل پر غور و خوض کیا کرتا تھا اور یہیں سے اس کے نادر شاہی

احکامات فوج کے اعلیٰ افسران تک پہنچتے تھے اس حصے کا چھوٹا کمرہ ایک ڈیوڑھی تھی۔ جس میں سے ہنگامی حالات میں فرار ہونے کا ایک خفیہ دروازہ موجود تھا۔ اسی حصے کے بائیں جانب دو اور دروازے بھی تھے جن میں سے ایک میپ روم کا دروازہ تھا اور دوسرا ایک تنگ سی کوٹھڑی، جسے فالتو سامان کا سٹور بنا دیا گیا تھا۔ لیکن بعد ازاں اس میں سے سامان نکال کر اسے ہٹلر

کی حفاظت کرنے والے فوجی افسروں کے آرام کے لئے وقف کر دیا گیا تھا۔ اس خصوصی زیر زمین پناہ گاہ کے آس پاس اور دوسری کئی پناہ گاہیں بھی تھیں جن میں آرمی جنرل سٹاف کے اعلیٰ افسر مثلاً جنرل بورمین، جنرل کربس، جنرل گاڈیرین اور جنرل ہائزر رہتے تھے۔

ہٹلر کی سالگرہ کی تقریب کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ لیکن اب اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس روز ان سب بڑے بڑے فوجی افسروں نے، جن میں جنرل گوئرنگ، فیلڈ مارشل کیٹل، جنرل ہملر، جنرل بورمین، جنرل گوئبلز، جنرل کربس، جنرل برگروف جیسے ہائی کمان کے افراد شامل تھے، فیوہرر سے ایک زبان ہو کر التجا کی کہ وہ برلن سے نکل جائے۔ مگر ہٹلر نے کسی کی نہ سنی اور غصے سے یہی کہا کہ میں اسی شہر میں اپنی زندگی کے آخری دن پورے کر دوں گا۔ اس کے بعد اس نے گفتگو کا موضوع جنگ کے حالات کی طرف موڑ دیا اور فیلڈ مارشل کیسلرنگ اور ایڈمرل ڈونز سے جو ان دنوں تمام جرمن فوجوں کی کمان کر رہے تھے۔ کافی دیر تک اتحادیوں کو پیچھے ہٹانے کے نت نئے منصوبوں پر بحث ہوتی رہی۔ اس دوران میں مَیں نے محسوس کیا کہ ہٹلر کا ذہنی توازن برقرار نہیں ہے کبھی وہ ایک فیصلے تک پہنچتا اور پھر چند لمحے بعد ہی اس فیصلے کو رد کر کے کسی اور فیصلے پر قائم ہو جاتا تھا۔ بحث میں حصہ لینے والے تمام آفیسرز اگرچہ اپنے لیڈر کی ذہنی ابتری بھانپ چکے تھے۔ لیکن اس کی آمرانہ شخصیت کا اس درجہ رعب سب پر طاری تھا کہ دو گھنٹے کی طویل کانفرنس کے دوران میں کسی نے اونچی آواز سے بولنا تو درکنار، کھانسنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ فیوہرر نے البتہ اعلان کیا کہ جو شخص اس پناہ گاہ سے یا برلن سے باہر جانا چاہتا ہے، اس کو کھلی اجازت ہے۔ یہ اعلان کافی حوصلہ افزا تھا۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ بہت سے اعلیٰ فوجی افسران نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ موقع پاتے ہی برلن سے نکل جائیں گے۔ ان میں جنرل بریان بوٹرنگ، چیف آف سٹاف جنرل کولر اور چیف آف آپریشنز جنرل کریچین شامل تھے اور ہاں ان میں جنرل ہملر بھی تھا جس کے متعلق بعد میں پتہ چلا کہ وہ جنرل آئزن ہاور کے سامنے ہٹلر کی اجازت کے بغیر ہتھیار ڈال دینے کی تجاویز پیش کر رہا تھا۔

۲۱ اپریل کو ہٹلر نے ایک خاص حکم کے تحت ایس ایس جنرل سٹینر کو بلایا اور برلن میں مقیم تمام جرمن فوجوں کی کمان اس کے ہاتھ میں دے دی اور سختی سے کہا:

"تمہارے پاس جتنے سپاہی اور جتنا اسلحہ ہے وہ سب اس جنگ میں جھونک دو، اور دشمن کو ہر قیمت پر پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرو۔"

ہٹلر نے یہ آمرانہ حکم جاری تو کر دیا لیکن اب اس حکم کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ کیونکہ اس کے ساتھی اسے دیوانہ سمجھنے لگے تھے۔ چنانچہ جنرل سٹینز نے اس کی ہدایت پر عمل نہ کرتے ہوئے کوئی حملہ نہ کیا۔ البتہ ہٹلر سے اس نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ ضرور اس کا حکم بجا لائے گا۔ ہٹلر حملے کی کامیابی کی دل خوش کن اطلاع سننے کے لئے سارا دن ٹیلیفون کے قریب بیٹھا رہا۔ اس دوران میں کئی بار ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ لیکن متضاد خبریں فیوہرر کو سنائی گئیں۔ جنرل ہملر نے اسے بتایا کہ جرمن فوجوں نے شہر کے جنوبی حصے پر قابض دشمن کی فوجوں پر حملہ کر دیا ہے اور جنرل لنٹ وہیٹ کہتا تھا کہ حملہ نہیں کیا گیا ——— آخر تین بجے کے قریب یہ اطلاع آئی کہ جنرل سٹینز نے حملہ تو کیا لیکن جنرل وہیٹ نے اس کی کوئی مدد نہ کی اس لئے یہ حملہ ناکام ہو گیا ہے۔

فیوہرر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے فوراً "ہنگامی کانفرنس" طلب کی اور اس تاریخی کانفرنس میں ہٹلر نے اپنے ساتھیوں کو غدار، بزدل اور سازشی کہا اور شاید پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ اب برلن سے اس کا زندہ نکلنا ناممکن ہے۔ اس نے چیخ چیخ کر اور نام لے لے کر تمام جنرلوں کو گالیاں دیں اور کہا:

"میں جانتا ہوں کہ تم سب لوگ ہمت ہار بیٹھے ہو، تم دشمن کے دوست اور جرمنی کے غدار ہو، تم نے ہر موقعے پر مجھ سے جھوٹ بولا ——— دغا بازیاں کیں ——— میرے احکامات کی بجا آوری میں بے جا تاخیر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ دشمن ہمارے سر پر آ گیا ——— اب تم بھاگنے کی فکر میں ہو اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو ——— جاؤ ——— تم سب چلے جاؤ میں یہیں اپنی موت کا انتظار کروں گا۔"

افسروں نے دبی زبان سے اپنی سابقہ قربانیوں کا ذکر کیا تو فیوہرر کے غصے کی آگ اور بھڑک اٹھی۔ اس نے اجلاس فوراً برخاست کر دیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بعد ازاں میں نے جنرل گوئرنگ کو جنرل کریچین سے کہتے سُنا:

"یہ شخص (ہٹلر) پاگل ہوگیا ہے۔ میں اب ہرگز برداشت نہیں کرسکتا کہ ایک پاگل ہر وقت ہماری عزت اور وقار کو خاک میں ملاتا رہے۔"

جب یہ سب لوگ پناہ گاہ سے نکل کر اپنے اپنے خفیہ اڈوں پر چلے گئے تو ہٹلر اپنے کمرے سے باہر نکلا اور جنرل گوئبلز اور اس کے بیوی بچوں کو طلب کیا اور وہ سب ایک میز کے گرد بیٹھ کر سوچنے لگے کہ مستقبل کا پروگرام کیا ہو ــــــ گوئبلز نے عہد کیا کہ وہ زندگی کے آخری لمحے تک فیوہرر کے ساتھ رہے گا اور دشمن کے قبضے میں جانے سے پہلے ہی وہ سب خودکشی کرلیں گے۔ اس کے بعد ہٹلر نے اپنے کاغذات چھانٹے اور جن کے متعلق وہ سمجھتا تھا کہ ان کا دشمن کے پاس جانا مناسب نہیں، ان سب کاغذوں اور دستاویزوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ اس کارروائی کے بعد ایک مرتبہ پھر ہٹلر نے فیلڈ مارشل کیٹل اور جنرل بورمین کو بلایا اور آہستہ مگر فیصلہ کن لہجے میں ان سے کہا۔

"میں ہرگز ہرگز برلن سے باہر نہیں جاؤں گا۔"

ان دونوں نے پھر خوشامد سے اسے راضی کرنا چاہا اور یہاں تک یقین دلانے کی کوشش کی کہ اگر وہ برلن سے نکل جائے تو جرمن فوجیں مرتے دم تک دشمن کا مقابلہ کریں گی۔ لیکن ہٹلر ٹس سے مس نہ ہوا۔ بلکہ پریس ڈویژن کے افسرِ اعلیٰ کو طلب کر کے پوچھا۔

"کیا میرا فیصلہ برلن کے عوام تک پہنچا دیا گیا ہے کہ میں زندگی کے آخری لمحے تک برلن ہی میں رہوں گا ــــــ کیا ہر شخص اس فیصلے سے آگاہ ہوگیا ہے؟"

اور جب اس نے اثبات میں جواب دیا تو فیوہرر نے فیلڈ مارشل کیٹل کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے اسے مخاطب کیا:

"تمہارے لئے میرا یہ حکم ہے کہ کل تم برچیگیڈن چلے جاؤ۔"

فیلڈ مارشل کیٹل ایک لمحے کے لئے پتھر کے مجسمے کی مانند بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ آخر اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا:

"میں اس حکم کی تعمیل کروں گا۔ بشرطیکہ مجھے فیوہرر کے ساتھ جانے کا اعزاز ملے۔"

مگر فیوہرر نے کوئی توجہ نہ کی اور جنرل جوڈل سے کہا کہ وہ فوراً شہر کے جنوبی حصے کی

طرف روانہ ہو جائے اور جرمن فوجوں کی کمان سنبھال لے۔ پھر وہ جنرل بورمین سے مخاطب ہوا اور غضب ناک لہجے میں چلایا۔

"تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو۔ جاؤ یہاں تمہارا کوئی کام نہیں۔"

جنرل بورمین کے چہرے کا رنگ اس توہین آمیز سلوک پر غصے سے سیاہ پڑ گیا۔ مگر اتنی جرأت نہ تھی کہ کچھ کہہ سکتا۔ سلوٹ کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

ہم سب خادم فیوہرر کی مجنونانہ حرکات دیکھ دیکھ کر کانپ رہے تھے۔ وہ مختصر سے کمرے میں خونخوار چیتے کی طرح اِدھر سے اُدھر اپنی مفلوج ٹانگ گھسیٹتے ہوئے ٹہل رہا تھا اور اس کے منہ سے بار بار بے ربط جملے نکل رہے تھے۔ دائیں ہاتھ کی مٹھی کس کر وہ چلایا:

"میں مصمم ارادہ کر چکا ہوں، اور اسے ہرگز تبدیل نہیں کروں گا ____ قطعی نہیں
میں برلن کا ہوں ____ برلن میرا ہے ____ دشمن سمجھتا ہے کہ وہ مجھ پر
قابو پائے گا ____ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ____ کبھی نہیں ____"

فیلڈ مارشل کیٹل اب بھی فیوہرر کے نئے احکامات کا منتظر تھا۔ آخر ہٹلر نے اس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر ایک ملازم کو حکم دیا کہ کھانا لائے۔ کھانا فوراً لایا گیا۔ ہٹلر خود کھانے کی میز پر بیٹھا اور کیٹل سے نرم لہجے میں کہنے لگا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم جانے سے پہلے کھانا کھا لو ____ جلدی کرو۔"

کیٹل کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ چپ چاپ کھانے کی میز پر فیوہرر کے سامنے بیٹھ گیا اور بدحواسی کے عالم میں جلد جلد لقمے حلق سے اتارنے لگا۔ ہٹلر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اب وہ پرسکون تھا اور چہرے پر چند لمحے بیشتر جو غیظ اور غضب کے شدید آثار موجود تھے وہ غائب ہو چکے تھے۔

کھانا کھا کر کیٹل نے ایک بار پھر فیوہرر کی طرف دیکھا مگر اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے چلے جانے کا اشارہ کیا اور وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ فیلڈ مارشل کیٹل اور فیوہرر کی یہ آخری ملاقات تھی۔

اگلے روز جنرل ہملر نے فیوہرر کو ٹیلیفون کیا اور ایک بار پھر اصرار کیا کہ وہ برلن چھوڑ کر برچیز گیڈن

آجائے۔ مگر ہٹلر نے جواب دیا کہ وہ برلن ہی میں مرنا پسند کرتا ہے۔ مایوس ہو کر ہملر نے پوچھا کہ اُن برطانوی اور امریکی قیدیوں کا کیا کیا جائے جو پہلے مغربی جرمنی کے کیمپ میں نظر بند تھے۔ ہٹلر نے صرف اتنا کہا کہ برگر کی نگرانی میں بھیج دیا جائے۔

بیوریا سے جنرل ہملر کے خصوصی طیارے میں پرواز کر کے جنرل برگر جب برلن میں ہٹلر سے ملنے آیا۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ اس نے فوراً برگر کو اپنی مطالعہ گاہ میں بلایا اور تھوڑی دیر بعد ہمارے کانوں میں ہٹلر کے چیخنے کی آواز آئی۔

"سب کو گولی ماردو ــــــ سب کو ــــــ کوئی زندہ نہ بچے۔"

ہم سمجھ گئے "کہ یہ اتحادی طاقتوں کے قیدیوں کے بارے میں حکم جاری ہوا ہے۔ دو منٹ بعد ہی جنرل برگر تپتے ہوئے چہرے کے ساتھ باہر نکلا اور کوئی لفظ کہے بغیر تہ خانے سے باہر نکل گیا۔ اس کے چلے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہٹلر اپنے کمرے سے باہر آیا اور چانسلری میں موجود سب لوگوں کو بلا کر کہا۔

"میں یہیں ٹھہروں گا ــــــ آپ میں سے جو شخص برسیلز برگ جانا چاہتا ہے جا سکتا ہے۔"

اس آخری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے بہت سے چھوٹے افسر اور ہٹلر کے ذاتی معاون و مددگار رخصت ہو گئے۔ جن میں ہٹلر کا محافظ خصوصی شوب، جرمنی بحریہ کی خبریں مہیا کرنے والا، ایڈمرل فان پٹ کیمر، ہٹلر کے دو سٹینو گرافر، ہرگیسل اور ہیگن، ہٹلر کے چار سیکرٹریوں میں سے دو سیکرٹری فیرولین شروڈر اور فیرولین وولف وغیرہ شامل تھے۔ انہی میں فیوہرر کا معالج خصوصی ڈاکٹر موریل بھی شریک تھا، ہٹلر کے آخری الفاظ اس کے لیے یہ تھے۔

"ڈاکٹر موریل میں تمہاری خدمات کا معترف ہوں۔ لیکن اب مجھے ان دواؤں کی مزید ضرورت نہیں رہی۔"

۲۳ اپریل سے لے کر ۲۷ اپریل تک آہستہ آہستہ لوگ چانسلری میں کم ہوتے گئے یہاں تک کہ چند ذاتی خدمت گاروں، باورچی اور جنرل گوئبلز اور اس کے بیوی بچوں، ایلوا براؤن اور فیوہرر کے سوا اس تہ خانے میں اور کوئی نہ رہا ــــــ بیرونی دنیا سے وائرلیس، ٹیلیفون اور ریڈیو

کا سلسلہ درہم برہم ہو چکا تھا۔ ۲۴ اپریل کو جو آخری ٹیلیگرام فیوہرر کو موصول ہوا وہ جنرل گوئرنگ کی طرف سے تھا۔ جس میں کہا گیا تھا:

"چونکہ فیوہرر موجودہ صورتِ حال سے نپٹنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اس لئے جرمن فوجوں کی کمان اور دشمنوں سے ہر قسم کے مذاکرات کرنے کا حق ایک معاہدے کے مطابق خود بخود ہٹلر کے ڈپٹی جنرل ہرمن گوئرنگ کو منتقل ہوگیا ہے۔ جنرل گوئرنگ فیوہرر کا دلی احترام کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ان کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم رہے۔"

یہ ٹیلیگرام پڑھ کر ہٹلر کی جو کیفیت ہوئی اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خون کا ایک قطرہ بھی اس کے جسم میں باقی نہیں رہا۔ شاید یہ اس کی آمریت پر ایک بھرپور ضرب تھی اور اب اس کے بے پناہ اضطراب اور مایوسی کو دیکھ کر ہمیں یقین ہو چلا تھا۔ کہ وہ اس دنیا میں چند روز کا مہمان ہے۔ اس تہ خانے میں اسے بیرونی دنیا سے جو آخری خبر ملی، اس نے فیوہرر کی رہی سہی قوتِ برداشت بھی سلب کر لی۔ یہ خبر تھی، اس کے دوست اور اٹلی کے آمر مسولینی کی موت ——— مسولینی اور اس کی محبوبہ کلارا پیٹیسی کو شمالی اٹلی کے قوم پرستوں نے پکڑ کر پھانسی پر لٹکا دیا اور پھر ان کی مسخ شدہ لاشوں کو میلان مارکیٹ پر کئی روز تک اُلٹا لٹکائے رکھا۔ جہاں ہر وقت سینکڑوں آدمی جمع رہتے اور ان لاشوں پر تھوکتے اور گندگی پھینکتے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہٹلر نے مرنے سے پہلے وصیت کی کہ اس کی اور ایوا براؤن کی لاشیں جلا دی جائیں۔ تاکہ دشمنوں کو ان کا سراغ بھی نہ ملے۔

اگرچہ میں اس سے پہلے تیس اپریل کے تاریخی حادثے کا ذکر کر چکا ہوں۔ مگر اب دوبارہ اسے تفصیلاً بیان کرتا ہوں تاکہ نازی آمر کی ڈرامائی لیکن نہایت بے کسی کی موت کی مکمل جزئیات آپ کے سامنے آجائیں۔ ۲۹ کی دوپہر کو ہٹلر نے اپنے ایک سابق معالج پروفیسر ہیزی کو طلب کیا جو ان دنوں برلن میں زخمیوں کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔ جب وہ تہ خانے میں آیا تو اسے حکم دیا گیا کہ السیشن کتے بلونڈی کو زہر دے کر ہلاک کر دے۔ بلونڈی ہٹلر کا پالتو کتا تھا اور وہ ہٹلر سے بہت مانوس تھا۔ بلونڈی کے علاوہ دو پالتو کتے اور تھے، انہیں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ بعد ازاں ہٹلر نے اپنے

دونوں سیکرٹریوں کو زہر کے کیپسول دیتے ہوئے کہا:

"مجھے افسوس ہے کہ میں تم لوگوں کو کوئی اچھی چیز نہ دے سکا۔ میں تمہاری جرأت اور استقلال کا معترف ہوں۔ کاش تمہاری طرح میرے فوجی جنرل بھی اتنے ہی جری اور باہمت ہوتے۔"

دس سال کی مدت میں پہلی بار اس مرد آہن کی آنکھوں میں آنسو جھلملاتے ہوئے دیکھے گئے۔



۲۹ر اپریل ۱۹۴۵ء کو شام کے وقت چانسلری میں ایک "الوداعی دعوت" کا اہتمام کیا گیا جس میں عورتوں اور مردوں سمیت کُل بیس افراد نے شرکت کی۔ جب یہ سب لوگ جمع ہو گئے تو ہٹلر جنرل بورمین کی معیّت میں اپنے پرائیویٹ کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی اور چہرہ بے جان دکھائی دیتا تھا۔ اس نے دزدیدہ نظروں سے سب کو دیکھا اور پھر اس نے ہر عورت سے باری باری ہاتھ ملایا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ بعض خواتین نے آہستہ سے اس سے کچھ کہا تھا مگر فیوہرر نے جواب میں کوئی لفظ زبان سے نہ نکالا اور پھر واپس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس موقعے پر ہر شخص غمگین اور مضطرب دکھائی دیتا تھا۔ جب ہٹلر چلا گیا تو سب لوگ نازک ترین صورتِ حال پر غور کرنے کے لئے ٹھہر گئے۔ ان کو یقین ہو چکا تھا کہ فیوہرر کی خودکشی اب کسی وقت بھی عمل میں آسکتی ہے۔

یہ چند لمحوں کے لئے چانسلری میں ملازموں اور افسروں کے درمیان ہر نوع کا امتیاز اُٹھ

گیا تھا کیونکہ سب نے نہ صرف ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھایا بلکہ مل جل کر ڈانس بھی کیا اور اعلیٰ افسروں نے نہایت پُرخلوص انداز میں معمولی ملازموں سے ہاتھ ملائے اور ان کو الوداع کہا۔ بات دراصل یہ تھی کہ ہٹلر کی متوقع موت کے ساتھ ساتھ ان سب کو یقین ہو گیا کہ ان میں کوئی بھی آئندہ ایک دور تک زندہ نہیں رہے گا۔ البتہ ایک شخص ایسا تھا جو نہ صرف اپنی زندگی کے بارے میں مطمئن تھا بلکہ آخر دم تک ہٹلر کو بچانے کی کوشش کرتا رہا لیکن ناکام ہوا۔ یہ شخص تھا جنرل مارٹن بورمین۔ ۲۹ اور ۳۰ اپریل کی درمیانی رات کو اس نے جنرل ڈونیز کو کئی تار اس مضمون کے روانہ کئے کہ ہٹلر آخری دم تک برلن کا دفاع کرنے کا ارادہ کر چکا ہے۔

۲۹ اپریل کی الوداعی تقریب صبح تین بجے کے قریب ختم ہوئی اور ہٹلر کی چانسلری سے باہر رہنے والے فوجی افسر اپنی اپنی بیویوں کے ساتھ واپس چلے گئے۔ آدھے گھنٹے کے بعد باہر سے جنگ کی صورتِ حال سے متعلق تازہ خبریں چانسلری میں آنی شروع ہوئیں۔ بریگیڈیئر فیوہرر مونکی، جو ایسی تمام اطلاعات ہٹلر تک پہنچانے کا ذمہ دار تھا، خاصا خوش نظر آتا تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ جرمنوں نے شیلشیر کا ریلوے سٹیشن روسیوں سے چھین کر دوبارہ اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ دوپہر کو خبر آئی ہے کہ فریڈرخ کی زیرِ زمین ریلوے سرنگ، جس پر جرمنوں کا قبضہ تھا اب روسیوں کے قبضے میں چلی گئی ہے اور پھر پتہ چلا کہ ہٹلر کی چانسلری سے قریب دونر ٹراس کی ریلوے سرنگ پر بھی دشمن نے قبضہ کر لیا ہے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد خبر آئی کہ روسی فوجوں نے دریائے سپری کے پل پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ بریگیڈیئر مونکی ہر خبر خود فیوہرر تک پہنچاتا رہا۔ اور اس کا بیان ہے کہ ہٹلر نے خلاف توقع یہ ہولناک خبریں پورے سکون و اطمینان سے سنیں اور کسی قسم کے تُند جذبات کا اظہار نہیں کیا۔ دن کے دو بجے اس نے معمول کے مطابق لنچ کھایا۔ میں نے دیکھا کہ ایوا براؤن ہٹلر کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا تو اسے بھوک نہیں تھی۔ یا اس نے دوپہر کا کھانا اپنے کمرے ہی میں کھا لیا ہوگا —— البتہ کھانے کی میز پر ہٹلر کا ساتھ اس کی دو سیکرٹریوں اور باورچی نے دیا۔ کھانا کھاتے وقت مکمل خاموشی رہی، نہ ہٹلر نے منہ سے کوئی لفظ نکالا اور نہ کسی نے اس سے کچھ کہا۔

کھانے کے بعد میجر گنشی نے چانسلری سے باہر ٹرانسپورٹ آفیسر کو پیغام بھیجا کہ دوسو

ڈبے پٹرول فوراً بھیجا جائے ——— اس نے جواب دیا کہ اس نازک صورت حال میں، جب کہ پٹرول کا حصول سخت مشکل ہے، اتنی مقدار میں پٹرول بھیجنا ناممکن ہے، لیکن جب میجر گنشی نے اسے سختی سے کہا کہ یہ فیوہرر کا خاص حکم ہے تو ٹرانسپورٹ آفیسر کو سر تسلیم خم کرنا پڑا اور اس بدنصیب نے دو سو کی بجائے ایک سو اسّی ڈبے پٹرول اپنے چار آدمیوں کے ہاتھ چانسلری کی طرف بھیج دیئے اور ہر ڈبے میں ساڑھے چار گیلن پٹرول تھا۔ پٹرول کے یہ ڈبے باغ کی طرف کھلنے والے دروازے کے پاس جب لے جائے گئے تو دروازے پر متعین گارڈوں نے حیرت کا اظہار کیا۔ عین اسی لمحے میں اُدھر آنکلا۔ میں نے گارڈوں کو سمجھایا کہ فیوہرر کے خاص حکم سے یہ پٹرول لایا گیا ہے تو انہوں نے ان ڈبوں کو باغ میں لے جانے کی اجازت دے دی۔ اس وقت تک مجھے خود بھی معلوم نہ تھا کہ پٹرول کی اس قدر مقدار منگوانے سے فیوہرر کا اصل مقصد کیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک اور حکم آیا کہ ان گارڈوں کے سوا، جو ڈیوٹی پر ہیں، تمام گارڈ چانسلری سے نکل جائیں۔ شاید اس کا مقصد یہ تھا کہ اب جو کارروائی ہونے والی ہے اسے وہ نہ دیکھ سکیں۔

لنچ کے بعد، جیسا کہ روزمرّہ کا دستور تھا، چانسلری میں موجود تمام لوگ فیوہرر کے احکام سننے کے لئے جمع ہوئے۔ ان میں مجھ سمیت بورمین، گوئبلز، برگڈورف، کربس، ہیول، نومین، ووز، ڑین ہوبر، ہوگل، گنشی شامل تھے۔ عورتیں صرف چار تھیں۔ جن کے نام یہ تھے۔ فراؤ کرسچین، فراؤ جونگی، فرولین کورنگرا اور فرولین مینزلی ——— مجھے یاد ہے کہ جنرل گوئبلز کی بیوی اس تقریب میں شریک نہیں ہوئی تھی اور وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ ایک مرتبہ پھر ہٹلر اور ایوا براؤن نے نہایت خاموشی سے فرداً فرداً سب افراد سے مصافحہ کیا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں اس وقت "میپ روم" کے باہر کھڑا تھا۔ جب چانسلری میں فائر کی آواز گونجی ایک لمحے انتظار کے بعد میں ہٹلر کے کمرے میں داخل ہؤا۔ ہٹلر جس صوفے پر مردہ پڑا تھا۔ وہ خون سے تربتر ہو چکا تھا۔ اس کے قریب ہی ایوا براؤن کی لاش پڑی تھی۔ اگرچہ ایک اور ریوالور زمین پر پڑا پایا گیا۔ لیکن ایوا براؤن نے زہر کا کیپسول کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا ہی بہتر سمجھا۔

میرے بعد اس کمرے میں داخل ہونے والا دوسرا شخص جنرل گوئبلز تھا۔ وہ خاموشی

سے صوفے کے سرہانے آکر فیوہرر کی لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ باہر چانسلری میں دوسرے ملازموں کے زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے گنشی کی آواز سنی جو پکار کر کسی سے کہہ رہا تھا۔

"ڈیر چیف اِزٹ ٹوٹ"

اس کا مطلب تھا "آقا مر گیا" اتنے میں پھر دروازہ کھلا اور آرتھر ایکس مین کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اسے افسوس تھا کہ وہ فیوہرر سے ملاقات کی الوداعی تقریب میں شریک نہیں ہو سکا۔ ایکس مین دراصل "ہٹلر یوتھ" (YOUTH) کا افسر اعلیٰ تھا اور ان آدمیوں میں سے تھا جن پر فیوہرر دلی اعتماد رکھتا تھا۔ وہ چند منٹ جنرل گوئبلز سے باتیں کرتا رہا اور جب گوئبلز کمرے سے نکل کر باہر گیا تو ایکس مین نے جھک کر فیوہرر کی خون آلود پیشانی کو چوما اور پھر سیدھا کھڑا ہو کر فوجی انداز میں سلامی دی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اتنے میں ہٹلر کا ذاتی ڈرائیور کیمپکا کمرے میں آیا۔ اس کے پیچھے ہی ایس ایس کے دو اور آدمی کمرے میں آئے۔ ہماری ہدایت پر انہوں نے ہٹلر کی لاش کو موٹے کمبل میں اس طرح لپیٹا کہ اس کا چہرہ اور وردی پر پھیلے ہوئے خون کے بڑے بڑے دھبے چھپ گئے اور جب لاش کو ہاتھوں پر اٹھا کر چانسلری کی درمیانی گذرگاہ میں لایا گیا تو سب لوگوں نے فیوہرر کا منہ آخری بار دیکھا اور یہاں سے لاش باہر جانے والے خفیہ دروازے کی راہ سے باغ میں لے جائی گئی۔ اس کے بعد جنرل بورمین نے خود اپنے بازوؤں پر ایوا براؤن کی لاش اٹھائی۔ اسے کمبل سے ڈھانپنے کی ضرورت اس لئے نہ محسوس کی گئی کہ لاش پر خون کے دھبے نہ تھے۔ جنرل بورمین لاش کو کمرے سے نکال کر درمیانی راہداری میں لایا اور یہاں اُسے ڈرائیور کیمپکا نے اپنے کندھوں پر اٹھا لیا اور سیڑھیوں تک لے گیا پھر یہ لاش میجر گنشی نے سنبھال لی اور سیڑھیوں پر چڑھ کر ایک تیسرے ایس ایس کے حوالے کر دی۔ میں نے ایوا براؤن کی لاش باغ میں لے جا کر ہٹلر کی لاش کے پاس رکھ دی۔ احتیاط کے طور پر چانسلری سے باہر جانے والے دوسرے تمام دروازے بند کر دیئے

گئے تھے تاکہ ان غیر متعلقہ لوگوں کی نظروں سے وہ تمام کارروائی محفوظ رہے جو لاشوں کے ساتھ کی جانے والی تھی۔ مگر ایسا نہ ہوا اور ان تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود کم از کم ایک آدمی ایسا ضرور تھا جسے کارروائی اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا اصولاً حق نہ پہنچتا تھا۔

اس کا نام ایرچ مینسفیلڈ تھا اور یہ شخص چانسلری کے ٹاور میں اس وقت ڈیوٹی پر تھا۔ دفعتہً اس نے چانسلری میں دروازے بند ہونے اور آفیسروں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں سُنیں تفتیش کو اپنا فرض جان کر وہ ٹاور کی سیڑھیاں اُتر کر باغ میں آیا۔ ایمرجنسی گیٹ پر پہنچا اور سیڑھیاں اتر کر جونہی ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو سامنے سے اُسے "ماتمی جلوس" آتا دکھائی دیا۔ آگے آگے ایس ایس کے دو آفیسر کمبل میں لپٹی ہوئی ایک لاش لئے آتے ہیں اور اُن کے پیچھے ایک دوسرا ایس ایس آفیسر ایوا براؤن کی لاش کندھے پر اٹھائے ہوئے ہے اور بورمن، برگ ڈورف، گوئبلز، گنشی، لینگی اور کیمپکا جیسے لوگ ان جنازوں کے ساتھ ساتھ ہیں مینسفیلڈ کو دیکھتے ہی میجر گنشی نے چلا کر اُسے باہر نکل جانے کا حکم دیا اور وہ اپنی زندگی کا سب سے حیران کن تماشا دیکھ لینے کے بعد واپس اپنے ٹاور میں پہرہ دینے چلا گیا۔

ڈیوڑھی سے نکل کر ہٹلر اور ایوا براؤن کی لاشیں قریب قریب رکھ دی گئیں اور پھر اُن پر خاصی مقدار میں پیٹرول چھڑکا گیا، یہاں تک کہ دونوں لاشیں اچھی طرح پیٹرول سے تر ہوگئیں۔ یہ کام میں نے سرانجام دیا۔ اسی دوران میں ایک روسی بمبار طیارہ گھومتا ہوا اِدھر آنکلا اور اس نے بم برسانے شروع کر دیے ایک بم تو باغ ہی میں پھٹا اور ہم سب پناہ لینے کے لئے ڈیوڑھی میں چھپ گئے۔ میجر گنشی نے تیل سے بھیگے ہوئے ایک چیتھڑے میں آگ لگائی اور اُسے لاشوں کے اوپر پھینک دیا۔ آگ فوراً تیزی سے بھڑک اُٹھی۔ سب فوجی انداز میں سلامی دینے کے لئے کھڑے ہوگئے پھر انہوں نے اپنے ہاتھ اٹھا کر "ہیل ہٹلر" کا نعرہ لگایا۔ اور چانسلری میں واپس چلے گئے۔ صرف میں اور میجر گنشی وہاں کھڑے رہے۔ روسی بمبار طیارے اب کافی تعداد میں آسمان پر چکر لگا رہے تھے اور بموں کے دھماکوں سے زمین خشک پتے کی مانند کانپ رہی تھی۔ ہمیں خدشہ تھا کہ باغ میں آگ جلتے دیکھ کر وہ اِدھر

ضرور بم پھینکیں گے۔ لیکن خیریت ہی رہی کہ ایک بم کے سوا کوئی اور بم باغ میں نہ پھٹا۔ میجر گنشی سے اجازت لے کر میں فیوہرر کی وصیت پوری کرنے کے لئے وہاں سے رخصت ہوا۔ اس کے بعد کی کہانی میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ اس لئے دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر جب میں دوبارہ باغ کی طرف گیا تو پتہ چلا کہ پٹرول ناکارہ تھا اور لاشیں اچھی طرح نہیں جل سکیں۔ پس انہیں قریب ہی دفن کر دیا گیا ہے۔ میجر گنشی کا کہنا تھا کہ فیوہرر کی لاش جلنے کا منظر میری زندگی کے دہشت ناک واقعات میں سب سے زیادہ عبرت ناک تھا۔

مجھے اتنی جرأت ہرگز نہ تھی کہ میجر گنشی یا دوسرے اعلیٰ افسروں سے یہ سوال کروں کہ انہوں نے ہٹلر اور اس کی محبوبہ کی لاشوں کو کہاں دفنایا ہے۔ میں خاموشی سے چانسلری میں چلا گیا۔ لیکن اس وقت مجھے بھی شک تھا کہ لاش اتنی جلدی کس طرح دفنائی جا سکتی ہے اور میرا شک صحیح ثابت ہوا چونکہ اسی رات کو گیارہ بجے کے قریب پولیس گارڈ کا افسر اگلی ٹیلن ہویر چانسلری میں آیا اور ایس ایس کے سرجنٹ ایسکورٹ سے کہنے لگا کہ وہ اپنے کمانڈنگ آفیسر شیڈل کو فوراً رپورٹ دے اور اس کے بعد تین ایسے آدمی لائے جو ہر طرح اعتماد کے قابل ہوں تاکہ لاشیں دفنانے کا کام ختم کر دیا جائے۔ اس کے بعد ہم سب ملازموں کو طلب کیا گیا اور نہایت سختی سے ہدایت کی گئی کہ اس راز کو اپنے سینوں میں ہمیشہ کے لئے دفن کر دیں اور چانسلری سے باہر کسی کو بھی پتہ نہ لگنے پائے کہ ہٹلر اور اس کی محبوبہ کی لاشوں کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے اور اگر کسی نے اس "قومی راز" کو افشا کرنے کی کوشش کی تو اُسے فوراً گولی مار دی جائے گی۔

رات کے بارہ بجے کے بعد ایک مرتبہ پھر آسمان پر روسی بمبار طیارے نمودار ہوئے اور بم کے دھماکوں سے شہر لرزنے لگا۔ مینسفیلڈ کی ڈیوٹی حسبِ معمول چانسلری کے ٹاور میں تھی۔ اس نے مجھے اگلے روز کی صبح کو بتایا۔

"لینگی! رات کو میں نے فیوہرر اور اس کی محبوبہ کو دفن کئے جاتے کا منظر دیکھا ہے۔ ایمرجنسی گیٹ کے قریب بم گرنے سے زمین میں جو گہرا شگاف

پڑگیا تھا، بس اسی میں ان دونوں کی ادھ جلی لاشیں ڈال کر گڑھا پُر کر دیا گیا"

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ مینسفیلڈ کا بیان کس حد تک حقیقت پر مبنی تھا کیونکہ روسی افسروں نے جب چانسلری پر قبضہ کیا تو مینسفیلڈ کے بیان کے مطابق ایمرجنسی گیٹ کے قریب کی زمین کافی دور تک انہوں نے کھود دی تھی تاکہ فیوہرر اور ایوا براؤن کی لاشوں کا کچھ سراغ مل جائے، لیکن ناکام رہے۔ البتہ چانسلری کی حفاظت کرنے والے گارڈوں اور دوسرے بہت سے سپاہیوں کی بے شمار لاشیں اور ہڈیاں وہاں بکھری پڑی تھیں۔ عین ممکن ہے کہ ہٹلر اور ایوا براؤن کی ہڈیوں اور لاشوں کے بچے کھچے حصّے انہی میں مل گئے ہوں۔

مجھے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ فیوہرر اور ایوا براؤن کی لاشیں کہاں دفن کی گئی تھیں میں تو صرف یہ شہادت دینا چاہتا ہوں کہ وہ مر چکے تھے اور چانسلری کے باغ میں اُن کی لاشیں جلانے کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔ فیوہرر کی ڈرامائی موت کے بعد اس دہشت اور دبدبے کا وہ زبردست بوجھ جو ہر جرمن سپاہی اور اعلیٰ افسر کے دل پر رکھا ہوا تھا دور ہو چکا تھا۔ اور اب ہر شخص اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا۔ یہاں تک کہ کسی نے اپنے آقا کی لاش کا مزید احوال جاننے کی سعی نہیں کی۔ چانسلری میں رہنے والا ہر فرد اب آزاد تھا۔ ہر کمرے میں جا سکتا تھا، اونچی آواز سے گفتگو کر سکتا تھا اور نڈر ہو کر تمباکو نوشی کر سکتا تھا۔ کیونکہ ہٹلر نے چانسلری میں کبھی کسی کو تمباکو نوشی کی اجازت نہ دی تھی۔

اب ان لوگوں کے سامنے بے شمار مسائل تھے جن کو حل کرنا ضروری تھا۔ سب سے پہلے جس مسئلے نے سر اٹھایا وہ فیوہرر کی جانشینی کا مسئلہ تھا۔ کون ہے وہ شخص جو اس بارِ گراں کو اپنے کندھے پر سنبھال رکھنے کی قوّت رکھتا ہے؟ امکان یہی تھا کہ یہ عہدۂ جلیلہ جنرل بورمین کے لئے موزوں رہے گا، کیونکہ ہٹلر کی حیات ہی میں وہ اس کی طرف سے احکام جاری کرنے لگا تھا اس کا کہنا تھا کہ خود ہٹلر نے اپنی وصیت میں اسے اپنا

جانشین بنایا ہے لیکن اسے خدشہ تھا کہ کہیں ایڈمرل ڈونیز اقتدار نہ سنبھال لے اس وقت تک ڈونیز ہٹلر کی موت سے بے خبر تھا۔ چنانچہ بورمین نے کمال عیاری سے کام لیتے ہوئے ایڈمرل ڈونیز کو ایک ٹیلی گرام ارسال کیا جس میں درج تھا۔

"سابق رائخ مارشل گوئیرنگ کی جگہ فیوہرر نے آپ کو اس کے عہدے پر مقرر کیا ہے۔ تحریری احکام عنقریب آپ کو بھیجے جائیں گے اور ان احکام کی روشنی میں آپ کو ہر قسم کی صورتِ حال پر قابو پا لینے کی تدابیر اختیار کرنے کا حق ہوگا۔"

جیسا کہ آپ نے دیکھا بورمین نے اس ٹیلیگرام میں فیوہرر کی موت کی اطلاع ڈونیز کو نہ دی۔ اس کا خیال تھا کہ اس خبر کو اخفاء میں رکھ کر اپنی جانشینی کی راہ ہموار کرنے کا بہترین موقع ہے لیکن جب یہ تار پلوئبن کے مقام پر ایڈمرل ڈونیز کو ملی تو وہ فیوہرر کے اس حکم پر حیرت زدہ ہو گیا۔ اُسے کسی طرح یقین ہی نہ آتا تھا کہ مارشل گوئیرنگ کی جگہ ہٹلر اُسے کس طرح گرینڈ مارشل بنا سکتا ہے؟ صرف دو روز پیشتر ڈونیز جنرل ہملر سے ملنے گیا تھا اور اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ فیوہرر کا جانشین بنا تو اُسے ڈونیز کی حمایت حاصل ہو گی اور خود ڈونیز کو بھی یہ یقین تھا کہ فیوہرر کی جانشینی کا حق اگر پہنچتا ہے تو ہملر کو مگر بورمین کے ٹیلی گرام نے اُسے پریشان کر دیا۔ فیوہرر کے حکم سے سرتابی کی سزا صرف موت تھی۔ پس اس نے ٹیلیگرام کے جواب میں لکھا۔

"میرے آقا! میں آپ کا وفادار غلام ہوں۔ میری وفاداریاں موت کے آخری لمحے تک آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کے حکم کی تعمیل میں اگر میری جان بھی چلی جائے تو مجھے عذر نہ ہوگا۔ خدا کرے آپ کا سایہ ہمیشہ جرمن قوم کے سر پر قائم رہے اور میں عہد کرتا ہوں کہ اگر مجھے آپ کا جانشین بننے کی عزت حاصل ہوئی تو میں جرمن عوام کے وقار اور سربلندی کے لئے آخری لمحے تک جنگ کروں گا۔"

اُدھر تو جنرل بورمین ایڈمرل ڈونیز اور ہملر کو فریب دے رہا تھا اور اُدھر

نے روسی فوجوں کے مارشل زدخوف سے رابطہ قائم کیا۔ ہٹلر کی موت کے بعد اُسی روز شام کے وقت چانسلری میں اس نے ایک کانفرنس طلب کی جس میں تمام سرکردہ لوگ شریک ہوئے۔ گوئبلز، کربس، برگ، ڈورف، ایکس مین اور مونکی، اس کانفرنس میں طے پایا کہ مارشل زدخوف سے "صلح کا معاہدہ" کیا جائے اور اس مقصد کے لئے ایک نمائندہ جرمن گورنمنٹ کی طرف سے مارشل زدخوف کے پاس بھیجا جائے۔ چنانچہ وائرلیس کے ذریعے مارشل زدخوف سے بات چیت کی گئی تو اس نے یہ تجویز منظور کر لی اور کہا کہ کوئی بھی شخص آکر بات چیت کر سکتا ہے۔ قرعۂ فال جنرل کربس کے نام نکلا اور وہ آدھی رات کے بعد مارشل زدخوف سے ملنے کے لئے روانہ ہوا۔ اس کے پاس بورمین اور گوئبلز کا لکھا ہوا مشترکہ خط تھا۔ درحقیقت یہ ہے کہ جنرل کربس کے سوا اس "سفارت" کے لئے کوئی دوسرا موزوں نہ تھا۔ وہ کافی عرصے تک ماسکو میں جرمن کا فوجی اتاشی رہ چکا تھا۔ روسی لوگوں اور افسران کے مزاج سے بخوبی واقف تھا، روسی زبان پر اسے کامل عبور تھا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُسے روسیوں اور جرمنوں کے درمیان دوستانہ روابط کی خاص علامت سمجھا جاتا تھا۔ بورمین اور گوئبلز نے مارشل زدخوف کو خط میں لکھا کہ ہٹلر مر چکا ہے اور وہ اپنی وصیّت کے ذریعے سارا اقتدار بورمین اور گوئبلز کے نام منتقل کر گیا ہے اور اب وہ جنرل کربس کو اپنے نمائندے کے طور پر اس کے پاس بھیج رہے ہیں تاکہ وہ جرمن حکومت کی طرف سے صلح کی گفتگو کرے۔

رات بھر یہ لوگ جنرل کربس کی رپورٹ کا انتظار کرتے رہے۔ یکم مئی ۱۹۴۵ء کو دن کے گیارہ بجے جنرل کربس مارشل زدخوف کے فوجی ہیڈکوارٹر سے مایوس اور شکستہ دل واپس آیا۔ زدخوف نے ان کی کوئی شرط بھی تسلیم نہیں کی اور زور دیا کہ جرمن فوج کو ہتھیار ڈال دینے چاہئیں اور وہ تمام لوگ روسی فوج کے حوالے کر دیئے جائیں جو اس وقت چانسلری میں موجود ہیں۔ بورمین اور گوئبلز نے ایک بار پھر کربس کو زدخوف کے پاس بھیجا کہ جرمن فوج اس شرط پر ہتھیار ڈالنے کے لئے تیّار ہے کہ بورمین اور گوئبلز کی حکومت روس تسلیم کرے لیکن زدخوف نے اسے بھی رَدّ کر دیا۔

اب انہوں نے مجبور ہو کر ایڈمرل ڈونیز کو اپنے ساتھ ملا لینا مناسب سمجھا، چونکہ

فوجی قوت فی الحال اسی کے ہاتھ میں تھی۔ چنانچہ اُسے فوراً ایک تار بھیجا گیا جس میں اُسے فیوہرر کی موت کی اطلاع دی گئی اور کہا گیا کہ ہٹلر نے اپنی وصیت میں ڈونیز کو رئخ (REICH) کا صدر مقرر کیا ہے۔ بورمین کو پارٹی منسٹر اور گوئبلز کو رئخ چانسلر بنایا گیا ہے اب ڈونیز کو اختیار ہے کہ وہ عوام اور فوج کو فیوہرر کی موت سے مطلع کر دے۔ چنانچہ ڈونیز نے فوراً ریڈیو پر فیوہرر کی موت کی خبر سناتے ہوئے کہا کہ "آج ہمارے فیوہرر برلن میں فوجوں کی کمان کرتے ہوئے میدانِ جنگ میں کام آئے۔

اغوا

۱۹۴۴ء کی ایک رات کا ذکر ہے، دو نوجوان برطانوی فوجی افسر قاہرہ کے ایک کیفے میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ دونوں ہم عمر اور ہم مذاق تھے اور میدانِ جنگ سے رخصت لے کر قاہرہ میں چند دن آرام کرنے کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام میجر سٹینلے اور دوسرے کا میجر پیٹرک لی فیرمر تھا۔ گفتگو کا موضوع زیادہ تر جنگی چالوں اور مختلف واقعات پر مشتمل تھا۔ دفعتہً میجر سٹینلے پُراسرار انداز میں اپنے دوست کی طرف جھکا اور آہستہ سے کہنے لگا:

"یار میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی ہے۔ اگر اسے عملی جامہ پہنا دیا جائے تو نازیوں میں کھلبلی مچ جائے گی۔"

"کونسی تدبیر؟" دوسرے کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔

"کیوں نہ ہم کسی جرمن جنرل کو اغوا کر کے اپنے ساتھ انگلستان لے جائیں؟"

میجر پیٹرک کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ چند لمحے تک دونوں دوست ایک دوسرے کی طرف پلک جھپکائے بغیر دیکھتے رہے۔ آخر میجر پیٹرک نے زبان کھولی۔

"میرا خیال ہے کہ یہ تدبیر عمل میں نہیں لائی جاسکتی۔ اس میں صریحاً جان کا خطرہ ہے۔"

"میرے دوست ہم تو ہر وقت جان ہتھیلی پر لئے پھر رہے ہیں۔ میدانِ جنگ میں نہ مرے تو کسی نازی جاسوس کی گولی کا نشانہ ہی بنیں گے۔ موت تو ایک ہی بار آئے گی۔ مگر تصویر کا روشن پہلو دیکھنا چاہیئے اگر ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ......" اس نے فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔

اس میں شک نہیں کہ ان نوجوان افسروں کی تجویز بڑی مضحکہ خیز تھی۔ مگر جب قاہرہ اور لندن میں اعلیٰ برطانوی فوجی افسروں کے سامنے اسے پیش کیا گیا۔ تو انہوں نے اسے بے حد پسند کیا۔ اور فوراً یہ طے کر لیا کہ اس تجویز کو بہر صورت عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ اس کے بعد سوچا گیا کہ جرمن جرنیلوں میں کونسے جنرل کو اس موقع پر اغوا کرنا مفید رہے گا۔ آخر قرعۂ فال مشہور نازی افسر میجر جنرل کارل کریپی کے نام نکلا۔ جنرل کریپی ہٹلر کے خاص آدمیوں میں ایک انفرادی حیثیت کا مالک اور لینن گراڈ کے فاتحین میں سے ایک تھا۔ اور ان دنوں کریٹ (گریک آئی لینڈ) میں ۲۲ ہزار نازی دستوں کی قیادت کر رہا تھا۔

کریٹ مشرقی بحیرۂ روم میں ایک پہاڑی جزیرہ ہے جس کا رقبہ تین ہزار دو سو پینتیس میل ہے۔ کریٹ پر نازی قبضے کے باعث بحیرۂ روم کے ایک وسیع حصّے پر بھی جرمن تسلّط قائم ہو گیا تھا۔ اس لیے یہی فیصلہ کیا گیا کہ اگر جنرل کریپی کو یہاں سے نکال لیا جائے تو نازیوں کا سارا منصوبہ تباہ ہو جائے گا۔ اور کریٹ کے لاکھوں مقامی یونانی باشندے جو نازیوں کے ظلم و ستم اور تشدّد کی چکی میں پس رہے ہیں، محفوظ ہو جائیں گے۔

اتحادی جاسوسوں کی خفیہ سرگرمیاں کریٹ میں بھی جاری تھیں اور مقامی باشندے ان کی ہر ممکن مدد کرتے تھے۔ چنانچہ پہاڑی غاروں کے اندر ان جاسوسوں نے اپنی قیام گاہیں بنا رکھی تھیں، جن میں وائرلیس کا بہت اچھا انتظام تھا۔ اور یہ جاسوس ہر وقت لندن سے رابطہ قائم رکھتے تھے۔ چنانچہ لندن والوں نے کریٹ میں مقیم برطانوی جاسوس کو اس سکیم سے آگاہ کر دیا اور کہا کہ اس مقصد کے لیے دو فوجی افسروں کو بھی بھیجا جا رہا ہے جو اپنے ساتھ جنرل کریپی کو انگلستان لائیں گے۔

فروری کی ایک تاریک رات کو برطانیہ کا ایک بمبار طیارہ کریٹ کی ویران پہاڑیوں کے گرد چکر لگاتا دکھائی دیا اور اس میں سے میجر پیٹرک عرف "پیڈی" نے پیراشوٹ کے ذریعے چھلانگ لگا دی۔ میجر پیٹرک کے پیچھے میجر سٹینلے کو جہاز سے کودنا تھا لیکن ایسا ہوا کہ ہوائی جہاز کافی بلندی پر بادلوں میں گھر گیا اور اسے مجبوراً لوٹنا پڑا۔ اگلے چھ ہفتوں میں میجر سٹینلے نے دس مرتبہ کریٹ میں اترنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ

ہوا۔ ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ "پیڈی"، سے برقی رابطہ قائم نہیں کر سکا تھا۔ آخر اس نے جان ہتھیلی پر رکھ کر ایک اندھیری رات میں موٹر لانچ کے ذریعے سمندر میں سفر کیا اور جزیرے کے کنارے پہرہ دینے والی نازی کشتیوں کو دھوکا دے کر ساحل پہ اتر گیا۔ وہ اپنے ساتھ اسلحہ بھی لایا تھا۔ ساحل پر اترنے کے بعد اس نے پھر "پیڈی" سے وائر لیس پر رابطہ قائم کیا تو اس مرتبہ قسمت نے یاوری کی اور کریٹ کے پہاڑی باشندوں نے جنہیں برطانوی جاسوسوں سے ہمدردیاں تھیں۔ سٹینلے کا پیغام وصول کر لیا اور دس بارہ آدمی اس کی رہنمائی کے لئے پہنچ گئے۔ برطانوی جاسوسوں کا خفیہ اڈہ ساحل سے کئی میل دور پہاڑوں کے برفانی غاروں میں تھا۔ اور رات کے وقت پیدل سفر کرنا عذاب سے کم نہ تھا۔ صبح کے چار بجے جب یہ قافلہ اس خفیہ اڈے پر پہنچا تو ان کے جسم تھکان سے چور تھے اور پیر سوج گئے تھے۔

برطانوی جاسوسوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ایک جگہ مستقل طور پر قیام نہ کرتے تھے جس روز میجر سٹینلے ان میں شامل ہوا اسی روز "پیڈی" اور اس کے ساتھیوں نے شمال کی طرف کوچ کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ دن کو وہ دیہاتی باشندوں کے ساتھ ملے جلے رہتے اور رات کو سفر کرتے۔ اس تمام عرصے میں یہ دونوں فوجی افسر جو اس جان جوکھوں کے کام پر آئے تھے بچوں کی کتابیں اور کہانیاں پڑھتے رہے لندن سے انہیں ہدایت ملی کہ کریٹ کے صدر مقام ہیرک لائن میں ایک شخص "مکی" سے رابطہ قائم کرو۔ "مکی" کے پاس جنرل کریپی کے بارے میں معلومات کا وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ اس لیے کہ وہ جنرل کے پڑوس میں رہتا ہے۔

ہیرک لائن پہنچ کر دونوں جاسوسوں نے "مکی"، سے ملاقات کی اور جب اس نے وہ مکان دکھایا جس میں جنرل قیام پذیر تھا تو سٹینلے اور پیٹرک کو اپنی ساری محنت پر پانی پھرتا ہوا دکھائی دیا، کیوں کہ جنرل کی رہائش گاہ سے اسے اغوا کرنا ناممکنات میں سے تھا۔ اس مکان کے چاروں طرف کئی کئی فٹ جگہ چھوڑ کر آہنی تاروں کی بہت اونچی باڑ لگی ہوئی تھی جس میں رات کے وقت برقی قوت چھوڑ دی جاتی تھی۔ مسلح فوجی پہرے

داروں کے کئی دستے اور خونخوار کتوں کا ایک زبردست گروہ جنرل کی رہائش گاہ کو ہر وقت گھیرے میں لیے رہتا تھا۔ اور حالات ایسے تھے کہ کسی پرندے کا پَر مارنا بھی معجزہ سمجھا جاتا۔ لیکن برطانوی جاسوسوں نے ہمّت نہ ہاری۔ انہوں نے "مکی" کے گھر میں چار دن مسلسل قیام کیا۔ اور مکان کی ایک کھڑکی سے جنرل کی نقل و حرکت اور آمد و رفت کی کڑی نگرانی کرتے۔ یہاں تک کہ انہوں نے ایک مکمّل "ٹائم ٹیبل" تیّار کر لیا۔ اب انہیں خوب معلوم تھا کہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں جنرل کی مصروفیات کیا ہوتی ہیں۔ وہ کس وقت بیدار ہوتا ہے۔ کس وقت ناشتہ کرتا ہے۔ اور کس وقت فوجی ہیڈکوارٹرز کے معائنے پر جاتا ہے۔ ٹھیک دس بجے صبح جنرل کریپی فوجی وردی میں ملبوس وقار اور رعب و دبدبے کے ساتھ اپنے مکان سے برآمد ہوتا۔ محافظ سپاہیوں کی پوری گارڈ ادب سے پتھروں کے مجسموں کی طرح بے حس و حرکت ہو جاتی۔ جونہی وہ دروازے سے نکل کر فوجی کار میں بیٹھتا۔ سپاہیوں کی ایڑیاں بجتیں۔ اور جنرل ہیڈکوارٹرز کے معائنے کے لیے روانہ ہو جاتا جو اس کی رہائش گاہ سے پانچ میل کے فاصلہ پر تھا۔ اور ہر شام وہ سورج غروب ہونے کے بعد واپس آتا۔ اس کا یہ معمول اس قدر نپا تلا اور باقاعدہ تھا کہ ایک لمحے کی بھی تاخیر یا تعجیل نہ ہوتی تھی۔

برطانوی جاسوسوں نے سوچ سوچ کر فیصلہ کیا کہ جنرل کو راستے ہی سے اغوا کرنا چاہیئے۔ مگر کس طرح؟ یہ ایک معمّا تھا جو انہیں حل کرنا تھا۔

انہوں نے اس سڑک کے چپّے چپّے کا معائنہ کیا جو جنرل کی رہائش گاہ سے فوجی ہیڈکوارٹرز تک جاتی تھی۔ اس سڑک پر انہیں ایک جگہ ایسی دکھائی دی جہاں وہ جنرل کی کار روک کر اسے اغوا کرنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ یہ سڑک اس مقام پر انگریزی کے حرف (L) کی طرح ایک دم مڑ جاتی تھی۔ اور اس مقام پر پہنچ کر ہر کار ڈرائیور کو لازمی طور پر گیئر بدل کر گاڑی کی رفتار ہلکی کرنی پڑتی تھی۔ پیڈی اور مکی، دونوں نے اس مقام کی اچھی طرح جانچ پڑتال کر کے اپنے فیصلے سے میجر سٹینلے کو مطلع کر دیا۔ اس خطرناک ترین کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ۱۲ آدمی چنے گئے۔ سڑک کے

اس موڑ پر چٹانوں اور کھائی میں آٹھ آدمیوں کو چھپانے کا فیصلہ ہوا۔ اور بقیہ چار آدمیوں کے ذمے یہ فرض سونپا گیا کہ وہ کچھ دور آگے جنرل کی کار کا انتظار کریں۔ اور جونہی گاڑی دکھائی دے سب کو ہوشیار رہنے کا سگنل دے دیں۔ میجر پیٹرک اور میٹنلے کے لئے جرمن سپاہیوں کی وردیاں مہیا کی گئیں۔ جن میں مکّی کی بیوی نے سریع الاثر زہر کی گولیاں سی دی تھیں تاکہ اگر یہ لوگ پکڑے جائیں تو فوراً خودکشی کر کے اپنی زندگی کو ختم کر دیں۔

دوسری طرف نازی جاسوس بھی برطانوی جاسوسوں کی سرگرمیوں سے بے خبر نہ تھے۔ انہیں پتا چل گیا تھا کہ دشمن کے جاسوسوں کا ایک زبردست گروہ جزیرے میں گھس آیا ہے۔ اور "تخریبی" کارروائیوں میں مصروف ہے۔ مگر وہ اس سے لاعلم تھے کہ اِن کا پروگرام جنرل کریپی کو اغوا کرنے کا ہے۔ نازی جاسوسوں نے ان کا سراغ لگانے کی بارہا کوششیں کیں لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ برطانوی جاسوس کسی مستقل جگہ قیام نہ کرتے تھے۔

۲۳ اپریل ۱۹۴۴ء کو ان لوگوں نے نازی جنرل کو اغوا کرنے کا پروگرام آخری شکل میں مرتّب کر لیا۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ جنرل کریپی ہمیشہ سورج غروب ہونے کے بعد ہی واپس گھر آیا کرتا ہے۔ اس لیے سرِشام ہی یہ سب لوگ کیل کانٹے سے لیس ہو کر اس موڑ پر چھُپ گئے۔ جہاں جنرل کی کار کے ڈرائیور کو لازمی طور پر موٹر کی رفتار ہلکی کرنی پڑتی تھی۔ جوں جوں جنرل کے آنے کا وقت قریب آ رہا تھا ان کے دل دھڑکنے لگے تھے۔ ابھی سورج غروب ہونے میں آدھ گھنٹہ باقی تھا کہ جنرل کی کار توقع کے خلاف بہت تیزی سے آئی اور گزر گئی۔ موڑ پر اگرچہ ڈرائیور نے اس کی رفتار ہلکی ضرور کی مگر برطانوی جاسوسوں کو جنرل پر حملہ کرنے کی جرأت اس لیے نہ ہوئی کہ ابھی دن کی روشنی اچھی طرح نہیں ڈھلی تھی۔ ان کو اب یہ شک گزرا کہ شائد جنرل کو اس پروگرام کا علم ہو گیا ہے۔ تبھی وہ وقت سے پہلے اپنے گھر چلا گیا ہے۔ اور اس شک کو مزید تقویت ہوئی جب جنرل کریپی نے سورج غروب ہونے سے بیشتر ہی گھر واپس آجانا اپنا معمول بنا لیا۔ اغوا کرنے والے روزانہ اسی مقام پر چھپ کر بیٹھے رہتے کہ کبھی تو جنرل تاخیر سے آئے گا۔ لیکن

کئی روز تک ایسا نہ ہوا۔

آخر ایک ہفتے بعد، جبکہ وہ مایوس ہونے والے تھے اور ان کے صبر و استقلال کا پیمانہ لبریز ہونے والا تھا کہ قدرت کو ان پر رحم آیا اور اس نے بڑا ہی عجیب موقع فراہم کر دیا۔

۲۰ اپریل کی شام کا ذکر ہے۔ یہ سب جنرل کے انتظار میں اسی موڑ پر چھپے ہوئے تھے۔ سورج کو غروب ہوئے دس منٹ گزر گئے لیکن جنرل کی کار نمودار نہ ہوئی۔ میجر پیٹرک اور میجر سٹینلے جنہوں نے جرمن وردیاں پہن رکھی تھیں اطمینان سے ٹہلتے ہوئے اس طرف جانے لگے جدھر سے جنرل کی کار آنے والی تھی۔ اچانک دو فرلانگ دور انہوں نے دیکھا کہ کسی کار کی اگلی بتیاں روشن ہوئیں اور بجھ گئیں۔ پھر روشن ہوئیں اور بجھ گئیں ان دونوں نے سہم کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خطرہ سمجھ کر پیچھے ہٹنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ معاً میجر سٹینلے نے کہا۔

"آہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنرل کی کار خراب ہو گئی ہے اور ڈرائیور ہمیں بلانے کا اشارہ کر رہا ہے"۔ تم یہیں ٹھہرو میں جا کر دیکھتا ہوں۔

پھر وہ دوڑتا ہوا اس طرف گیا تو واقعی جنرل کریپ گاڑی سے باہر ٹہل رہا تھا۔ اور ڈرائیور ننھے ہاتھوں سے انجن کا ڈھکنا اٹھائے پرزوں کو ٹٹول رہا تھا۔ اس نے جنرل کو سلوٹ کیا اور پھر جرمن زبان میں ڈرائیور سے پوچھا کہ کیا خرابی ہے۔ اس پر جنرل کریپ نے جھلا کر جواب دیا۔

"وقت ضائع نہ کرو ——— جاؤ کسی مکینک کو بلا لاؤ ——— دوڑتے ہوئے جاؤ"۔

میجر سٹینلے کی حاضر دماغی کام آئی۔ اس نے فوراً کہا۔

"جناب میرا ایک مکینک دوست قریب ہی موجود ہے۔ میں اسے بلا لاتا ہوں"۔

وہ بھاگتا ہوا واپس گیا اور پیٹرک سے جلدی جلدی کہا کہ سب کو اشارے سے خبردار کر دو۔ آج جنرل اور اس کے ساتھ صرف ڈرائیور ہے۔ ان کی موٹر بگڑ گئی ہے اور تم اپنے آپ کو مکینک ظاہر کرو گے۔ چند منٹ تک موٹر کے پرزے دیکھتے رہنا۔ اور جونہی میں اشارہ

کردں۔ ڈرائیور کو قابو کر لینا۔ میں جنرل کو سنبھال لوں گا۔"

انہوں نے اپنے ساتھیوں کو خبردار رہنے کا اشارہ کیا اور پھر جلد جلد اس طرف گئے جہاں جنرل کریپی اپنے ڈرائیور کو کرخت زبان میں گالیاں دے رہا تھا۔ ان دونوں نے پہنچ کر سلوٹ کیا۔ میجر پیٹرک نے فوراً ڈرائیور کو الگ ہٹایا اور تیزی سے انجن کے پرزوں کی جانچ پڑتال کرنے لگا۔ خدا کی قدرت کہ پیٹرک نے ایک ہی لمحے بعد انجن سٹارٹ کر دیا۔ جنرل کریپی فوراً گاڑی میں بیٹھ گیا اور ڈرائیور کو حکم دیا کہ جلد گھر چلو۔ جنرل نے اس مکینک کا شکریہ ادا کرنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔ یہی وہ موقع تھا کہ میجر سٹینلے نے کمال جرأت سے کام لیا اور آگے بڑھ کر جنرل کی پسلی سے اپنا پستول لگا دیا اور جرمن زبان میں کہا۔

"اگر آپ نے ذرا بھی جنبش کی تو چھ گولیاں اس جسم سے پار ہو جائیں گی۔"

ادھر پیٹرک بھی غافل نہ تھا۔ اس نے گھبرائے ہوئے ڈرائیور کی کنپٹی پر پوری قوت سے گھونسا مارا وہ لڑھک کر پرے جا پڑا۔ پیٹرک نے فوراً اس کا پستول اپنے قبضے میں لے لیا۔ اور پھر سیٹی بجا دی۔ اس کے ساتھی دوڑتے ہوئے آئے۔ پھر ان سب نے جنرل کریپی اور اس کے ڈرائیور کو قابو میں کر لیا۔ اس وقت ایک ایک لمحہ نازک اور مہلک تھا۔ اور سخت خطرہ تھا کہ اگر ادھر سے کوئی اور جرمن کار جنرل کی تلاش میں آگئی تو کام خراب ہو جائے گا۔ چنانچہ سوچی سمجھی سکیم کے تحت جنرل کی وردی اتروا کر میجر سٹینلے نے پہن لی اور اپنی وردی اسے پہنا دی۔ اور اس کے ڈرائیور کی وردی میجر پیٹرک نے پہنی پھر ڈرائیور کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اسے قریب ایک کھڈ میں ڈال دیا۔ اور جنرل کو کار کی پچھلی نشست پر کونے میں بٹھا دیا۔ اس کے برابر ہی نقلی جنرل کریپی ہاتھ میں پستول لیے بیٹھا اور کار پیٹرک نے چلا دی۔ فوجی ہیٹ اپنی پیشانیوں پر انہوں نے اس طرح جھکائے کہ چہرہ صاف نظر نہ آتا تھا۔ جنگ کی راتیں تاریک تھیں چاروں طرف روشنی کی ہلکی سی کرن بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ اس لیے یہ خدشہ نہ تھا کہ وہ پہچان لیے جائیں گے۔ انہیں معلوم تھا کہ راستے میں کئی جگہ نازی سپاہیوں کی چوکیاں ملیں گی۔ مگر ان کو دھوکا دینا اتنا مشکل نہ تھا۔ کوئی آدھ میل کے بعد پہلی جرمن چوکی دکھائی دی۔

نقلی جنرل کی کار دیکھتے ہی نازی پہرے دار اٹینشن ہو گئے۔ اور کار آگے گزر گئی۔ آخر جنرل کا مکان آگیا۔ دروازے پر کھڑے مسلح پہرے داروں نے فوراً مکان کا دروازہ کھولا لیکن نقلی جنرل نے کمال جرأت سے کام لے کر اپنا ہاتھ باہر نکال کر اشارہ کیا کہ وہ آگے جا رہا ہے اور پھر گاڑی آگے بڑھ گئی۔ قصہ مختصر اس طویل راستے میں جو ہیرک لائن کو جاتا تھا نازی سپاہیوں کی بائیس چوکیاں ملیں۔ اور وہ ان سب کو دھوکا دیتے ہوئے گزر گئے جس وقت وہ شہر میں داخل ہوئے تو سینماؤں میں سے لوگوں کا ہجوم باہر نکل رہا تھا۔ گلیاں اور بازار انسانوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ میجر سٹینلے مسلسل موٹر کا ہارن بجا رہا تھا۔ اور بازاروں میں چلتے ہوئے جرمن سپاہی جونہی جنرل کی کار دیکھتے فوراً سلوٹ کرتے اور میجر پیٹرک بالکل جنرل کریپی کے انداز میں گردن کو ہلکے ہلکے جھٹکے دے کر ان کے سلام قبول کرتا رہا۔ میجر سٹینلے نے اپنی ڈائری میں اس واقعہ کا تفصیلاً ذکر کرتے ہوئے لکھا۔

"شہر سے بخیریت گزر کر ہم پہاڑی علاقے میں پہنچ گئے۔ یہاں ہم نے کار کو ایک گہرے کھڈ میں دھکیل دیا اور جنرل کو اتار کر پہاڑی دروں میں پیدل چلنے لگے جنرل کریپی نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ اب کسی طرح بھی فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس نے اشارے سے کہا کہ اس کے منہ میں سے کپڑا نکال لیا جائے جب ہم نے ایسا کیا تو وہ بولا۔

"دوستو! میں جانتا ہوں کہ میری موت اب نزدیک ہے اس لیے تم مجھے جہاں لے جانا چاہو لے جا سکتے ہو، میں وعدہ کرتا ہوں کہ کسی قسم کی بھی مزاحمت نہ کروں گا، البتہ یہ ضرور کہتا ہوں کہ اگر مجھے فرار ہونے کا موقع ملا تو اس میں بھی کوتاہی نہ ہو گی۔" ہم نے اس کے قول کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے ہاتھ پاؤں آزاد کر دیئے۔ اور اسے تلقین کی کہ وہ خاموشی سے ہمارے ساتھ راستہ طے کرے۔

"ہمیں معلوم تھا کہ جلد یا بدیر نازی جاسوسوں کو جنرل کریپی کے غائب ہونے کی خبر ہو جائے گی۔ اور ۳۵ میل چوڑے اور ۱۶۵ میل لمبے جزیرے میں ۲۲ ہزار نازی

سپاہی سراغ رساں کتوں کی مانند ہمارے تعاقب میں نکل آئیں گے۔ اور اگر ہم پکڑے گئے تو . . . . . . اس سے آگے یہ سوچنا بھی محال تھا کہ ہم زندہ بچ سکیں گے۔

بہر حال دوسرے روز دوپہر کو جب ہم ایک برفانی چوٹی کے قریب ہی ایک غار میں چھپے ہوئے تھے آسمان پر نازی طیاروں کا ایک زبردست غول نمودار ہوا۔ یہ طیارے چاروں طرف پھیل گئے ان کی اونچائی بہت کم تھی۔ ہم نے فوراً محسوس کر لیا کہ یہ طیارے ہماری ہی تلاش میں ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ان جہازوں نے چھوٹے چھوٹے کاغذ زمین پر پھینکنے شروع کر دیئے۔ ہمارا ایک ساتھی چھپتا چھپاتا باہر نکلا۔ اور تھوڑی دور پڑے ہوئے کاغذوں میں سے ایک کاغذ اٹھا لایا اس میں لکھا تھا۔

"باشندگانِ کریٹ کو سخت تنبیہ کی جاتی ہے کہ اگر انہوں نے تین دن کے اندر اندر جنرل کریپی کو زندہ سلامت ہمارے حوالے نہ کیا یا اس کا پتا نہ بتایا تو پوری آبادی کو خاک اور خون کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا جائے گا۔"

سارا دن یہ لوگ اسی غار میں چھپے رہے۔ اور جب سورج غروب ہو گیا تو وہاں سے نکل کر مشرق کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ قاہرہ سے وائرلیس کے ذریعے رابطہ قائم کر کے کہا جائے کہ جنرل کریپی ہمارے قبضے میں آچکا ہے اور اب بتایا جائے کہ آئندہ کیا کارروائی کرنی چاہیئے۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ موسم روز بروز خراب ہوتا جا رہا تھا۔ اور برفباری شدت سے جاری تھی۔ ان حالات میں وائرلیس کا سارا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ سمندر کے ساحل پر پہنچنے کے بعد کسی لانچ پر قبضہ کر کے فرار ہونا ہی اس وقت ممکن ہو سکتا ہے مگر ساحل دس میل کے فاصلے پر تھا اور یہ سارا راستہ سخت خطرناک اور مخدوش تھا۔"

"ابھی ہم لوگ بمشکل دو میل ہی گئے تھے کہ آسمان پر طیاروں کے گرجنے کی آواز آئی۔ اور پھر جیسے پورا جزیرہ روشنی میں ڈوب گیا طیارے سرچ لائٹ کے ذریعے ہمارا سراغ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ابھی ہم چھپنے بھی نہ پائے تھے،

ایک طیارے نے غوطہ لگایا اور مشین گن سے تڑاتڑ فائر کرنے لگا۔ گولیاں ہمارے دائیں بائیں سنسناتی ہوئی گزر رہی تھیں اور ہم سب برف سے ڈھکی ہوئی زمین پر اوندھے منہ پڑے تھے۔ چند منٹ کا یہ حادثہ اس قدر ہولناک اور وحشت انگیز تھا کہ ساری زندگی یاد رہے گا۔ طیارہ جتنی دیر میں مڑ کر واپس آتا۔ اتنی دیر میں اٹھتے اور بے تحاشا دوڑنے لگتے۔ سامنے ایک پہاڑی ٹیلہ دکھائی دے رہا تھا اور ہمارا ارادہ وہیں پناہ لینے کا تھا۔ اتنے میں ہمارے ایک ساتھی مینولی پیٹرس نے پکار کر کہا "جنرل کریپی کدھر گیا! وہ ہمارے ساتھ نہیں ہے"، یہ سنتے ہی ہمارا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ ساری محنت خاک میں ملتی نظر آئی۔ میں اور "پیڈی"، جان کی پروا نہ کرتے ہوئے ادھر گئے جہاں ہم تھوڑی دیر پہلے اوندھے منہ پڑے ہوئے تھے کیا دیکھتے ہیں کہ جنرل کریپی ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا ہے۔ اس کی قمیض گرم خون سے تر تھی۔ معلوم ہوا کہ گولی اس کے بائیں بازو کو چھیدتی ہوئی نکل گئی ہے۔ ہم نے بمشکل جنرل کو اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور ٹیلے کی طرف بھاگے۔ ٹیلے تک پہنچتے پہنچتے وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اتنے میں وہی طیارہ پھر ہمارے سروں پر منڈلانے لگا۔ اور پھر جہاز میں لگے ہوئے لاؤڈ سپیکر سے بگڑے ہوئے جرمن نما انگریزی لہجے میں پائلٹ نے کہا:

"جنرل کریپی کو ہمارے حوالے کر دو — تم اب یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتے، میں صرف پانچ منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔ اگر تمہارے پاس وائرلیس ہے تو نمبر تھری فور، سیون، سیون، زیرو پر مجھ سے رابطہ قائم کرو۔ اور بتاؤ کہ جنرل کریپی کہاں ہے۔"

ہم اتنی کچی گولیاں نہ کھیلے ہوئے تھے کہ نہ صرف اپنے پاس وائرلیس ٹرانسمیٹر کی موجودگی ظاہر کرتے بلکہ یہ بھی اقرار کر لیتے کہ جنرل کریپی کا راز ہمیں معلوم ہے۔ پس ہم نے خاموشی ہی میں خیریت سمجھی۔" اب سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ یہاں سے فرار ہونے کے لیے یہ لوگ کیا طریقہ اختیار کریں؟ یہ عین ممکن تھا کہ ان طیاروں سے پیراشوٹ کے ذریعے سینکڑوں نازی سپاہی نیچے اتر آتے اور انہیں چاروں طرف سے گھیر کر یا تو پکڑ لیتے یا ہلاک کر دیتے۔ ہم بار بار اپنی مخصوص فریکوئنسی پر قاہرہ کو تلاش کرنے

کی کوشش کر رہے تھے مگر قاہرہ میں برطانوی ایجنٹ سے سلسلہ نہ ملتا تھا۔ شاید ہمارا ٹرانسمیٹر ہی بے کار ہو گیا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک کو اب موت سامنے کھڑی دکھائی دینے لگی۔ ہمیں کچھ معلوم نہ تھا۔ کہ کدھر جانا ہے اور اس پریشانی کے عالم میں کون ہماری مدد کر سکتا ہے۔ خوش قسمتی سے ہمارے ایک ساتھی کے پاس ایک فالتو ٹرانسمیٹر موجود تھا لیکن یہ ٹرانسمیٹر اتنا طاقتور نہ تھا کہ قاہرہ تک پیغام بھیج سکتا۔ اس نے فوراً اس کے ذریعے کریٹ میں پھیلے ہوئے ممبروں پر برطانوی جاسوسوں کو پکارا ــــ فوراً کوڈ میں جواب موصول ہوا ــــ اور بتایا گیا کہ جرمن فوج کا پروگرام یہ ہے کہ کل دوپہر تک یہ سارا علاقہ گھیر لیا جائے، کیونکہ انہیں یقین ہے کہ جنرل کریپی کو اسی علاقے میں کہیں چھپایا گیا ہے اور ہٹلر تک یہ خبر پہنچ چکی ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ چوبیس گھنٹے کے اندر جنرل کریپی اور اسے اغوا کرنے والوں کو زندہ یا مردہ ہر حالت میں برآمد کر کے برلن بھیج دیا جائے۔

میجر سٹینلے اپنی ڈائری میں لکھتا ہے :۔

"جب یہ پیغام موصول ہوا تو میں نے اپنی گھڑی دیکھی۔ رات کا ایک بج رہا تھا اور ہمارے پاس اس سنسان اور سرد ترین علاقے سے نکل جانے کے لیے صرف دس گھنٹے باقی تھے۔ دس یادگار گھنٹے جن میں زندگی اور موت کی بازی کھیلی جانے والی تھی ــــ ہمارے پاس جزیرے کا جو نقشہ تھا اس میں دیکھنے سے پتا چلا کہ بچاؤ کا راستہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ہم آٹھ ہزار فٹ اونچی ماؤنٹ ایڈا کو عبور کریں تو اس کے پیچھے گھنا جنگل ہے۔ جہاں ہم دشمنوں کی نگاہوں سے مزید چند روز تک پوشیدہ رہ سکتے ہیں۔ لیکن حال یہ تھا کہ نہ ہمارے پاس کھانے کو کچھ تھا اور نہ سردی سے بچنے کے لیے فالتو کپڑے۔ برف باری آہستہ آہستہ جاری تھی۔ جان بڑی پیاری شے ہے اسے بچانے کے لیے انسان کو وہ کام کرنے پڑتے ہیں کہ آرام دہ حالت میں جن کا وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جنرل کریپی کا زخم صاف کر کے اس پر پٹی باندھ دی گئی تھی اور وہ ہوش میں آ چکا تھا۔ تمام راستے اس نے ہم سے وعدے کے مطابق

کوئی باز پرس نہیں کی تھی۔ لیکن اب وہ مسلسل اپنی بہن اور اس کے بچوں کو یاد کر کر کے رو رہا تھا۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ آخر ان پر کیا آفت آئی ہوگی۔ جو آپ اتنے پریشان ہیں۔ وہ کہنے لگا۔

"تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میں ابھی تک کنوارہ ہوں۔ میری بہن ہمیشہ میرے ساتھ رہتی آئی ہے اور جرمن فوج کا اصول یہ ہے کہ جونہی کوئی سپاہی دشمن کی قید میں چلا جاتا ہے اس کے سرکاری مکان کی الاٹمنٹ منسوخ کر کے اس کے رشتہ داروں کو بے دخل کر دیا جاتا ہے۔ اور اس اصول کی اتنی سختی سے پابندی کی جاتی ہے کہ کوئی چھوٹا بڑا افسر حتیٰ کہ جنرل بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔"

اس اندھیری سرد اور طوفانی رات میں ہم چند آدمیوں کا ماؤنٹ ایدا کو عبور کرنا اب بالکل خواب کی طرح یاد آتا ہے۔ خدا کی پناہ۔ کس قدر اذیت ناک لمحات تھے۔ کامل بارہ گھنٹے تک ہم اس پہاڑی کو عبور کرنے میں مصروف رہے۔ جب ہم چوٹی کے قریب پہنچے تو تھکن سے ہمارے جسموں کا ایک ایک بند فریاد کر رہا تھا لیکن دم لینے کی بھی مہلت نہ تھی اس وقت دن کا ایک بج رہا تھا۔ جب ہم ساحل سے قریب اس جنگل میں داخل ہوئے ہلکی ہلکی بوندیں موسلا دھار بارش میں تبدیل ہو گئیں آخر ہمیں ایک چرواہے کی جھونپڑی دکھائی دی۔ جس نے ہمیں پناہ دی اور کھانے کے لیے روٹی اور کئی دن کا باسی گوشت فراہم کیا یہاں ہم نے ایک ہفتہ قیام کیا۔ جنرل کریپ کی حالت اس تمام عرصے میں بے حد مخدوش ہو گئی تھی۔ مگر انتاز بردست صبر اور استقلال اس شخص کی طبیعت میں تھا کہ اتنی تکلیفیں سہنے کے باوجود اس نے اُف نہ کی اپنے ٹرانسمیٹر کے ذریعے قاہرہ کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ ہمیں معلوم تھا کہ نازی جاسوسوں کی ایک پارٹی جنرل کریپ کی تلاش میں شب و روز سرگرداں ہے اور خدشہ تھا کہ شاید وہ ہمارا سراغ لگائے۔

"ایک دن ایسا ہوا کہ ہمارا ایک ساتھی دو مقامی باشندوں کے ساتھ واپس آیا۔ اور کہنے لگا کہ نازی پولیس ان دونوں کی تلاش میں ہے چونکہ انہوں نے ایک بڑے فوجی کو قتل کر دیا ہے۔ وہ فوجی افسر ان کے گھر میں شراب پی کر گھس آیا تھا اور اس شخص

ی لڑکی پر مجرمانہ حملہ کیا۔ انہوں نے اسے وہیں ہلاک کر دیا اور فرار ہو گئے۔ اب یہ خود
ی اس جزیرے سے نکل جانے کی فکر میں ہیں اور یہاں کے راستے وغیرہ سے بخوبی
اقف ہیں۔ پہلے تو ہمیں ان پر شک ہوا کہ یہ بھی دشمن کے آدمی نہ ہوں۔ مگر چند منٹ کی
تگو کے بعد ہی اندازہ ہو گیا کہ معاملہ صحیح ہے۔

آخر ۱۴ مئی ۱۹۴۴ء کی رات کو فیصلہ ہوا کہ خواہ جان جائے ہمارا اب یہاں ٹھہرنا فضول
ہے چونکہ فاقے کرتے کرتے ہم لوگ بے حد کمزور ہو چکے تھے اور اس طرح ایڑیاں
رگڑ رگڑ کر مرنا ہمیں منظور نہ تھا۔ خدا کی قدرت دیکھیے کہ اسی روز ہمارے ٹرانسمیٹر پر ایک
فیہ پیغام موصول ہوا جس نے ہمارے دل خوشی اور مسرت سے بھر دیے۔

پیغام یہ تھا کہ ایک موٹر لانچ جس پر جرمنی کے قومی پرچم کی تصویر ہو گی رات کے
ڑھائی بجے روڈ مکینو کے ساحل پر آئے گی۔ اس پر اگر ہم سوار ہو سکیں تو قاہرہ پہنچنے
یں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ یہ موٹر لانچ جرمنوں کی نہیں بلکہ برطانیہ کی ہو گی۔

یہ گوربار ہائی کا پیغام تھا۔ ہم دونوں مقامی باشندوں کی رہنمائی میں پھٹی پرانی جرمن
وردیاں پہنے ساحل کی طرف روانہ ہوئے۔ ہم نے اپنا ٹرانسمیٹر بھی جنگل میں دفن کر دیا
تھا کہ اگر راستے میں تلاشی ہوئی تو مارے جائیں گے۔ یہ کہنا بیکار ہے کہ راستے میں کئی
جرمن دستوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ مگر کسی نے ہم پر شک نہیں کیا۔ چونکہ ہم علیحدہ علیحدہ جا رہے
تھے۔ میجر پیٹرک نے ریوالور اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ اور یہ ہاتھ کوٹ کی جیب
میں تھا اور بائیں ہاتھ سے جنرل کریپی کو اس طرح تھام رکھا تھا جیسے اسے سہارا دے
رہا ہے۔ گزشتہ تمام عرصے میں ہم نے جنرل کریپی کو ڈاڑھی مونچھ صاف کرنے کی اجازت
نہ دی تھی اس کے بالوں سے اس کا سارا چہرہ چھپ گیا تھا۔ اور اس عالم میں دوسرے
تو در کنار وہ خود بھی آئینہ دیکھتا تو اپنے آپ کو نہ پہچان سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں
مزاحمت یا مقابلے کی حس ہی باقی نہیں رہی۔ ابھی ساحل سے دو میل دور تھے کہ ایک
معمولی سا حادثہ پیش آیا۔

تین نازی سپاہیوں کی ایک ٹولی گشت کرتی ہوئی سامنے سے آ رہی تھی سب سے
پہلے انہوں نے ہمارے ایک ساتھی سینولی کو روکا اور پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ اسے

جرمن زبان تو نہیں آتی تھی البتہ یونانی بول سکتا تھا۔ اس نے یونانی زبان میں ادھر ادھر کی باتیں اس تیزی سے بیان کرنی شروع کیں کہ ایک نازی سپاہی نے اکتا کر اسے آگے بڑھ جانے کا اشارہ کیا اس کے بعد میری باری آئی ۔۔۔ اس سے پیشتر کہ وہ کچھ پوچھے میں نے جرمن زبان میں کہا۔

"میں اپنے ایک دوست کی تلاش میں آیا ہوں۔ وہ صبح سے نہیں آیا۔"

یہ سن کر تینوں سپاہی قہقہہ مار کر ہنسے اور ان میں سے ایک کہنے لگا۔

"ممکن ہے وہ احمق بھی جنرل کریپی کو ڈھونڈنے نکلا ہو۔ سنا ہے کہ جنرل کریپی اس جزیرے سے پُراسرار طور پر غائب ہو گیا ہے۔"

میں وہیں کھڑا رہا۔ اتنے میں میجر پیٹرک اپنے قیدی کو لئے قریب آگیا۔ یہ موقع اتنا نازک اور خطرناک تھا کہ میرا دل دھڑکنے لگا۔ نازی سپاہیوں نے گھور کر جنرل کریپی کو دیکھا اور پھر میجر پیٹرک کو خدا بہتر جانتا ہے کہ جنرل نے اس موقع پر کوئی خاص اشارہ کیا یا نہیں مگر فوراً ہی نازیوں نے پیٹرک سے کہا "اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو ۔۔۔ خبردار ذرا بھی جنبش کی تو کھوپڑی کی خیر نہیں۔" مگر آفرین ہے پیٹرک کے عزم و استقلال پر بجلی کی مانند اس نے جنرل کریپی کو پکڑا اور اس کی آڑ میں کھڑا ہو گیا اور پکار کر کہا۔

"جنرل! ان سپاہیوں کو ہتھیار رکھ دینے کا حکم دو۔ ورنہ ...."

اس نے پستول کی نالی جنرل کی کھوپڑی پر رکھ دی۔ اندھیرے میں میں نہیں دیکھ سکا کہ جنرل کے چہرے پر کیا تاثر تھا۔ البتہ اتنا سنا کہ اس نے ٹھہرے ہوئے اور کمزور جرمن لہجے میں سپاہیوں سے کہا:

"اپنے ہتھیار زمین پر ڈال دو۔ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

اتنی دیر میں ہمارے گروہ کے سب آدمی جمع ہو چکے تھے۔ پھرتی سے ہم نے نازی سپاہیوں کی مشکیں کسیں، ان کے منہ میں کپڑوں کی دھجیاں ٹھونسیں اور انہیں وہیں چھوڑ کر ساحل کی طرف دوڑے۔ دوڑتے رہے یہاں تک کہ ساحل سمندر کی نرم اور سرد ہوا ہمارے جسموں کو چھونے لگی۔ ابھی ہم ساحل سے کوئی دو فرلانگ دور تھے کہ پیچھے

سے فائروں کی مسلسل آوازیں آئیں اور گولیاں سنسناتی ہوئیں ہمارے سروں پر سے گزرنے لگیں۔ پھر بہت سے جوتوں کے پتھریلی زمین پر دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ساحل اب ہمارے سامنے تھا۔ اور فوراً ہی چھک چھک کرتی ایک لمبی سی لانچ ساحل پر آکر رکی۔ میں نے بھاگتے ہوئے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے ٹھیک ایک بج کر تیس منٹ ہوئے تھے۔

لانچ کی طرف سے مخصوص سگنل دیا گیا۔ اور پھر کسی نے جرمن آواز میں "پیڈی" کو پکارا۔ جواب دینے کا ہوش کسے تھا۔ ہم نے جنرل کریپی کو پکڑا اور لانچ میں پھینک دیا۔ نازی سپاہیوں کا ایک زبردست گروہ اب بالکل نزدیک آگیا تھا۔ انہوں نے سرچ لائٹ کے ذریعے ہمیں تلاش کر لیا تھا۔ گولیاں بارش کی طرح ہمارے سروں پر برس رہی تھیں۔ لیکن جب لانچ کی طرف سے گولیوں کا جواب گولیوں سے دیا گیا تو وہ وہیں تھم گئیں۔ زندگی کا وہ مختصر ترین لمحہ کسی وقت بھی فراموش نہیں ہوتا جب ہم جنرل کریپی کو ساتھ لے کر کھلے سمندر میں نکل آئے تھے۔ چند روز بعد اسے ہم نے قاہرہ کے ہوائی اڈے پر الوداع کہی۔ اسے زبردست فوجی پہرے کے ساتھ انگلستان بھیجا جا رہا تھا۔

اس زبردست کارنامے کے باعث جن دو نوجوان آفیسروں نے اپنی جان پر کھیل کر کام سرانجام دیا تھا میجر سٹینلے اور پیٹرک کو برطانیہ کی طرف سے "سروس آرڈر" دیا گیا۔ یہ اعزاز وکٹوریہ کراس سے دوسرے درجے پر ہے۔ جنرل کریپی آج کل سیلزمین ہے۔ گزشتہ سال میجر پیٹرک اور میجر سٹینلے سیاحت پر جب جرمنی گئے تو ایک کیفے میں ان کی ملاقات ایک طویل القامت بوڑھے شخص سے ہوئی۔ یہ جنرل کریپی تھا۔ بوڑھے نے دونوں کو اپنے ساتھ چمٹا لیا اور بولا:

"میرے دوستو! مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں بلکہ میں تمہارا احسان مند ہوں۔ تم نے میری جان بچائی ورنہ میرا حشر بھی وہی ہوتا جو میرے ساتھی جنرلوں کا ہوا اور جنہیں بعد از اں کریٹ کی یونانی فوجی عدالت نے موت کی سزا دی تھی۔"

رومیل

اتنے برس بعد اب وہ زمانہ یاد کرتا ہوں، تو دل و دماغ پر تعجب و حیرت کا عجب عالم طاری ہوتا ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کو شروع ہوئے اڑھائی سال گذر چکے تھے اور جرمن فوجیں ہر محاذ پر کامیابی کے جھنڈے گاڑتی اور اتحادیوں کو پسپا کرتی ہوئی برق رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ جرمن فوجوں کا یہ سیلِ رواں جس کے سامنے اتحادیوں کا باندھا ہوا ہر بند خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتا تھا، کسی طرح رُکنے میں نہ آتا تھا۔ ناروے، ڈنمارک، پولینڈ اور فرانس تو ہٹلر کی ایک ہی ضرب میں زمین چومتے نظر آئے اور اب برطانیہ کی باری تھی۔ ہٹلر برطانیہ کو ہر قیمت پہ نیچا دکھانے کا تہیہ کر چکا تھا، کیونکہ وہ انگریزوں ہی کو صحیح معنوں میں اپنا حریف سمجھتا تھا۔

افریقہ کے صحراؤں میں فیلڈ مارشل رومیل کی عظیم شخصیت کا سکہ رواں تھا۔ اس معروف جرمن جنرل کے کارنامے الف لیلیٰ کے قصوں کی طرح اتحادیوں اور محوریوں میں مشہور تھے اور اس سے ایسی ایسی باتیں منسوب کی جاتی تھیں کہ جنرل رومیل جنگِ عظیم کی افسانوی اور پُراسرار شخصیت بن کر سپاہیوں کے دلوں میں بیٹھ گیا۔ جس انداز میں وہ جنگ لڑتا تھا اور جس مہارت سے جنگ کے نقشے بناتا اور ان پر اپنے کمانڈروں سے عمل کراتا تھا وہ بھی اس کی شخصیت کی طرح پُراسرار اور عجیب تھے۔ اس کے بارے میں ہمیں معلوم ہوا تھا کہ وہ گوشت پوست کا نہیں، فولاد کا بنا ہوا آدمی ہے۔ اتحادی کمانڈروں نے اپنے سپاہیوں کے دلوں پر سے رومیل کی دہشت دور کرنے کی بڑی تدبیریں کیں، لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے انگریز سپاہی خصوصاً اس سے خوفزدہ تھے اور اگر کوئی مذاق میں ان سے کہہ دیتا کہ رومیل

آرہا ہے تو وہ چونک کر ادھر ادھر یوں دیکھنے لگتے جیسے رومیل کوئی بدروح ہے اور ابھی ان پر سوار ہو جائے گی۔ ہم میں سے ہر شخص رومیل کو دیکھنے کا خواہش مند تھا لیکن افسوس کہ یہ آرزو کبھی پوری نہ ہوئی۔

تھرڈ انڈین موٹر بریگیڈ ان دنوں قاہرہ کے شمال مغرب میں چالیس میل دُور الخطابہ کے مقام پر پڑا تھا الخطابہ صحرائے اعظم کے کنارے واقع ہے۔ اپریل ۱۹۴۲ء کے آخری دنوں میں بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں برطانوی کمانڈروں اور فوجی افسروں کے کئی طویل جلسے ہوئے جن سے پتا چلا کہ حملے کا کوئی نیا منصوبہ زیرِ غور ہے لیکن منصوبے کی تفصیلات کا قطعاً علم نہ ہو سکا اور آخر ایک رات جب کہ بریگیڈ کے جوان اپنی اپنی جگہ لمبی تانے سو رہے تھے، فوری طور پر حرکت میں آنے کا حکم دیا گیا۔ ہمارا رخ مغرب کی طرف تھا اور ہم تیز رفتاری سے صحرائے اعظم میں سفر کر رہے تھے۔ دو دن کے مسلسل سفر کے بعد ہم تقریباً اڑھائی سو میل کا فاصلہ طے کر سکے۔ عارضی پڑاؤ متروح کے مقام پر کیا گیا اور ایسا ہوا کہ کبھی مغرب اور کبھی جنوب کی طرف توپیں چلنے کی آواز سنائی دیتی۔ کہیں گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی۔

دو دن بعد بریگیڈ پھر حرکت میں آیا۔ سولم پہاڑی کے دامن میں پٹرول پمپ نصب تھے۔ حکم ملا کہ ٹرکوں کے اندر جس قدر پٹرول رکھا جا سکتا ہے، رکھ لیا جائے۔ پہاڑی کے اوپر پہنچ کر تیس میل چلنے کے بعد اس بڑی سڑک کو چھوڑ دیا گیا جو سکندریہ کے جنوب سے ہو کر ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ طبروق تک چلی گئی تھی۔ اب ہم جنوب مغرب کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔ یہ باردیا کا علاقہ تھا۔ انگریز فوجی افسر وقت کا بیشتر حصہ نقشے بنانے اور ان پر غور کرنے میں گزارتے اور آپس میں زور شور سے کوڈ الفاظ میں بحث کرتے۔ سڑک سے ہٹ کر ہماری گاڑیاں جونہی ریگستان میں داخل ہوئیں "اوپن فارمیشن" میں حرکت کرنے کا حکم جاری ہوا۔ ہر گاڑی دوسری گاڑی سے دو سو گز کے فاصلے پر چل رہی تھی اور یہ فاصلہ رُکنے کے وقت بھی برابر رکھنا ضروری تھا، کیونکہ ہوائی حملے کا خدشہ تھا۔ رات کو دیر تک چاند کی روشنی میں چلتے رہے۔ رفتار اس قدر سست تھی کہ جب رات گیارہ بجے کے بعد قیام کی اجازت ملی، تو معلوم ہوا کہ ہم نے سڑک سے جنوب مغرب کی طرف صرف پندرہ میل کا فاصلہ طے کیا ہے۔ اگرچہ ہم بے حد تھکے ماندے تھے، لیکن اس نکمہ

سے کہ منہ اندھیرے ہی ایڈوانس کرنا ہے، نیند نہ آئی اور کچھ غنودگی کا سا عالم طاری رہا۔ رات بھر جرمن بمبار طیارے انتہائی بلندی پر پرواز کرتے رہے۔ صبح تڑکے ہی بریگیڈ نے ایڈوانس شروع کر دیا۔ صحرا میں ہر طرف سناٹا طاری تھا، لیکن ہر لمحہ کسی نہ کسی جرمن بمبار کی آمد کا خطرہ منڈلا رہا تھا۔

سورج نکل آیا اور صحرا کی تمازت میں آہستہ آہستہ اضافہ ہونے لگا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک انگریز لیفٹیننٹ جیپ میں بیٹھا تھا، وہ نیا نیا انگلستان سے آیا تھا اور کبھی کبھار مجھ سے دعا سلام کر لیتا۔ عام انگریز فوجیوں کے برعکس، جنہیں ہم "ٹامی" کہتے تھے، یہ نوجوان لیفٹیننٹ خوش اخلاق اور ہنس مکھ طبیعت کا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ جیپ سے اُترا اور میرے پاس ٹرک میں آ گیا۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد رازدارانہ انداز میں کہنے لگا۔

"تمہیں معلوم ہے اس وقت ہم دشمن کے پہلو بہ پہلو حرکت کر رہے ہیں؟ ہمارا اور جرمنوں کا درمیانی فاصلہ بیس تیس میل سے زیادہ نہیں۔"

"ممکن ہے آپ صحیح کہتے ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن گھبرانے کی کیا ضرورت ہے، دشمن جب سامنے آئے گا، تو اس صحرائی علاقے میں اس کی نقل و حرکت زیادہ دیر تک چھپی نہ رہ سکے گی۔"

"یہ تو ٹھیک بات ہے۔" لیفٹیننٹ نے کہا۔ "مگر مصیبت یہ ہے کہ رات کے اندھیرے میں دوست دشمن کی پہچان مشکل ہے اور جرمن رات کی تاریکی سے فائدہ ضرور اٹھائیں گے۔"

اب تو میں بھی فکرمند ہوا۔ اس سے پہلے ایسے حادثات پیش آ چکے تھے کہ ہم نے آپس ہی میں ایک دوسرے پر فائر کھول دیا تھا اور جب بہت سی جانیں ضائع ہو چکیں تب پتا چلا کہ معاملہ کیا ہے۔

دن بھر رُکے بغیر چلتے رہے، لیکن یہ تمام سفر سورج غروب ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے تک تیس میل سے زیادہ نہ تھا۔ قیام ہوتے ہی کھانا پکنے لگا اور مورچوں کی تیاری کا

حکم ملا۔ زمین اس قدر سخت اور سنگلاخ تھی کہ بصد مشکل مجھ سے اپنے لئے دو فٹ گہری نالی کھد سکی۔ مسلسل سفر کے بعد تھکے ہارے سپاہیوں کو چند لمحے بھی آرام کرنا نصیب نہ ہوا اور وہ رات گئے تک مورچے تیار کرتے رہے۔ آپس میں بول چال اور گپ بازی بالکل نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صحرا کے سینے پر بے شمار مشینوں کا ایک کارخانہ کھل گیا ہے جو زمین کھودنے میں لگی ہوئی ہیں۔

آدھی رات کے بعد نیند کو روکنا میری قوتِ برداشت سے باہر ہو گیا۔ ابھی مجھے اونگھتے ہوئے بمشکل پانچ منٹ ہوئے تھے کہ کسی نے میرا شانہ ہلایا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سپاہی میرے سر پر کھڑا ہے۔

"کمانڈر آپ کو بلاتا ہے۔" اس نے مجھے پیغام دیا اور چلا گیا۔

"یا اللہ خیر۔" میں نے دل میں کہا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور اپنی دانست میں تازہ دم ہو کر کمانڈر کے پاس پہنچا۔ وہ گاڑی کے اندر بیٹھا کچھ کاغذات اور نقشہ کھولے مطالعہ کر رہا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ پا کر اس نے سر اٹھایا تو میں نے دیکھا اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہیں اور ان کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی راتیں جاگتا رہا ہے۔ اس نے مجھ سے کچھ کاغذات طلب کئے جو چند منٹ کے اندر اندر میں نے اس کے پاس پہنچا دیئے اور اگلے حکم کا منتظر رہا۔ وہ دیر تک ان کاغذات کو بغور دیکھتا رہا۔ پھر ان پر چند خفیہ نشانات لگائے اور مجھے دیتے ہوئے بولا:

"انہیں حفاظت سے رکھو اور صوبیدار کو بلاؤ۔"

صوبیدار صاحب حاضر ہوئے تو کمانڈر نے کچھ سوچنے کے بعد ان سے کہا:

"صوبیدار! مجھے چند دلیر اور انتہائی جرأت مند جوان چاہئیں۔ صرف ایک گھنٹے کا کام ہے۔ ان سب کو خاموشی سے جمع کرو۔ اور بارودی سرنگیں، لوبی ٹرائپ، سیفٹی فیوز اور کھدائی کا پورا سامان بھی ان کے ساتھ ہونا چاہیئے، احتیاط سے دیکھ لو کہ سامان مکمل اور اچھا ہونا ضروری ہے۔ فوراً مجھے رپورٹ کرو۔"

صوبیدار صاحب "بہت اچھا" کہہ کر چلے گئے اور پندرہ منٹ کے بعد سکواڈرن کے اٹھارہ تنومند، بہادر اور چست جوان ایک نامعلوم مہم پر روانہ ہونے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ ان کے چہروں پر تازگی اور رونق نہ تھی، شاید اس لئے کہ بے چارے مسلسل سفر اور مشقت کے باعث بے حد تھکے ماندے تھے، وہ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے اور ہر جوان جاننا چاہتا تھا کہ آخر کونسا کام ہے جس پر کمانڈر صاحب انہیں خاموشی سے بھیجنا چاہتے ہیں۔ بارودی سرنگوں، بوبی ٹراپ، سیفٹی فیوز اور کھدائی کے اوزاروں اور آلات کا ڈھیر ایک طرف لگا تھا۔ اس سامان کی موجودگی سے مہم کی اہمیت کا کچھ نہ کچھ اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ یکایک کمانڈر نمودار ہوا اور سب جوان اٹن شن ہو گئے۔ کمانڈر نے ہر ایک کا بخوبی جائزہ لیا۔ اس کے لبوں پر پُراسرار تبسم کھیل رہا تھا۔ مکمل تسلی کر لینے کے بعد اس نے سکواڈرن کا ایک لیڈر منتخب کیا اور اسے الگ لے جا کر چُپکے چُپکے کچھ سمجھاتا رہا، پھر اس کے اشارے پر تمام سامان ٹرک پر لادا گیا۔ فوجی جوان اور کمانڈر بھی سوار ہو گئے۔

"تم لوگ سونے کی کوشش نہ کرنا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دشمن قریب ہے۔" کمانڈر نے مجھ سے کہا اور ٹرک سٹارٹ ہو گیا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا، لیکن کمانڈر کے جاتے ہی اپنی گاڑی میں گیا اور لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں ــــ تھوڑی ہی دیر بعد ہیڈ کلرک صاحب نے مجھے جگا کر کہا:

"دشمن سر پہ آپہنچا اور تم لمبی تانے سو رہے ہو۔ ٹینکوں کی آواز نہیں سُن رہے؟"

مجھ پر نیند کا غلبہ تھا، اس لئے ابتداء میں کوئی آواز سنائی نہ دی اور ہیڈ کلرک سے ناراض ہو کر کہا:

"جہنم میں جائیں تمہارے ٹینک۔ مجھے تو کچھ سُنائی نہیں دیتا۔ تمہارے کان بج رہے ہیں۔"

ہیڈ کلرک صاحب ہنس پڑے: "ابھی آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ بعد میں نہ کہنا کہ خبردار نہیں کیا تھا۔"

مجھے شک ہوا کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ ایسی آوازیں یقیناً آرہی تھیں جن پر ٹینکوں کے چلنے کا شبہہ کیا جاسکتا تھا۔ میں گاڑی سے باہر نکلا اور ان آوازوں پر کان لگا دیے۔ رات حد درجہ تاریک تھی اور آسمان پر چمکنے والے ستارے سیاہ بادلوں کی اوٹ میں گم ہو گئے تھے۔ مجھے خیال آیا، ممکن ہے اپنے بریگیڈ کے فلاں رسالے ہی کے "کیریر" نہ ہوں جو خاصے پرانے تھے اور ہمیشہ پیچھے رہ جاتے تھے۔ یہی بات میں نے ہیڈ کلرک سے کہی اور بتایا کہ کمانڈر صاحب کسی خاص مہم پر گئے ہیں۔ ابھی واپس آئیں گے اور پھر موُو کا حکم ملیگا۔

"لڑائی کے میدان میں ہر وقت حکم کا منتظر نہیں رہنا چاہیئے۔ کچھ اپنی عقل سے بھی کام لو" ہیڈ کلرک نے جھنا کر کہا، کیونکہ گڑگڑ کی آواز لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جارہی تھی۔ میں نے ادھر اُدھر گھوم پھر کر جائزہ لیا۔ اکثر سپاہی جاگ رہے تھے اور چہ میگوئیاں جاری تھیں۔ کوئی کچھ کہتا، کوئی کچھ۔ میں لیفٹننٹ کو دیکھنے گیا۔ تو وہ اپنے ٹرک کی ڈرائیونگ سیٹ پر نہایت تشویش و پیچ کے عالم میں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اور پریشان ہوا۔

"یہ کیسی آواز ہے؟" اس نے پوچھا اور میں نے محسوس کیا کہ آواز میں کپکپاہٹ نمایاں ہے۔

"ہیڈ کلرک کہتا ہے کہ جرمن ٹینک آرہے ہیں"

"ہاں ٹینک تو دشمن ہی کے ہیں، لیکن تھوڑی دیر بعد تم دیکھو گے کہ یہ آوازیں رک جائینگی"

"وہ کیسے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"کل صبح بتاؤں گا" لیفٹننٹ نے جواب دیا "تم لوگ دُور مت جانا، اپنی گاڑی کے نزدیک رہو"

یہ صورتِ حال نہایت پریشان کن اور الجھن میں ڈالنے والی تھی۔ ہر طرف اضطراب اور کسی قدر خوف کا دور دورہ تھا۔ میں گھومتا رہا۔ بعض سپاہی ان حالات سے قطعاً بے پروا لنگر کی گاڑی کے قریب جمع ہو رہے تھے۔ شاید چائے بن رہی تھی۔ جب میں اپنی گاڑی کی طرف لوٹا، تو پو پھٹ رہی تھی۔ فجر کی نماز کے لئے ہیڈ کلرک صاحب نے جن کا نام ابوالحسن تھا، اذان دی اور مسلمان سپاہی نماز کے لئے صفیں باندھنے لگے۔ نماز پڑھ کر جب ہم فارغ ہوئے، تو ایک طرف سے ہندو اور سکھ سپاہیوں نے "بھاگو بھاگو" کا غل مچایا اور پھر وہ جلدی جلدی اپنی گاڑیوں کی طرف لپکے۔

"دشمن سر پر آگیا ہے" کسی نے چلا کر کہا۔

"ڈرائیور نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ چائے پینے گیا تھا" دوسرا چیخا۔

عجب افراتفری کا عالم تھا۔ جرمن ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ اب بہت قریب سے سنائی دے رہی تھی اور دیکھتے دیکھتے فائرنگ شروع ہو گئی۔ صحرا میں جنگی کیفیت کا ایک اور دن شروع ہو چکا تھا۔ چھوٹے اور خودکار ہتھیاروں کی فائرنگ لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی اور بریگیڈ کے جوان بدحواسی کے عالم میں اپنی اپنی گاڑیوں میں لپک لپک کر سوار ہو رہے تھے۔ پھر میں نے دیکھا کہ بہت سی گاڑیاں ریت اڑاتی میرے سامنے سے گزر گئیں۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا یہ کیا ہو رہا ہے۔ "موو" کا آرڈر کب ملا؟ کمانڈر کی پارٹی ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ اسی سوچ بچار میں مصروف تھا کہ مشین گن سے نکلی ہوئی گولیاں شاں شاں کرتی ہوئی میرے سر پر سے گزرنے لگیں میں نے ابوالحسن ہیڈ کلرک کو گاڑی کی طرف رینگتے دیکھا اور خود بھی جھک کر ہاتھ پاؤں کے بل چلتا ہوا اپنی گاڑی کے پاس جا پہنچا۔

"یہ لوگ کیوں بھاگ رہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"بندۂ خدا میرا منہ کیا دیکھتے ہو، گاڑی سٹارٹ کرو اور بھاگ نکلو، ورنہ "یار خاں" سر پر آگیا ہے۔" (ابوالحسن، جرمنوں کو بڑے پیار سے "یار خاں" کہہ کر پکارتے تھے۔)

یار خاں واقعی سر پر آن پہنچا تھا اور اس کے ساتھ ٹینکوں کی بڑی تعداد تھی۔ ہمارے بریگیڈ کے پاس پناہ لینے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی برق رفتاری سے پیش قدمی کی اطلاع ہمارے پاس بروقت نہیں پہنچ سکی تھی۔ بہرصورت چند ہی منٹ کے اندر اندر جرمنوں کی بے پناہ فائرنگ سے ہمارے کئی جوان خون میں نہا کر ریت پر تڑپ رہے تھے۔ ابوالحسن صاحب نے اس قدر دہائی دی کہ میرے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ میں اُچک کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا اور گاڑی سٹارٹ کر کے جدھر اس کا رخ تھا، ادھر بھاگ نکلا۔ ہماری گاڑی کا ڈرائیور اور باقی دونوں ساتھی چائے اور رفع حاجت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ ہم نے ان کا انتظار بھی نہ کیا۔ بریگیڈ کی اکثر گاڑیوں

کا رُخ جنوب مغرب کی طرف تھا اور میں ان کی مخالف سمت یعنی جنوب مشرق کی طرف گاڑی لے جا رہا تھا۔ ابوالحسن کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ بدحواسی کو چھپانے کے لئے سکون کا مظاہرہ کرنے کی کوشش میں وہ مضحکہ خیز کارٹون بن کر رہ گئے تھے۔ ابوالحسن تھے تو ہمارے بریگیڈ میں ہیڈ کلرک، لیکن ان میں وہ خوبیاں عنقا تھیں جو کسی اچھے اور مستعد سپاہی میں ہونی چاہیئں۔ نہایت دلچسپ اور باتونی آدمی تھے اور اسی طرح حد درجے ڈرپوک بھی —— لیکن ظاہر یہ کرتے کہ ان جیسا بہادر اور بے خوف آدمی پورے بریگیڈ میں اور کوئی نہیں ہے۔ کمانڈروں اور اعلیٰ فوجی افسروں کی "حماقتوں" پر تبصرہ کرنا ان کا دل پسند مشغلہ تھا اور اکثر اپنے افسروں کی "غلطیوں" پر سر پیٹا کرتے اور کہتے "میں اگر ان کی جگہ ہوتا، تو آناً فاناً جنگ کا پانسہ پلٹ کر رکھ دیتا، وغیرہ وغیرہ"۔ انہی حرکتوں کے باعث وہ فوج میں نہایت دلچسپ شخصیت سمجھے جاتے تھے اور ہر شخص دل لگی کے لیے ان سے "مشورہ" لینا ضروری سمجھتا تھا۔

اب اس وقت بھی وہ میری ہمّت بندھانے جاتے تھے، مگر منہ ہی منہ میں آیۃ الکرسی کی تلاوت بھی جاری تھی اور مجھے بار بار گاڑی تیز کرنے کی ہدایت کرتے، کیونکہ بقول ان کے "یار خاں" بہت قریب آگیا تھا۔ میں گاڑی جتنی تیز چلانی چاہتا، اتنی ہی رکاوٹ محسوس ہوتی۔ کچھ پتا نہ چلتا کہ معاملہ کیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی کے عقبی حصّے سے دھواں اٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ اور پھر ربڑ جلنے کی سی بُو ناک میں آئی۔ ابوالحسن صاحب نہ جانے کون کون سی سُورتیں اور آیتیں پڑھنے میں مصروف تھے کہ میں نے جھٹکے سے گاڑی روک دی، وہ منہ کے بل گرتے گرتے بچے۔

"کیا ہوا؟" انہوں نے گھبرا کر کہا۔

"آگ لگ گئی ہے گاڑی میں" میں نے جواب دیا۔ "کیا آپ کو ربڑ جلنے کی بُو محسوس نہیں ہو رہی؟"

انہوں نے حد درجے مضطرب ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا، نتھنے سکیڑے اور کہنے لگے۔ "بے شک بُو تو آ رہی ہے، لیکن اب ہوگا کیا؟ میری رائے میں گاڑی یہیں چھوڑ دو اور

پیدل ہی بھاگ چلو، ورنہ یار خاں کے ہتھے چڑھنے میں کوئی کسر نہ رہے گی۔"

میں نے نیچے اتر کر گاڑی کا معائنہ کیا، مگر دھوئیں اور بُو کا سبب معلوم نہ ہو سکا۔ فائرنگ کی آوازیں اب بھی ہمارا تعاقب کر رہی تھیں۔ میں نے ابوالحسن کے منع کرنے کے باوجود گاڑی کی چھت پر کھڑے ہو کر دیکھا۔ مغرب کی جانب جرمن فوج کی بہت بڑی تعداد ایڈوانس کر رہی تھی اور گھمسان کا رن پڑ رہا تھا۔ چھوٹے خود کار ہتھیاروں کی فائرنگ کے ساتھ ساتھ اب ٹینک بھی آگ اگل رہے تھے۔ مشرق کی طرف بلند ہوتے ہوئے سورج کی روشنی میں جرمن فوج کی گاڑیوں کے شیشے چمک چمک کر اپنی پوزیشن اور محلِ وقوع کا اعلان کر رہے تھے۔ دوسری جانب، یعنی ہم سے کچھ فاصلے پر جنوب کی سمت ایک اور لشکرِ جرار تیزی سے بڑھ رہا تھا۔

"یا اللہ خیر۔" ابوالحسن کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے۔"آج تو یار خاں نے کمال کر دیا۔ ہماری فوج ہر طرف سے ان کے گھیرے میں ہے۔"

"جنوب مغرب کی طرف راستہ کھلا ہے۔" میں نے انہیں دلاسا دیا۔"اور ہمارے ساتھی بھی اُدھر ہی گئے ہیں۔ بہتر ہے کہ ہم بھی ان کے ساتھ جا ملیں، ورنہ جرمن ہمیں پکڑ لیں گے یا ہم صحرا کی وسعتوں میں گم ہو جائیں گے۔"

"بے وقوف ہو تم۔" ابوالحسن نے جھلا کر کہا۔"بس آگے بڑھتے جاؤ، گاڑی فل ہینڈ پر چھوڑ دو، جان بچنے کی یہی صورت ہے۔"

مجبوراً میں نے گاڑی سٹارٹ کی، مگر فوراً دھوئیں اور بُو کا بھید معلوم ہو گیا۔ گاڑی چلاتے وقت میں نے اپنی حماقت سے ہینڈ بریک کھولی ہی نہیں تھی۔ جونہی ہینڈ بریک کھلی، گاڑی فراٹے بھرنے لگی اور میں نے اس کا رخ جنوب کی طرف کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ جنوب کی طرف بڑھنے والا لشکر ہمارا ہے، لیکن ابوالحسن صاحب مانتے نہ تھے اور چلا رہے تھے کہ میں گاڑی اُدھر نہ لے جاؤں۔ ابھی ہم اس لشکر سے دو فرلانگ کے فاصلے پر تھے کہ ایک بکتر بند گاڑی جھپٹ کر ہماری طرف لپکی اور اس کی مشین گن پر کھڑا ہوا ایک سارجنٹ گولیاں برسانے کی تیاری کرتا دکھائی دیا۔

"مرے بے موت"۔ ابوالحسن صاحب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور گاڑی کے اندر لیٹ گئے۔ سارجنٹ نے انگریزی زبان میں چلّا کر کہا۔

"تم کون ہو؟ فوراً بتاؤ ورنہ میں فائر کرتا ہوں۔"

"ہم ہندوستانی ہیں"۔ میں نے جواب دیا اور سارجنٹ نے یہ سنتے ہی مشین گن سے ہاتھ ہٹا لئے اور اشارہ کیا کہ میں اپنی گاڑی ان کی گاڑیوں کے پیچھے پیچھے لاؤں۔ میں نے تعمیل کی۔ لیکن ایک لمحے کے لئے پریشانی نے آن گھیرا کہ یہ کہیں جرمن نہ ہوں، کیونکہ جونہی میں گاڑی قطار کے پچھلے حصّے میں لے گیا، ایک کارپول نے غضب ناک لہجے میں حکم دیا کہ میں پیچھے چلنے کے بجائے اس کی گاڑی کے آگے آگے چلوں اور رفتار تیز رکھوں۔ کارپول کا غضب ناک لہجہ خونی نگاہیں اور چہرے کے کرخت خدوخال اسے جرمن ظاہر کرتے تھے اور میں چپ چاپ اس کے اشارے پر چل رہا تھا۔ میں نے گاڑی چلاتے ہوئے کن انکھیوں سے ہیڈ کلرک کی طرف دیکھا جواب بھی گاڑی کے اندر پیٹ کے بل لیٹے ہوئے خدا کو یاد کر رہا تھا۔ فرار ہونے کا کوئی راستہ نہ تھا نہ موقع اور فرض کیجئے موقع مل جاتا تب بھی فرار ہونے والوں کو پکڑ لانا جرمن بخوبی جانتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہی سارجنٹ دوبارہ اپنی گاڑی لے کر میرے قریب آیا اور کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ آسمان پہ بمبار طیاروں کی بھیانک گونج سنائی دی اور پھر جیسے ہمیں آگ اور خون کے سمندر میں دھکیل دیا گیا۔ بموں کے لرزہ خیز دھماکے، طیاروں کی گرجدار اور بار بار غوطہ لگا کر مشین گنوں سے فائرنگ کی آوازیں، گاڑیوں کے الٹنے، جلنے اور زخمیوں کی چیخ پکار نے قیامت برپا کر دی۔ میں نے گاڑی روک دی اور اوپر دیکھا جرمن طیارے دوسرا حملہ کرنے کے لئے غوطہ لگا رہے تھے اور پھر وہی دھماکے، چیخیں اور دھوئیں کے بادل ــــ چند منٹ کے اندر اندر جرمن طیارے بہت سی گاڑیاں تباہ کر کے اور کتنے ہی سپاہیوں کو ہلاک یا زخمی کر کے غائب ہو چکے تھے۔ میں نے دیکھا کہ فوجیوں نے اپنی اپنی گاڑیوں کے نیچے پوزیشن لے لی ہے اور بہت سے لوگ ریت پہ اوندھے منہ پڑے ہیں۔ جو گاڑیاں بموں کی زد میں آئی تھیں ان کے پرخچے اڑ چکے تھے۔ اور کنوائے کے ساتھ سفر کرنے والی انٹی ایئرکرافٹ

گنوں کے توپچی اب بلا مقصد فائرنگ کر کے جرمنوں پہ رعب ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں نے ابوالحسن کو بتایا کہ ہم جرمنوں کے بجائے اپنی ہی فوج میں پہنچ گئے ہیں تھوڑی دیر بعد ادھر سے ایک "ٹامی" گزرا، تو میں نے اس سے پوچھا:

"تمہاری اس یونٹ کا نام کیا ہے؟"

"ہم آرمڈ رجمنٹ کے آدمی ہیں اور ہمارا سیکنڈ برٹش آرمڈ ڈپو اس وقت جرمن پر بھرپور حملہ کرنے والا ہے۔ معلوم ہوتا ہے تم انڈین موٹر بریگیڈ کے آدمی ہو؟"

میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔

"تمہیں کیونکر پتا چلا کہ میں موٹر بریگیڈ سے تعلق رکھتا ہوں؟"

"تمہاری گاڑی پہ" ہارس شو" (گھوڑے کا نعل) کا نشان لگا ہوا ہے؟" اس نے مجھے بے وقوف سمجھ کر مسکراتے ہوئے کہا اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ گاڑیوں پر نشانات کیوں لگے ہوتے ہیں۔

جرمن طیاروں نے جس شدت سے حملہ کیا تھا، اس سے پتا چلتا تھا کہ وہ اتحادیوں کو کیڑے مکوڑوں کی طرح مسل ڈالنے کے درپے ہیں۔ کنوائے کمانڈر کی ہدایت پر جاری جانے والی زخمیوں اور ہلاک ہونے والوں کو جمع کر کے ٹرکوں میں لادا گیا اور کنوائے دوبارہ حرکت میں آیا۔ میں نے ٹامی کو اپنی گاڑی میں آنے کی دعوت دی، کیونکہ ہمارے پاس رائفل سے بڑا کوئی ہتھیار نہ تھا اور وہ برین گن لئے ہوئے تھا جو اس زمانے کا ایک نیا کارآمد ہتھیار ثابت ہوا تھا۔ میں نے باتوں باتوں میں ٹامی سے کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس سے وہ "راز" اگلوا لیا کہ موٹر بریگیڈ کا کمانڈر کس مہم پہ گیا ہے اس نے بتایا کہ انڈین موٹر بریگیڈ کا اصل مقصد جرمن فوج کو دھوکا دے کر ریگستان کے وسط میں ایک غلط راستے پہ ڈالنا ہے۔ یہ راستہ ایک طرف سے بارودی سرنگوں کے ذریعے بند کر دیا گیا ہے اور دوسری طرف سیکنڈ برٹش آرمڈ ڈپو مکمل طور پہ کیل کانٹے سے لیس جرمنوں کو تباہ کرنے کے لئے مستعد کھڑا ہے۔ جرمن، بمباری اور چند گاڑیاں برباد کر کے

خوش ہو رہے ہیں کہ انہوں نے ہمیں خاصا نقصان پہنچایا ہے، لیکن تم دیکھو گے کہ ہم جرمنوں کو کیسی بھیانک سزا دیتے ہیں"

ٹامی جتنی دیر ہمارے پاس رہا جرمنوں کو مغلظات سے نوازتا رہا اور ابوالحسن صاحب اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ خیر گزری کہ جرمن بمباروں نے دوبارہ حملہ نہیں کیا، ورنہ کھلے ریگستان میں گاڑیوں کے نیچے پناہ لینے کے سوا اور کوئی جگہ نہ تھی وہ دن ہم نے اسی یونٹ میں گزارا اور رات بھی امن چین سے کٹ گئی۔

علی الصباح اس برٹش یونٹ کا لیفٹیننٹ ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"میں طبروق جا رہا ہوں، تم میرے ساتھ چلو، میں تمہیں انڈین موٹر بریگیڈ تک پہنچانے کی کوشش کروں گا"

ہم کشمکش میں پڑ گئے۔ ابوالحسن نے مجھے آنکھ کا اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ انکار کر دیا جائے، چنانچہ میں نے لیفٹیننٹ سے کہا کہ ہم ابھی فیصلہ کر کے آپ کو بتا دیں گے۔ وہ جونہی اپنے ٹرک کی طرف گیا، ابوالحسن دبی آواز میں کہنے لگے۔

"اس بدمعاش کے ساتھ جانے میں جان کا خطرہ ہے۔ خدا معلوم ہمیں کہاں چھوڑ کر رفوچکر ہو جائے، پھر ہم صحرا میں بھوکے پیاسے بھٹکتے رہیں اور ہماری لاشیں گدھ نوچ نوچ کر کھائیں گے"

انہوں نے صحرا کی موت کی ایسی بھیانک تصویر کشی کی کہ میرا دل دہل گیا اور میں انکار کرنے ہی والا تھا کہ شمال کی جانب سے ایک ٹرک آتا دکھائی دیا جس پر "ہارس شو" کا نشان بنا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ معلوم ہوا کہ اس میں ہماری فیلڈ ایمبولینس کے آدمی سوار ہیں اور راستہ بھٹک کر ادھر آنکلے ہیں۔

ہم نے انہیں اپنی رام کہانی سنائی اور انہوں نے اپنی بپتا۔ معلوم ہوا کہ جرمن ٹینکوں نے برق رفتاری سے پیش قدمی کر کے انڈین بریگیڈ پر شدید حملہ کیا اور بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان پہنچایا اور اب بریگیڈ سولم پہاڑی سے چالیس میل آگے سمندر کے کنارے بعلیک کے مقام پر جمع ہو رہا ہے اور ایمبولینس والے وہیں جا رہے ہیں۔ ہم

نے درخواست کی کہ ہمیں بھی ساتھ لے چلیں، وہ راضی ہو گئے۔ لیفٹیننٹ سے اجازت لے کر ہم اسی وقت روانہ ہو گئے اور سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے ایک مختصر سے ہندوستانی کیمپ میں پہنچے، جہاں کھانا پکایا جا رہا تھا۔ گرم گرم روٹی اور دال ہمیں بھی ملی اور ہم نے پیٹ بھر کر کھائی۔ تقریباً پانچ دن بعد ہم نے دال روٹی کی شکل دیکھی تھی، ورنہ موٹے فوجی بسکٹوں، جام اور چائے کے سوا کوئی چیز نصیب نہ ہوئی تھی۔ کھانا کھا کر تھوڑی دیر سستائے اور بعلبک کی طرف روانہ ہوئے۔ ریگستان میں رات کا سفر کچھ آسان نہیں۔ اور کسی بھی لمبے کہیں کہیں نکل جانے کا خدشہ ذہن پر سوار رہتا ہے۔ لیکن ہمارا قسمت اچھی تھی، راہ بھٹکے بغیر اگلے روز صبح دس بجے بعلبک پہنچ گئے۔ بہت سے بچھڑے ہوئے سپاہی ہم سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ اور ہر شخص اپنی داستان سنانے میں مصروف تھا۔ ہماری آمد کی خبر سن کر سب دوڑے ہوئے آئے اور ابوالحسن صاحب تو یوں گلے لگ لگ کر ملے جیسے برسوں بعد ملاقات کا موقع ملا ہے۔ مصافحے اور معانقے سے فراغت ملی، تو جنگ کی تباہیوں کے اعداد و شمار سامنے آئے جنہیں دیکھ کر دل بیٹھ گیا اور احساس ہوا کہ انگریز کمانڈر انڈین بریگیڈ کو کس طرح جرمنوں کی دہکائی ہوئی جنگ کی بھٹی میں بے دریغ جھونک رہے ہیں۔

ہماری یونٹ کی تین صد کی نفری میں سے ایک سو بیس سپاہی جرمنوں کی قید میں جا چکے تھے اور بیس پچیس مارے گئے تھے۔ قیدیوں میں ایک افسر بھی شامل تھا جرمنوں نے جس تیزی سے حملہ کیا اور بریگیڈ کو تتر بتر کر دیا، اس کے واقعات سن کر رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔ بریگیڈ کی باقی یونٹوں کی تباہی کا تناسب بھی یہی تھا۔ اس دوران میں رومیل کے متعلق بھی نئے افسانے سننے میں آئے۔ ایک نے بتایا کہ اس نے خود رومیل کو دوربین ہاتھوں میں لئے ہوئے ایک جیپ پر کھڑے دیکھا ہے۔ دوسرے نے بتایا کہ رومیل گشت کرتے ہوئے ہمارے کیمپ میں بھی آنکلا تھا لیکن کسی نے اسے نہیں پہچانا وغیرہ وغیرہ۔ ہیڈ کلرک صاحب اس زریں موقع سے فائدہ کیوں نہ اٹھاتے۔ انہوں نے رومیل کو دیکھنے کے واقعات اس تسلسل اور

ترتیب سے بیان کرنے شروع کئے کہ دوسروں پر بڑا رُعب پڑا۔ گفتگو کے دوران میں وہ میری طرف دیکھتے جاتے اور مزا یہ کہ مجھ سے تائید بھی کراتے جاتے۔

ان لغویات سے فرصت ملی، تو مجھے کمانڈر اور اس کے مشن کا خیال آیا، نہ معلوم ان پر کیا گزری تھی اور یہ لوگ کس طرح بچ کر آئے۔ اس مہم میں کمانڈر کے ساتھ جانے والا ایک تنومند جوان انور علی مجھے مل گیا اور اس کی زبانی تمام حالات تفصیل سے معلوم ہوئے

"ہمیں کچھ علم نہ تھا کہ کمانڈر کے ذہن میں کیا منصوبہ ہے"——

انور علی نے کہنا شروع کیا۔ "لیکن جو سامان اس نے منگوایا تھا اور صوبیدار کو جس انداز میں بہادر اور چست جوان جمع کرنے کی ہدایت کی تھی، اس سے کچھ کچھ اندازہ ہوا کہ مہم نہایت کٹھن اور جان لیوا ہوگی اور چونکہ ہم لوگ پہلے بھی بہت سی خطرناک مہمیں سر کئے بیٹھے تھے، اس لئے بے خوف و خطر کمانڈر کے ساتھ چلنے پر تیار ہو گئے۔ ہمارا ٹرک سُست رفتار سے چلتا ہوا بریگیڈ کے پڑاؤ سے شمال مغرب میں آٹھ میل کے فاصلے پر پہنچ کر رُکا اور یہاں کمانڈر کی زبانی مہم کی تفصیلات کا پتا چلا۔ سب کو مختلف فرائض سونپ دیئے گئے۔ کمانڈر نے بارودی سرنگیں لگانے کا کام اپنے ذمے لیا اور سفید فیتہ زمین پر بچھاتا ہوا مغرب کی طرف دوڑنے لگا۔ باقی افراد بھی اسی رفتار سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہو گئے۔ دو گھنٹے کی جان توڑ مشقت کے بعد چار میل لمبی لائن پر بوبی ٹراپ اور بارودی سرنگیں بچھا دی گئیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بارود کے بڑے بڑے ذخیرے ڈھیر کر کے "چارج" لگا دیئے گئے اور انہیں سیفٹی فیوز کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک کر دیا گیا۔ کمانڈر نے اب ٹرک کو وہاں سے ہٹا کر تین چار میل دور مشرق کی طرف لیجانے کا حکم دیا اور باقی جوانوں کو اسی جگہ خود رَو جھاڑیوں میں چھپنے کی ہدایت کی۔ کمانڈر خود بھی ایک جھاڑی کے اندر سیفٹی فیوز کے سرے کے نزدیک لیٹ گیا۔"

انور علی نے ایک لمحہ توقف کرنے کے بعد کہا۔

"کسی اَن جانے خوف کے باعث ہم سب اپنی اپنی جگہ چپ چاپ پڑے ہوئے

تھے۔ کمانڈر نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ کوئی شخص سگریٹ پیے، نہ باتیں کرے، صحرا میں ہر طرف موت کی سی خاموشی طاری تھی اور بعض اوقات ہمیں یوں محسوس ہوتا جیسے اندھیرے میں دُور دُور تک لاشیں ہی لاشیں پڑی ہیں۔ یکایک ایک جانب سے ٹینکوں کی آواز آتی سنائی دی۔ میں نے اپنے ساتھ لیٹے ہوئے ایک جوان سعید خاں کا ہاتھ دبایا۔ اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ سعید خاں کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے گردن ہلائی۔ جس کا مطلب تھا کہ آواز اس کے کانوں تک بھی پہنچ چکی ہے۔ ٹینکوں کے چلنے سے صحرا کے بے کراں سناٹے میں جو ارتعاش پیدا ہوا اس نے ہمارے اندر اضطراب کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔ میں نے بائیں ہاتھ کی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ٹھیک چار بجے تھے اور مشرق کی طرف سے صبح کے روشن آثار نمودار ہوا ہی چاہتے تھے۔ ہوا یک لخت تیز ہو گئی اور ریت کے بگولے اڑ اڑ کر ایک طرف سے دوسری طرف جانے لگے۔

مغرب کی جانب اُفق کے نزدیک کالے کالے دھبّے نظر آ رہے تھے۔ کمانڈر کے حلق سے ایک گھٹی ہوئی چیخ نکلی اور وہ بے اختیار جرمنوں کو گالیاں دینے لگا۔ شاید اس لئے کہ اس کی تمام محنت پر پانی پھر گیا تھا۔ اس نے جرمن فوج کی نقل و حرکت کا اندازہ غلط کیا تھا۔ اپنے حساب کے مطابق وہ جرمن فوج کے ایڈوانس کے بائیں کنارے پر تھا، لیکن اب دشمن کے ٹینک اس کی دونوں طرف پھیلے ہوئے سیدھی قطار میں بڑھ رہے تھے۔ ان کی رفتار بہت سست تھی۔ ہمارا ٹرک ڈرائیور جسے چار میل دور مشرق میں بھیجا گیا تھا، ٹینکوں کی آواز سن کر ٹرک لے کر آیا، لیکن اس سے پیشتر کہ وہ ہم تک پہنچتا، جرمنوں نے اس پر فائرنگ شروع کر دی۔ ٹرک کے اگلے دونوں پہیے گولیوں سے چھلنی ہو گئے اور ڈرائیور بھی جاں بحق ہو گیا۔ ڈرائیور کی اس حماقت کا نتیجہ یہ نکلا کہ جرمنوں کو شک ہو گیا کہ یہاں کچھ گڑبڑ ہے — انہوں نے مشین گنوں کے منہ کھول دیے اور گولیاں بارش کی طرح ہمارے سروں پر برسنے لگیں

فرار کا کوئی راستہ نہ تھا، جھاڑیوں میں دبکے پڑے رہے۔ موت لمحہ بلمحہ ہم سے قریب ہو رہی تھی۔ اب "ہینڈز اَپ" کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، لیکن کمانڈر صاحب ہمیں آگ میں جھونکنے کا پورا تہیّہ کیے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں تو ہاتھ اُوپر اٹھانے کا اشارہ کیا اور خود "سیفٹی فیوز" میں دیا سلائی دکھادی۔ یکے بعد دیگرے چار دھماکے ہوئے، لیکن بے فائدہ۔ جرمنوں کو ان سے کوئی نقصان نہ پہنچا۔ البتہ ان کی پیش قدمی رُک گئی اور ان کے افسر نے للکار کر کہا۔

"ہتھیار پھینک دو اور باہر نکل آؤ۔"

ہم سب ایک ایک کر کے جھاڑیوں سے باہر آگئے اور ہاتھ اُوپر اٹھا دیئے۔ جرمن ہمیں دیکھ کر حیران ہوئے اور انہوں نے ہم کو گھیرے میں لے کر بھیڑ بکریوں کی طرح ایک طرف ہانک دیا اور جلدی جلدی سب کی تلاشی لی، مگر ہمارے پاس کچھ نہ تھا۔ اب وہ کمانڈر کے پاس گئے اور اسے ہم سے الگ کر دیا۔ آدھ گھنٹے تک جرمن آپس میں صلاح مشورہ کرتے رہے اور پھر ایک بڑا افسر ہماری جانب بڑھا اور مسکراتے ہوئے انگریزی زبان میں کہنے لگا۔

"تم ہندوستانی لوگ اپنے انگریز آقاؤں کے ساتھ ہم سے کیوں لڑتے ہو؟ ہماری لڑائی انگریز سے ہے، تم سے نہیں، تم ان کے غلام ہو، کیا تم اتنا نہیں سوچتے کہ انگریز کی مدد کرنے کے باوجود غلام ہی رہو گے؟"

ہم سب سر جھکائے مجرموں کی طرح کھڑے تھے۔ کچھ جواب نہ بن پڑا۔ جرمنوں نے آپس میں پھر کانا پھوسی شروع کی اور آخر کار اسی افسر نے سرد لہجے میں کہا۔

"تم سب فوراً یہاں سے بھاگ جاؤ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پندرہ منٹ کی مہلت دیتے ہیں۔ اس کے بعد ہم تمہاری جانوں کے ذمّے دار نہ ہوں گے۔ تم مشرق کی طرف جا سکتے ہو، چلو بھاگو۔" ہم نے اپنے کمانڈر کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا، تو جرمن افسر چلاّیا۔ "یہ ہمارے پاس رہے گا۔"

کمانڈر نے ہمیں جانے کا اشارہ کیا اور ہم اسے فوجی سلام کر کے مشرق کی طرف

بھاگ نکلے۔ دوپہر تک دوڑتے رہے، حتیٰ کہ تھکن نے ہمیں نڈھال کر دیا۔ ہمارے پاس کھانے کے لئے کچھ تھا نہ پینے کے لئے اور کہیں سے مدد کی امید نہ تھی۔ بھوک اور اس سے زیادہ پیاس نے بے حال کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہماری قبریں اسی ریگستان میں بنیں گی۔ شام پانچ بجے ہم بے دم ہو کر ایک جگہ ٹھہرے اور لمبے لمبے لیٹ گئے۔ ہم میں سے ایک جوان پر جو صوبیدار تھا، مدہوشی کا عالم طاری تھا، وہ بار بار پانی مانگتا، لیکن ہم اسے آنسوؤں کے سوا کچھ نہ دے سکے۔ آگے بڑھنے کی کسی میں ہمت نہ تھی اور راستے کا کوئی نقشہ ہمارے پاس نہ تھا۔ آدھی رات کے وقت حوالدار مہر شاہ نے مجھے جھنجھوڑا اور کہا:

"انور علی، گاڑی کی آواز سن رہے ہو؟"

میں چونک گیا اور غور سے آواز سننے لگا۔ بہت دور کسی ٹرک کے چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ مہر شاہ پھر چلایا: "انور علی، ہوش میں آؤ، محمد حسین کی بھی ہمت بندھاؤ۔ ممکن ہے یہ ٹرک خدا نے ہماری مدد کے لئے بھیجا ہو۔"

حوالدار مہر شاہ نے محمد حسین کو بیدار کرنے کی کوشش کی جس کی حالت ہم سے بھی ابتر تھی۔ باقی لوگ اندھیرے میں اِدھر اُدھر لاشوں کی مانند پڑے تھے۔ آخر چوں توں کر کے محمد حسین کو اٹھایا اور ہم تینوں اس ٹرک کی تلاش میں لڑکھڑاتے اور گرتے پڑتے آواز کے رُخ چلنے لگے۔ ایک ہزار گز آگے بڑھنے کے بعد ایک سیاہ رنگ کا ہاتھی دور سے نظر آیا جو یقیناً ٹرک تھا اور پھر اس کے نزدیک چند انسانی سائے بھی حرکت کرتے دکھائی دیئے۔ بڑی مصیبت یہ تھی کہ ہم بالکل نہتے تھے اور خوف تھا کہ اگر ٹرک والے جرمن سپاہی ہوئے تو ہمارا بچنا بہت مشکل ہے، چنانچہ جھاڑیوں اور ریت کے ٹیلوں کی آڑ لیتے ہوئے ہم آگے رینگنے لگے اور ٹرک کے اس قدر قریب پہنچ گئے کہ سایوں کی جگہ چار آدمی دکھائی دینے لگے جو سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ ان کی زبان ہماری سمجھ میں نہ آ سکی۔ اور گمان یہی تھا کہ وہ جرمن ہیں اور راستہ بھول کر اِدھر آ نکلے ہیں۔ انہوں نے ایک ساتھی کو پہرے پر مقرر کیا اور باقی تین ٹرک کے قریب

کمبل بچھا کر لیٹ گئے۔ پھر ہم نے ان کے خراٹوں کی آوازیں سنیں۔ پہرہ دینے والا سپاہی ٹرک کے گرد چکر لگاتے لگاتے تھک کر عقبی حصّے سے سہارا لیے اونگھنے لگا۔ اب ہم چیتے کی طرح گھات لگا کر آگے بڑھے۔ ہمارے قدموں کی آہٹ سے اونگھنے والا سنتری چونکا اور اس نے رائفل سیدھی کی، لیکن ہم نے اسے فائر کرنے کا موقع نہ دیا۔ الداد مہر شاہ نے چھلانگ لگائی اور اس سے گتھم گتھا ہو گیا۔ بہت جلد ہم نے اس کی رائفل چھین لی۔ اس ہنگامے نے سونے والے تینوں سپاہیوں کو بیدار کر دیا۔ مگر میں نے انہیں رائفل دکھا کر گاڑی کے نیچے سے نکلنے کا حکم دیا۔

"کم آؤٹ یو جرمن ...... یو جرمن ....."

اندر سے آواز آئی۔

"نو آئی نو جرمن ..... آئی فری فرنچ ..... آئی فری فرنچ آئی فرینڈ انگلیسی ......"

اب مجھے احساس ہوا کہ وہ ہمارے ہی آدمی ہیں اور فرانسیسی فوج سے تعلق رکھتے ہیں۔ "وی انڈین" یہ کہہ کر ہم نے انہیں اطمینان دلایا اور بتایا کہ جرمن سمجھ کر حملہ کیا گیا تھا۔ ہم ہاتھ ملا ملا کر خوب ہنستے رہے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ پانی اور خوراک بڑی مقدار میں ٹرک کے اندر موجود ہے اور اس طرح اللہ نے صحرا کی بھیانک موت سے ہمیں بال بال بچایا۔

جان کی بازی

رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہر شے سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ ہر طرف بھیانک سناٹا چھایا ہوا تھا، اچانک جرمن طیارہ شکن توپوں کی گھن گرج نے آسمان کو نارنجی اور سرخ رنگ میں تبدیل کر دیا۔ اتحادی فضائیہ کے ایک بمبار طیارے نے بم پھینکنے کے لیے ناروے کی بندرگاہ پر غوطہ لگایا، لیکن دفعتہً طیارے نے ساحلی شہر سٹیجن کی طرف رُخ کر لیا۔ لگاتار خوفناک دھماکوں کی آوازیں فضا میں پھیلنے لگیں اور سٹیجن شہر سے آگ کے مہیب شعلے اُٹھنے لگے۔ جرمن توپیں مختلف زاویوں سے مسلسل گولے برسا رہی تھیں۔ اتحادی فضائیہ کے اس طیارے کی رفتار ۱۸۰ میل فی گھنٹہ تھی اور وہ چھ ہزار فیٹ کی بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔ اس نے دوبارہ غوطہ لگایا اور مشرق کی جانب غائب ہو گیا۔ طیارہ شکن توپوں کے اِکّا دُکّا دھماکے اب بھی سنائی دے رہے تھے۔ جرمن فوج کا ایک یونٹ اس وقت مورچے کھودنے میں مصروف تھا۔ یونٹ کے اعلا افسر کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ ان کا خیال تھا کہ طیارہ پیراشوٹ کے ذریعے اتحادی سپاہیوں کو اتار رہا ہے۔ یہ خیال اس لیے ان کے ذہن میں آیا کہ انہوں نے طیارے کو کئی بار غوطہ لگا کر ہموار زمین سے بمشکل سو فیٹ پر پرواز کرتے دیکھا تھا
تھوڑی دیر بعد دو جرمن موٹر سائیکل سوار بڑی تیزی سے ایک طرف جاتے دکھائی دیئے۔ طیارہ سامنے پہاڑی کی اوٹ سے پھر نمودار ہوا۔ اس کے دائیں جانب جرمن طیارہ شکن توپیں تابڑ توڑ گولہ باری کر رہی تھیں۔ گولوں کے مسلسل پھٹنے کی وجہ سے فضا دور دور تک روشن ہو چکی تھی۔ دونوں موٹر سائیکل سوار سپاہیوں نے دیکھا کہ پہاڑی کے دامن میں واقع ہموار علاقے

میں اتحادی چھاتا بردار اتر رہے ہیں۔ انہوں نے موٹر سائیکلوں کو اور تیز کر دیا۔ وہ فوراً زمین پر گرتے ہوئے چھاتا برداروں کے سر پر پہنچ جانا چاہتے تھے۔ موٹر سائیکل سواروں نے ابھی ایک چھوٹی سی ڈھلان عبور کی ہی تھی کہ پہلو میں پھیلے ہوئے اناس کے درختوں کے جھنڈ سے اچانک مشین گن گولیاں اگلنے لگی۔ دونوں جرمن سپاہی زخمی ہو کر دور جا گرے۔ ان کی موٹر سائیکلیں چکنا چور ہو گئیں۔ ایک تو اسی وقت ختم ہو گیا، لیکن دوسرا شدید زخمی ہونے کے باوجود اپنے گھٹنوں کے بل گرا، ایک ہاتھ سے ریوالور نکالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ گولیوں کی بوچھاڑ نے اس کا بدن بھی چھلنی کر دیا۔

چند لمحوں بعد جب سارجنٹ فلپ نیلسن پیراشوٹ کے ذریعے زمین پر اترا تو تین شخص، جن کے چہرے اندھیرے میں پہچانے نہیں جاتے تھے، جھاڑیوں میں سے نکلے اور سارجنٹ نیلسن کے پاس آ گئے۔ سارجنٹ ان سے چند گز کے فاصلے پر بیٹھا تھا۔ انہوں نے آہستہ سے خفیہ الفاظ میں سارجنٹ سے کچھ کہا۔ سارجنٹ نے ان کے چہروں کو غور سے دیکھا اور اس کی آنکھوں سے اطمینان جھلکنے لگا۔

ان تینوں افراد میں سے دو سپاہی اور ایک لڑکی تھی، جن کے ذمے ناروے بندرگاہ کی تباہی اور مزید فوجی اہمیت کی معلومات حاصل کرنا تھا۔ یہ تینوں یہاں پہلے ہی پہنچ چکے تھے اور رہائش کا بندوبست بھی کر لیا تھا۔

"یہاں سے اب چل دینا چاہیے، ہو سکتا ہے جرمن سپاہی ہمیں تلاش کر رہے ہوں" لڑکی نے آہستہ سے کہا۔ اس کی نظریں نیلسن کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں "آپ کو چوٹ تو نہیں لگی؟" اس نے نیلسن سے پوچھا "نہیں نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں" نیلسن نے نارویجی زبان میں جواب دیا۔

انہوں نے پہلے سے ایک پرانے ٹرک کا انتظام کر رکھا تھا۔ یہ ٹرک تقریباً تین میل دور درختوں کے ایک جھنڈ میں کھڑا تھا۔ وہ ٹرک میں بیٹھ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ شہر کے ہنگاموں سے دور لیر یخر شہر کے بیس میل مشرق میں ایک چھوٹے سے گاؤں

میں انہوں نے قیام کیا۔ یہ گاؤں ناروے کی بندرگاہ سے بالکل قریب تھا۔ جس کمرے میں ان کا قیام تھا، وہ گاؤں کی گنجان آبادی کے کنارے واقع تھا۔ اور اس طرف لوگوں کی زیادہ آمدورفت بھی نہ تھی۔ اس رضا کار لڑکی کا نام کیرن بوگن تھا اور عمر کوئی اکیس سال کے لگ بھگ۔ کیرن نے جلدی جلدی شوربہ تیار کیا اور سب لوگ ڈبل روٹی اور شوربے پر پل پڑے۔ فلپ نیلسن دونوں موٹر سائیکل سوار جرمن سپاہیوں کے متعلق گفت گو کر رہا تھا دوسرے شخص کرٹ والجر نے کہا "اگر ہم ان دونوں موٹر سائیکل سواروں کو نہ دیکھتے"...... تو وہ مجھے مار ڈالتے" فلپ نیلسن نے جملہ مکمل کر دیا۔ کرٹ والجر نے شوربے میں چمچہ ہلاتے ہوئے کہا: "ہم نے انہیں مار کر عقل مندی کا ثبوت نہیں دیا، لیکن تمہیں زندہ رکھنا نہایت ضروری تھا۔ اس لیے انہیں مارنا ہی پڑا۔" فلپ نیلسن کے متعلق کرٹ والجر کا اندازہ غلط نہ تھا۔

فلپ نیلسن اس خفیہ مشن کا اہم رکن تھا۔ ستمبر ۱۹۴۳ء میں ناروے کی بندرگاہ کو تباہ کرنے اور مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے اس مشن کی اجازت امریکا اور برطانوی چیف آف اسٹاف سے لینی پڑی تھی۔ سارجنٹ فلپ نیلسن کو اس خفیہ مشن کا سربراہ مقرر کیا گیا تھا اور اسی مشن کی کامیابی پر اتحادیوں کی فتح کا دارومدار تھا۔

ناروے کی بندرگاہ میں جرمنوں نے آبدوز کشتیوں کا ایک بہت بڑا اڈہ بنا رکھا تھا، جن کی وجہ سے ایک سال پہلے روس کی طرف سے محاذ پر بھیجے جانے والے سپلائی کنوائے P.Q.17 کو تباہ کر دیا گیا تھا۔ اس طرح روس کی بندرگاہوں آرچینگل اور مرمارک سے شمالی راستے کے ذریعے سپلائی بالکل بند ہو گئی تھی اور اب تقریباً چودہ مہینے بعد اس انتہائی مشکل مہم پر سارجنٹ فلپ نیلسن کو روانہ کیا گیا تھا۔

اتحادیوں کو ایک خفیہ تنظیم کے ذریعے یہ پتا چلا تھا کہ نازیوں نے نارو ک کے جنوب میں بندرگاہ بنائی ہے، جو ایک بہت بڑی چٹان کو نیچے سے کھوکھلا کر کے بنائی گئی ہے چٹان کا اوپر والا حصہ اس بندرگاہ کے لیے چھت کا کام دیتا ہے۔ یہ بندرگاہ بہت وسیع علاقے میں پھیلی ہوئی ہے اور یہیں سے تیل کی سپلائی کا کام دن رات جاری رہتا ہے۔ اس بندرگاہ کے عقب میں زمین کو کھوکھلا کر کے تیل کے ذخیرے رکھے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جرمن

طیاروں اور بحری جہازوں کو ایندھن، مرمت کا سامان اور اسلحہ وغیرہ حاصل کرنے کے لیے دور دراز کی بندرگاہوں تک جانا نہیں پڑتا۔

برطانیہ کی بحریہ کے ایک اعلا افسر ایچ وی کاکس نے نیلسن سے اس بندرگاہ کے متعلق کہا تھا کہ یہ ہمارے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور جب تک ہم اس رکاوٹ کو دور نہ کریں گے، اس وقت تک برطانوی اور امریکن دونوں ملکوں کے جہاز سپلائی لائن قائم نہیں رکھ سکیں گے اور آئے دن انہیں زیادہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔

اس بندرگاہ پر قبضہ کرنا یا اسے تباہ کرنا معمولی کام نہ تھا کیوں کہ یہاں تک صحیح سلامت پہنچنا مشکل ہی نہیں، تقریباً ناممکن تھا۔ شمال اور جنوب کی طرف سے اس بندرگاہ کو جرمن ایئر فورس کی زبردست امداد حاصل تھی اور سمندر کے راستے بندرگاہ تک پہنچنا اس لیے مشکل تھا کہ جرمن دور مار توپیں یہاں کثرت سے نصب تھیں جن کے مسلسل برستے ہوئے گولے بحری جہازوں کو آناً فاناً ڈبو دیتے تھے۔

سارجنٹ فلپ نیلسن کا مشن یہ تھا کہ اس بندرگاہ کا قریب سے کسی طرح معائنہ کیا جائے اور گرد و نواح کا معائنہ کر لینے کے بعد اسے تباہ کرنے کا منصوبہ تیار کیا جائے۔ نیلسن کو ایسے مشکل کام سلیقے سے انجام دینے کا پرانا تجربہ تھا۔ اس نے چھوٹی عمر ہی میں ملٹری انٹیلی جنس برانچ سے اعلا سندِ کارکردگی حاصل کر لی تھی اور دشمن کے علاقے میں خفیہ مشن کی سرکردگی کی خاص تربیت حاصل کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی خوبی نیلسن میں یہ تھی کہ وہ بڑی آسانی اور تیزی سے ناروی زبان بول اور لکھ سکتا تھا۔ اصل میں نیلسن کے آباؤ اجداد ناروے کے رہنے والے تھے اسی لیے اس کے لہجے میں اتنی روانی تھی۔

اس مشن کی کامیابی اس لیے بھی ضروری تھی کہ نومبر کے مہینے میں روس کو بحری جہازوں کے ذریعے سپلائی جانے والی تھی اور اتحادی افسرانِ بالا کا یہ خیال تھا کہ سپلائی کو کسی خطرے کے بغیر اس بار اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہیے۔

سارجنٹ فلپ نیلسن اور ناروے کے تینوں دوست اس بات پر متفق ہو گئے کہ جب تک بندرگاہ کو دیکھنے کی کوئی صورت نہیں نکلتی، انہیں اسی جگہ قیام کرنا چاہیے۔ اس کے بعد ان کی میٹنگ برخاست ہو گئی۔

دروازے پر کیرن بوگن نے مسکراتے ہوئے نیلسن سے کہا: "نیلسن، کسی قسم کا کوئی فکر مت کرو، یہاں جرمن سپاہی نہیں پہنچ سکتے۔ اچھا، اب میں چلتی ہوں اور دوبارہ دو تین دن بعد ملوں گی۔"

وہ رات نیلسن نے اس مکان کے پیچھے ایک چھوٹے سے اسٹور میں گزاری۔ تمام رات وہ بالکل نہ سو سکا اور بندرگاہ کو تباہ کرنے کے مختلف منصوبوں پر غور کرتا رہا۔ صبح دوسرے کمرے میں جا کر ناشتا کیا اور دوبارہ اسی اسٹور میں چلا گیا۔ نیلسن کو یقین تھا کہ دو جرمن سپاہی مارے جا چکے ہیں۔ اس لیے اس علاقے میں جرمن سپاہی ہماری تلاش میں ضرور گھوم رہے ہوں گے۔ اور نیلسن کا اندازہ ٹھیک ہی نکلا۔

شام کے وقت کیرن بوگن اکیلی اس ٹرک میں بیٹھ کر آئی اور نیلسن کو وہی خبر سنائی جس کے متعلق نیلسن کو تمام رات اور دن دھڑکا لگا رہا تھا۔ جرمن فوجی دستے علاقے میں پھیل چکے تھے اور چھاتا برداروں کو تلاش کر رہے تھے۔ وہ ہر مکان اور چھوٹی سے چھوٹی جھونپڑی کی بھی تلاشی لے رہے تھے۔ کیرن دروازے پر کھڑی ہوگئی اور آہستہ سے کہا: "ہم نے چھپنے کے لیے ایک اور جگہ تلاش کر لی ہے، اب ہمیں فوراً چل دینا چاہیئے۔"

"لیکن تم اکیلی کیوں آئی ہو؟" نیلسن نے غصے سے کہا، "کیا ہمارا گروپ کسی مرد کو نہیں بھیج سکتا تھا۔؟"

"اس کی دو وجوہات ہیں۔" کیرن بوگن نے نرمی سے کہا، "ایک تو یہ ہے کہ میں نے اپنے آپ کو رضاکارانہ طور پر اس کام کے لیے پیش کیا ہے، دوسرے یہ کہ تجربات سے ثابت ہو چکا ہے کہ عورت پر مرد کے مقابلے میں شک کم ہی کیا جاتا ہے۔ خدا کے لیے جلدی کرو۔" اس کے لہجے میں ایک دم نرمی آگئی، "ہمیں اپنا وقت فضول بحث میں ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔"

ٹرک اپنی نئی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کیرن بوگن ٹرک چلا رہی تھی۔ نیلسن ٹرک کے پچھلے حصے میں چھپا ہوا تھا۔ کیرن بڑی احتیاط اور غیر معمولی مہارت سے ٹرک چلا رہی تھی اور رفتار بڑھا رہی تھی۔ اس وقت وہ لیر ینجر شہر کی طرف جا رہے تھے، جہاں پہاڑی

ے نزدیک چھُپنے کے لیے ایک کیبن حاصل کیا گیا تھا۔ تقریباً آدھا راستہ طے ہو چکا تھا کہ
نیلسن نے محسوس کیا کہ ٹرک کی رفتار کم ہو رہی ہے۔ پھر ایک دم بریک لگنے کی آواز کے
ساتھ ہی ٹرک دھچکے سے رُک گیا۔ شام کا اندھیرا بڑھ چکا تھا۔ نیلسن نے ٹرک کے ایک
طرف سے کپڑا ہٹا کر دیکھا۔ تیز سرچ لائٹ ٹرک کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ پھر
کسی کے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ نیلسن کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے فوراً اپنا ریوالور
نکال لیا۔ کیرن ٹرک روک کر سامنے آتے ہوئے سپاہی کا انتظار کر رہی تھی۔ ٹرک کی لائٹ
سپاہی کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ یہ سپاہی جرمن نہیں، ناروے کا باشندہ معلوم ہوتا تھا اور
نارڈ لینڈر رجمنٹ سے تعلق رکھتا تھا۔ جرمن ہائی کمانڈ اس رجمنٹ سے سڑکوں کو بند کرنے
اور گشتی دستوں کا کام لیتی تھی۔ وہ کیرن سے مختلف سوالات کرنے لگا۔ نیلسن سانس روکے
ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔ کیرن نے ہر سوال کا جواب مختصر الفاظ میں دیا اور سپاہی کو بتایا کہ
اس کا چچا غلّے کے گودام میں گر کر زخمی ہو گیا ہے اور وہ ڈاکٹر کو لینے لیرنجر جا رہی ہے۔
سپاہی نے ٹرک کے پچھلے حصّے کی تلاشی لینے پر اصرار کیا۔ کیرن نے اُسے ٹالنے کی بڑی
کوشش کی، مگر وہ نہ مانا اور دائیں طرف سے ہوتا ہوا ٹرک کے پچھلے حصّے تک آن پہنچا۔
جوں ہی نیلسن کو سپاہی کے بھاری بوٹوں کی چاپ سنائی دی، وہ تیار ہو گیا۔ اب سپاہی ٹرک
کے پچھلے حصّے پر لگے ہوئے موٹے کپڑے کے تسمے کھول رہا تھا۔ کپڑا ایک طرف
ہٹانے کے بعد وہ ٹرک میں داخل ہونے کے لیے بڑھا۔ نیلسن کو اس کا سر اور کندھے
صاف نظر آ رہے تھے۔ سپاہی نے جوں ہی ٹرک کے اندر فلیش لائٹ پھینکی، نیلسن اپنی جگہ
سے اچھلا اور اپنے دونوں بھاری بھرکم بوٹوں سے سپاہی کے منہ پر ایسی دولتی جھاڑی کہ
وہ لڑھکتا ہوا دُور جا گرا ـــــ فلیش لائٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ نیلسن ٹرک سے کودا
اور سپاہی کی چھاتی پر سوار ہو گیا اور اپنے فولادی ہاتھوں سے اس کا گلا دبانے لگا۔ سپاہی نے
نیچے سے نکلنے کی کوشش کی، لیکن اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ نیلسن نے سپاہی کی کنپٹی پر
ریوالور کی نالی رکھی اور لبلبی دبا دی۔ فضا میں ایک دردناک چیخ بلند ہوئی اور سپاہی کا جسم ڈھیلا
پڑ گیا۔

نیلسن نے کیرن کو آہستہ سے آواز دی اور کہا، "لاش کو ٹرک کے اندر ڈال لو۔" کیرن نے سپاہی کی ٹانگیں پکڑتے ہوئے کہا، "تھوڑے ہی فاصلے پر ایک گڑھا ہے۔ اس لاش کو ہم وہاں پھینک دیں گے۔" سپاہی کی لاش ٹرک میں جلدی سے ڈال کر وہ دوبارہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ چند میل طے کرنے کے بعد ایک چھوٹے سے پل کے قریب کیرن نے ٹرک کھڑا کر دیا۔ ہر طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دونوں نے مل کر لاش اٹھائی اور پل کے نیچے پھینک دی۔ نیلسن اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے ادھر ادھر غور سے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ ٹرک کی طرف واپس آئے تو کیرن بری طرح کانپ رہی تھی۔ نیلسن نے شفقت سے کیرن کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا، "کیرن، تم بہادر لڑکی ہو ایک لاش دیکھ کر گھبرا گئیں! ہم اپنے وطن کے لیے ہی خطروں میں گھرے ہوئے ہیں ہمیں اپنے فرض کی ادائیگی کے دوران میں گھبرانا نہیں چاہیئے۔ ہاں، تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تم کیوں ایسے خطرناک مشن میں شریک ہوئیں؟"

"یہ ایک لمبی اور دردناک کہانی ہے سارجنٹ، اب بتانے کا وقت نہیں، جلدی سے ٹرک میں بیٹھو، ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیئے۔"

جب وہ اپنے نئے ٹھکانے پر پہنچے تو والجر اور گھنی ڈاڑھی والے ہیرکلیس کو منتظر پایا۔ کیرن نے راستے میں پیش آنے والے حادثے کا ذکر کیا تو کلیس نے نیلسن کی کمر تھپکی۔ تھوڑی دیر بعد کلیس اور کیرن اپنے ایک رشتے دار کے ہاں چلے گئے۔ یہ مکان نزدیک ہی ایک ڈھلان پر واقع تھا۔

دوسرے دن والجر اور نیلسن اس مکان کے قریب سے گزرنے والوں کو غور سے دیکھتے رہے، لیکن انہیں کوئی جرمن نظر نہ آیا۔ اگلی صبح جب کیرن ٹرک میں واپس آئی تو اس کے ساتھ ایک نوجوان الف بردولڈ بھی تھا۔ یہ نوجوان بھی اسی خفیہ مشن کا ایک رکن تھا اور کسی دوسری جگہ مقیم تھا۔ آپس میں کچھ دیر بات چیت کرنے کے بعد سب نے بندرگاہ کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ بندرگاہ تقریباً دس میل کے فاصلے پر تھی۔ انہوں نے یہ فاصلہ پیدل طے کرنے کا ارادہ کیا۔ کیرن کو وہیں ٹھہرنے کی ہدایت کی گئی اور باقی افراد بندرگاہ

کی طرف چل پڑے۔ تمام راستے وہ دیکھتے بھالتے آگے بڑھتے رہے، لیکن انہیں کوئی جرمن سپاہی دکھائی نہ دیا۔ تقریباً چار گھنٹے بعد وہ بندرگاہ کے قریب پہنچ گئے۔ ان کے سامنے کافی بلند چٹان تھی۔ جرمنوں کی یہ خفیہ زمین دوز بندرگاہ اس چٹان سے چار سو گز دائیں طرف بنی ہوئی تھی۔ اُفق تک سمندر پھیلا ہوا تھا۔ اس وقت بندرگاہ کی گودی میں ایک جہاز کھڑا تھا جس کے عرشے پر بے شمار سپاہی اور مزدور کام کرتے نظر آ رہے تھے۔ نیلسن نے دوربین سے دیکھا۔ بندرگاہ میں جہاز کے داخل ہونے کے راستے کے دونوں طرف دو بھاری کرین نصب تھے۔ چٹان کی دیواروں کے ساتھ فولاد کی موٹی موٹی چادریں لگی ہوئی تھیں۔ کرین دیکھ کر نیلسن فوراً سمجھ گیا کہ اس قسم کے کرین کانوں کی کھدائی کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان ہی کے ذریعے جرمنوں نے چٹان کے نچلے حصے کاٹ کر بڑے بڑے زمین دوز گودام بنائے تھے۔

ان کے علاوہ چٹان میں طیارہ شکن توپوں کی تین چار قطاریں تھیں، جنھیں شاخیں اور پتے ڈال کر ڈھانپ دیا گیا تھا۔

نیلسن نے ساتھیوں کو واپس چلنے کا اشارہ کیا، کیوں کہ وہ سمجھ چکا تھا کہ بندرگاہ میں سامنے کی طرف سے داخل ہونا ممکن نہیں۔ بندرگاہ میں داخل ہونے کا کوئی اور راستہ تلاش کرنا پڑے گا۔

اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر نیلسن نے پیٹرکلیس کو ان تمام تفصیلات سے آگاہ کیا۔ پیٹرکلیس چند لمحے آنکھیں بند کیے کچھ سوچتا رہا، پھر بولا:

"جرمنوں نے چٹان کے نیچے واقع قدرتی غاروں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان میں سپلائی ڈپو قائم کیے ہیں اور سمندر پر بڑھے ہوئے چٹانی حصے کے نیچے آب دوز کشتیوں کو چھپانے کا انتظام کیا ہے۔ ان غاروں تک پہنچنے کے لئے ہمیں کوئی زمین دوز راستہ تلاش کرنا ہوگا۔ یا کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے کہ ہم غاروں تک پہنچ سکیں۔ اس سلسلے میں مقامی لوگوں سے کسی نہ کسی طرح معلومات حاصل کرنی چاہییں اور مچھیروں اور ملاحوں سے میل جول بڑھانا چاہیئے۔ ان لوگوں کی ساری زندگی سمندر میں مچھلیاں پکڑتے

اور مویشی چراتے گزری ہے۔ یہ لوگ یقیناً مفید باتیں بتا سکیں گے کوئی فیصلہ کن قدم اسی وقت اٹھایا جا سکتا ہے، جب ہم ان غاروں تک پہنچنے میں کام یاب ہو جائیں۔"

چنانچہ معلومات حاصل کرنے کے لئے ہر فرد نے اپنی اپنی جگہ کوشش شروع کر دی۔

پانچ دن بعد کیلس نے رپورٹ دی کہ کوئی حوصلہ افزا بات معلوم نہیں ہو سکی۔ نیلسن نے سب کو مشورہ دیا، "ہمیں کوشش جاری رکھنی چاہیئے، مجھے امید ہے ہماری کوششیں بارآور ثابت ہوں گی۔"

صبح شام مچھیروں اور گڈریوں سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد نیلسن مایوس ہو کر واپس آجاتا۔ ایک دن اس نے کیرن سے سوال کیا، "کیرن، تم کیوں کر اس مشن میں شامل ہوئیں؟"

کیرن نے فرائی پین چولہے سے اٹھاتے ہوئے غور سے نیلسن کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"سارجنٹ نیلسن، ہم لوگ نارو ک کی بندرگاہ کے قریب رہتے تھے۔ جب جرمنوں نے اس بندرگاہ پر حملہ کیا تو میرا باپ اور بھائی لڑتے ہوئے مارے گئے، ماں پہلے ہی مر چکی تھی اب میں اس دنیا میں اکیلی تھی میں نے فیصلہ کیا کہ فوج میں بھرتی ہو جاؤں گی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ معمولی تربیت حاصل کرنے کے بعد مجھے اس خفیہ مشن میں شامل کر لیا گیا۔" کیرن کی آواز بھرا گئی تھی اور اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے...... نیلسن اپنی جگہ سے اٹھا اور کیرن کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا:

"کیرن، جنگ کسی کے نزدیک بھی پسندیدہ نہیں۔ اس میں ہزاروں لوگ بے گھر ہو گئے۔ کتنی ماؤں کے بیٹے، کتنی بہنوں کے بھائی اور کتنی ہی بیویوں کے شوہر جنگ میں کام آ چکے ہیں، لیکن ہمیں جیت کے لیے اب صبر سے کام لینا چاہیے۔ پرانے دکھوں کو بھول کر ہی ہم آگے بڑھ سکتے ہیں"...... نیلسن نے رومال سے اس کے

آنسو پونچھے، پھر کہنے لگا:

"کیرن اب تم اکیلی نہیں ہو، مَیں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم مجھے اپنا بھائی سمجھو۔"

ایک ہفتے تک ہر شخص اپنے طور پر مشن کو کامیاب بنانے سے متعلق مختلف معلومات حاصل کرتا رہا۔ ہفتے کے آخری دن آئیو ہالسن نامی ایک آدمی سے اس گروہ کے ایک رکن کی ملاقات ہوئی۔ آئیو ہالسن کافی معمّر تھا اور مویشی چرایا کرتا تھا۔ جو معلومات آئیو ہالسن نے بہم پہنچائیں، وہ مفید اور حوصلہ افزا تھیں۔ آئیو ہالسن نے پہاڑیوں کے درمیان ایک ایسا راستہ بتایا، جو تنگ و تاریک ہونے کے باوجود سیدھا جرمن سپلائی ڈپو تک پہنچتا تھا اور مختلف غاروں تک اس راستے کی کئی شاخیں نکلتی تھیں۔ بڈھے آئیو ہالسن نے نیلسن کو بتایا:

"آج سے ساٹھ برس پہلے جب میں بارہ سال کا تھا تو دوسرے لڑکوں کے ساتھ مل کر ان ہی ساحلی غاروں میں چھپ کر آنکھ مچولی کھیلا کرتا تھا۔"

"اس بات کو تو ساٹھ برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ کیا تمہیں اب بھی وہ راستہ یاد ہے؟"

"کیوں نہیں! اگر آپ وہاں جانا چاہیں تو مَیں آپ کی رہنمائی کر سکتا ہوں۔" بڈھے نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

اگلی صبح نیلسن، والجر اور کیلس اس خطرناک، لیکن تاریخی مشن پر روانہ ہو گئے۔ آئیو ہالسن ان کے آگے آگے تھا۔ انہوں نے اپنے ساتھ فلیش لائٹ، نائلون کے موٹے موٹے رسّے کیلیں، ہتھوڑی، کھانے پینے کا سامان اور اسٹین گنیں لے لیں۔ چلتے چلتے وہ اس بلند چٹان کے دامن میں پہنچ گئے، لیکن انہیں خدشہ تھا کہ اس چٹان کے گرد درختوں کے جھنڈ میں جرمن چھپے ہوئے ہیں۔ اپنا شک رفع کرنے کے لیے انہوں نے انناس کا ایک درخت کاٹنا شروع کر دیا، تاکہ کوئی جرمن سپاہی چھپا ہوا ہو تو وہ یہ آواز سن کر باہر آ جائے۔ انہوں نے پندرہ منٹ تک انتظار کیا، لیکن کوئی جرمن سپاہی اُدھر نہ آیا۔ وہ چپکے سے دبے پاؤں آگے بڑھے اور چٹان کی ڈھلوان پر پہنچ گئے۔ آئیو ہالسن اب بھی آگے چل رہا تھا۔ ڈھلوان ختم ہوئی تو ان لوگوں کو ایک تاریک گڑھا نظر آیا، جس کے گرد گھنے درخت اُگے ہوئے تھے۔ یہ گڑھا چار فیٹ چوڑا تھا۔

گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے سب سے پہلے ہالسن اس میں داخل ہوا اُس کے پیچھے نیلسن، پھر والجر اور سب سے پیچھے کیلس۔ وہ اسی طرح گھٹنوں کے بل آگے بڑھتے رہے۔ مٹی نم تھی اور راستے میں ہلکی ہلکی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اب یہ راستہ ایک گنبد نما غار میں داخل ہو چکا تھا۔ غار کی چھت میں کہیں کہیں سوراخ تھے، جن میں سے روشنی چھن چھن کر اند آرہی تھی، لیکن یہ روشنی اتنی ناکافی تھی کہ مزید آگے بڑھنے کے لیے راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ انہوں نے فلیش لائٹ سے کام لیا اور پنجوں کے بل آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے وہ تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کر چکے تھے کہ ہالسن نے ایک راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"یہ ہے وہ راستہ۔"

چلتے چلتے جب وہ لوگ غاروں کی بھول بھلیوں میں سے نکلے تو انہیں خود بھی یاد نہ رہا کہ وہ کس راستے سے آئے تھے۔ ہالسن تیزی سے چل رہا تھا۔ اچانک ایک جگہ وہ رُکا:

"اب جرمنوں کے ڈپو زیادہ دور نہیں ہیں ذرا احتیاط سے چلیے۔" وہ ایک چھوٹا سا موڑ مڑ کر چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ مدھم سی زرد روشنی نظر آئی۔ نیلسن نے فلیش لائٹ بند کرنے کا حکم دیا۔ وہ ایک جگہ چند لمحے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ہلکا سا شور ان کے کانوں سے ٹکرا رہا تھا، جیسے کافی فاصلے پر بہت سے آدمی باتیں کر رہے ہوں۔ مشینوں کے چلنے کی آوازیں بھی اس شور میں شامل تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے۔ زرد رنگ کی روشنی نزدیک آتی جا رہی تھی۔ راستہ بالکل تنگ ہو گیا تھا۔ سب لوگ گھٹنوں اور کہنیوں کے بل رینگ رہے تھے۔ راستے کی آخری حد پر ڈھلوان تھی، لیکن وہ سب رینگتے ہوئے اس ڈھلوان سے اُتر کر ایک بڑے غار میں داخل ہو گئے۔ یہی وہ جگہ تھی، جہاں سے جرمنوں کا خفیہ اڈا شروع ہوتا تھا۔ نیلسن ہر چیز کو غور سے دیکھتا جاتا تھا۔ غار کے ایک کونے میں پچیس پچیس فیٹ لمبے ڈرم رکھے تھے، جن میں پیٹرول بھرا ہوا تھا۔ غار کا رقبہ تقریباً ۸۰ مربع گز تھا اور یہ ڈرم چھت تک لگے ہوئے تھے۔ یہاں سے گودی تک سارا منظر بخوبی دکھائی دیتا تھا۔ جرمن سپاہی اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے کیلس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے نیلسن کی توجہ مبذول کرائی۔ چند سپاہی آب دوز کشتی میں تار

پیڈو باندھ رہے تھے۔ اس کے علاوہ ایک ربڑ کے پائپ کے ذریعے آب دوز میں پٹرول بھرا جا رہا تھا۔ نیلسن وائیں طرف چند قدم چل کر رُک گیا۔ دوسرے ساتھی بھی اس کے پیچھے اکھٹے ہوئے۔ چند منٹ تک وہ یہ زیرِ زمین نظام دیکھتا رہا اور پھر واپس مُڑا۔ کافی پیچھے پہنچ کر نیلسن نے پہاڑی کی دیوار میں ایک بڑی کیل ٹھونکی اور اس میں نائلون کا رسّا باندھ دیا دُوسری کیل آگے زمین میں گاڑ کر رسّے کا دُوسرا سرا اس میں باندھ دیا۔ یہ رسّے اس لیے باندھے گئے کہ واپسی پر رہنمائی کا کام دے سکیں۔ ممکن ہے اس مہم میں صرف ایک دو ساتھی بچ سکیں اور آئیو ہاسن کے بغیر انہیں واپسی کا راستہ تلاش کرنے میں دقت پیش آئے۔ وہ دوبارہ اس چھوٹے سے سوراخ کے پاس آئے اور تمام حالات کا گہری نظر سے مشاہدہ کرنے کے بعد واپس جدھر سے آئے تھے، اُدھر چل پڑے۔ اصل میں یہ تمام نظام جس وسیع رقبے میں پھیلا ہوا تھا، اُسے تباہ کرنے کے لیے ان کے پاس ہتھیار ناکافی تھے۔ چناں چہ تمام راستے نائلون کی باریک ڈوری بچھاتے اور غاروں کی بھول بھلیوں سے گزرتے ہوئے باہر آ گئے۔

اسی شام نیلسن نے ایک پیغام کیلس کو دیا کہ خفیہ وائرلیس پر یہ پیغام برٹش انڈر گراؤنڈ تنظیم کو پہنچا دے۔ نیلسن نے ہیڈ کوارٹرز سے درخواست کی تھی کہ انہیں بم، جرمن وردیاں اور چھوٹے دُور مار ہتھیار بھیجے جائیں تاکہ وہ اس خفیہ بندرگاہ کا ڈپو اُڑا سکیں۔

جب یہ پیغام لندن ہیڈ کوارٹر میں موصول ہوا تو خفیہ تنظیم کے تمام افسر بہت خوش ہوئے۔ فوراً ہی بموں، جرمن فوجی وردیوں، دور مار ہتھیاروں اور بارہ بہترین تربیت یافتہ سپاہیوں کا انتظام کیا گیا، جنہیں پیراشوٹ کے ذریعے بتائے ہوئے مقام پر باحفاظت اُتار دیا گیا۔ جرمن نارڈلینڈ رجمنٹ نے پھر ایک بار ان لوگوں کی تلاش میں دن رات ایک کر دیا، لیکن وہ ان کو پکڑنے میں ناکام رہی۔ ہفتے کے اختتام پر یہ تمام نئے سپاہی متعلقہ سامان کے ساتھ نیلسن کے پاس پہنچ چکے تھے۔ خفیہ تنظیم کے ان بارہ سپاہیوں کو چار چار کی ٹولیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہ لوگ غاروں میں رسّوں کے ذریعے اترنے میں ماہر تھے۔

نیلسن کو وقت کی کمی کا شدت سے احساس تھا۔ ۱۱ اکتوبر کو نیلسن اور کیلس نے آخری میٹنگ کی جس میں طے پایا کہ اگلے اتوار کی رات (۱۷ اکتوبر ۱۹۴۳ء) کو جرمنوں کی اس خفیہ

بندرگاہ پر حملہ کیا جائے گا۔ دو دن پہلے تمام اسلحہ ایک غار میں پہنچا دیا گیا اور ان تمام انتظامات اور آخری فیصلے کے متعلق وائرلیس کے ذریعے لندن انٹیلی جنس بیورو کو اطلاع دیدی گئی کمرے کے دروازے پر رخصت کے وقت کیلس اور نیلسن نے ہاتھ ملایا۔ نیلسن نے جب کیرن کو خدا حافظ کہا تو کیرن کی آنکھوں میں ایک بے مہار بہن کے جذبات اُمڈ آئے

"اچھا بھائی، خدا تمہاری حفاظت کرے۔"

نیلسن اس رات اکیلا ہی نہ جانے کہاں کہاں گھومتا رہا اور صبح کے وقت واپس کمرے میں آیا۔ کیرن کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں، "بھائی، تم رات بھر کہاں رہے؟"

"کہیں نہیں کیرن، بس یہ دُعا کرو ہم اپنے مشن میں کامیاب ہو جائیں۔"

صبح ہوئی۔ گروپ کے تمام لوگ ایک جگہ جمع ہوئے۔ سارا دن وہ مختلف نقشوں کو سامنے رکھے غور سے دیکھتے اور تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ شام کا اندھیرا بڑھتے ہی وہ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر اپنے مشن پر روانہ ہو گئے۔ نیلسن نے رخصت ہوتے وقت کیرن کو دلاسا دیا اور کہا، "بہن دعا کرو میں زندہ سلامت واپس آجاؤں، تاکہ تمہاری خدمت کر سکوں ——— آخر بھائی ہوتے کس لیے ہیں؟"

چٹان کے پچھلے حصے میں پہنچ کر سب لوگوں نے پہلے سے چھپائے ہوئے ہتھیار اور دوسری ضروری چیزیں سنبھال لیں۔ وہ ان پیچیدہ راستوں سے بڑی تیزی سے گزر رہے تھے۔ ایک غار میں کچھ دیر کے لیے وہ ٹھہر گئے اور جرمن وردیاں پہن لیں۔ اس کے بعد نیلسن نے ہر شخص کو اسلحہ تقسیم کیا اور ان کے ذمے جو کام تھے، انہیں ایک بار پھر دُہرایا۔ آخر میں ہر شخص کو دھماکے سے پھٹنے والے بم تقسیم کیے گئے۔ سب نے اچھی طرح اپنے ہتھیار اور متعلقہ چیزیں چیک کیں اور آگے بڑھ گئے۔ اس غار سے نکلنے کے بعد باقی راستہ تمام لوگوں نے گھٹنوں کے بل رینگتے ہوئے طے کیا اور ڈھلوان طے کر کے بڑے غار میں پہنچ گئے۔ نیلسن نے ایک سوراخ سے جھانک کر حالات کا جائزہ لیا۔ وہاں خلافِ معمول پہلے سے کچھ کم جرمن سپاہی کام کر رہے تھے۔ نیلسن نے سوچا، ممکن ہے باقی سپاہی کسی

اور کونے یا غار میں آرام کر رہے ہوں۔ چند منٹ تک وہ زرد رنگ کی روشنیوں کو غور سے دیکھتا رہا اور پھر واپس اپنے ساتھیوں کے پاس آگیا۔ کبھی کبھی جرمن سپاہیوں کے ایک دوسرے کو پکارنے کی آواز بھی آجاتی تھی یا کوئی افسر بھاری آواز میں احکام جاری کرتا سنائی دیتا تھا۔ پندرہ منٹ انتظار کرنے کے بعد نیلسن نے اپنی گھڑی دیکھی۔ کیلس نے سرگوشی کی، "کتنی دیر ہے؟"

نیلسن نے دھیرے سے جواب دیا:

"آدھ گھنٹہ، بشرطیکہ یہ سب کچھ ہمارے منصوبے کے مطابق ہوتا رہے۔"

کیلس نے بے چینی سے نیلسن کی طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ نیلسن نے کندھے سکوڑے، لیکن کوئی جواب نہ دیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہو۔ چند منٹ اور گزر گئے، اچانک طیارہ شکن اور دُور مار توپوں کی گھن گرج فضا میں پھیل گئی۔

وائرلیس کے آخری پیغام کے مطابق اتحادیوں کے چار بحری جہاز بندرگاہ سے کچھ فاصلے پر پہنچ چکے تھے اور جرمنوں کی توجہ پھیرنے کے لیے دھڑا دھڑ گولہ باری کر رہے تھے۔ ان جہازوں میں سے دو جہاز ناروے کی شاہی بحریہ سے تعلق رکھتے تھے۔

اتحادیوں کے جہازوں کی توپوں سے نکلنے والے گولے بندرگاہ کے قریب ہی پھٹ رہے تھے۔ جرمن سپاہی تقریباً تمام توپوں کے قریب پہنچ چکے تھے اور جوابی گولہ باری کر رہے تھے۔

مشن کا نازک ترین لمحہ آن پہنچا تھا جب وہ وردیوں میں اپنے ہتھیار چھپا کر باہر نکلے تو تمام جرمن سپاہی اپنی اپنی توپوں پر مصروف تھے۔ بھاگم بھاگ پڑی ہوئی تھی۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ انہیں کسی نے غار سے باہر آتے نہیں دیکھا۔ جرمن توپوں کی گھن گرج سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی طے شدہ منصوبے کے مطابق وہ اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ انہوں نے دل ہی دل میں اپنے فرائض کو دہرایا۔ نیلسن کا نشانہ پٹرول کے دونوں اسٹور تھے، جو غار کی بائیں دیوار کے ساتھ بھاری ڈرموں کی صورت میں محفوظ تھے۔

بڑے ڈرم سے چند فیٹ کے فاصلے پر نیلسن نے ایک بڑا ٹائم بم احتیاط سے رکھ دیا۔ ان ڈرموں سے لگے ہوئے ربڑ کے بے شمار پائپ بندرگاہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ نیلسن نے دوسرا ٹائم بم ربڑ کے پائپوں کے ساتھ باندھ دیا۔ خفیہ تنظیم کے باقی کارکن بھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ اس وقت انہیں جرمن وردیوں نے بہت فائدہ پہنچایا۔ بھاگ دوڑ میں کئی بار جرمن سپاہیوں سے وہ ٹکرا بھی گئے اور انہوں نے جرمن سپاہیوں کے ساتھ مل کر گولہ بارود بھی ڈھویا، لیکن اس افراتفری کے عالم میں انہیں کوئی نہ پہچان سکا کہ وہ جرمن نہیں، اتحادی ہیں۔

مصیبت اس وقت آئی جب آخری بم رکھا جا رہا تھا ——— ہوا یوں کہ نوجوان برو ولڈ آخری ٹائم بم اسلحے کے بکسوں کے پاس رکھ رہا تھا کہ ایک جرمن افسر نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے برو ولڈ کو دیکھتے ہی گلا پھاڑ کر دوسرے سپاہیوں کو بلایا۔ برو ولڈ نے گھبرا کر ریوالور نکالا اور جرمن پر فائر کر دیا۔ جرمن افسر کے سینے سے خون کا فوارا نکلا، لیکن اس نے بھی پلٹ کر برو ولڈ کے کندھے پر فائر کر دیا۔ والجر نزدیک ہی کھڑا تھا اس نے جرمن افسر کی کھوپڑی پر گولی مار دی۔ وہ چکرایا اور اوندھے منہ ایک ڈرم کے اوپر جا گرا۔ یہ شور سن کر کچھ اور جرمن سپاہی اُدھر آ گئے غار کے اس بڑے سے کمرے کے چاروں طرف الارم بجنے لگے۔ پیٹرول کے اسٹور سے نکلتے ہوئے نیلسن نے اپنا ریوالور نکال لیا اور بھاگ کر غار کے عقب میں پوزیشن سنبھال لی۔ کافی دیر تک اس کے اردگرد گولیوں کی بوچھاڑ ہوتی رہی۔ نیلسن نے موقع پاتے ہی ڈھلان سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ جرمن سپاہی نیلسن سے صرف دس گز کے فاصلے پر ڈٹے ہوئے اُسے ختم کرنے کے درپے تھے نیلسن جہاں کود کر گرا، وہاں کافی اندھیرا تھا اور جرمن سپاہی اُسے نہ دیکھ سکتے تھے۔ اس نے نشانہ باندھ کر گولی چلائی اور ایک جرمن سپاہی کو موت کی نیند سلا دیا۔ پیچھے لیٹے ہوئے جرمن سپاہی کی کمر پر کیلس نے ریوالور رکھ دیا، لبلبی دبائی اور اسے بھی ختم کر دیا۔

نیلسن اور کیلس چیخ چیخ کر اپنے ساتھیوں کو خاص خفیہ الفاظ میں ایک جگہ جمع ہونے کا حکم دے رہے تھے۔ سب ساتھی رینگتے، گولیاں چلاتے اور اپنا بچاؤ کرتے ہوئے

سمندر پر آگے بڑھی ہوئی چٹان کے نیچے جمع ہو رہے تھے۔
ٹائم بموں کے پھٹنے کی مدت صرف بیس منٹ تھی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور تمام ساتھی برستی گولیوں میں چٹان کے پچھلے حصّے کی طرف رینگ رہے تھے جب وہ چٹان کے عقبی حصّے میں پہنچ گئے تو انہوں نے پٹرول کے ڈرموں کو آگ لگا دی بروولڈ زخمی ہو چکا تھا اور والجر اس پر جھکا اُسے گھسیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر وہ بروولڈ کو غار کے دہانے تک گھسیٹ لانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بروولڈ کو اٹھا کر دہانے کے اندر پھینک دیا۔ والجر اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلّایا "نیچے آ جاؤ، پٹرول میں آگ لگ چکی ہے۔" کیلس اپنی جگہ سے ابھرا اور چٹان کی بڑی درز کے ایک طرف جا پڑا۔ ایک فائر ہوا لیکن کیلس بچ گیا۔ کیلس دوبارہ اپنی جگہ سے اٹھ کر درز تک پہنچ کر اندر جانا چاہتا تھا کہ ایک اور فائر ہوا اور کیلس کی وردی خون سے سرخ ہو گئی۔ کیلس پھر اٹھا اور ایک ہی چھلانگ میں درز کے اندر جا پڑا اور چلّایا۔
"نیلسن بھاگ جاؤ، آگ تیز ہوتی جا رہی ہے۔" نیلسن والجر کی طرف بڑھنے والا ہی تھا کہ کیلس دوبارہ چیخا، "نیلسن، میری فکر نہ کرو، پوزیشن کنٹرول کرو۔" کیلس نے اب اسٹین گن سنبھال لی تھی۔ وہ ڈھلان پر جھکا متواتر گولیاں چلا رہا تھا۔ گولیوں کی ایک باڑھ نے کیلس کا جسم چھلنی کر دیا۔ اسٹین گن اس کے دائیں ہاتھ میں لٹک کر رہ گئی۔ اس کے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ چند لمحے بعد وہ ختم تو ہو گیا، لیکن اس نے زندگی کے آخری لمحوں تک جرمن سپاہیوں کو چٹان کے اس اہم راستے تک آنے سے روکے رکھا۔
اتنے عرصے میں والجر اور نیلسن کو اس راستے تک پہنچ جانے کا موقع مل گیا۔ جرمنوں کے چیخنے کی آوازیں متواتر آ رہی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جرمن پہاڑی کے اوپر چڑھ رہے ہیں۔ نیلسن نے اشارے سے والجر اور دوسرے ساتھیوں کو ڈھلان سے نیچے بھیج دیا۔ "جلدی بھاگو .... ہمیں یہاں سے جلدی نکل جانا چاہیئے ٹائم بم پھٹنے ہی والے ہیں ...."
نیلسن نے چھاتی سے بندھا ہوا دستی بم کھولا اور پن کھینچ کر غار کے دہانے کے درمیان رکھ دیا اور اپنے تمام ساتھیوں کو لے کر پیچھے پہنچ گیا۔ جرمن غار کے دہانے تک پہنچ

چکے تھے۔ انہوں نے اسٹین گنیں، ریوالور اور دستی بم سنبھال رکھے تھے اور وہ بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ نیلسن اپنے ساتھیوں کو لے کر بہت پیچھے غاروں میں ایک محفوظ جگہ پہنچ چکا تھا۔ اچانک سفید اور نیلی روشنی نے بندرگاہ کا کونا کونا روشن کر دیا۔ ایک لرزہ خیز دھماکا ہوا۔ چاروں طرف دھواں ہی دھواں پھیل چکا تھا۔ بہت دیر بعد جب دھوئیں کے بادل صاف ہوئے تو وہاں بندرگاہ کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ البتہ ملبے کا ایک اونچا سا ڈھیر ضرور نظر آ رہا تھا۔ بڑی چٹان بڑے بڑے ٹکڑوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ خفیہ مشن کے سارے رکن پیٹ کے بل کافی دُور ایک محفوظ غار میں لیٹے ہوئے تھے۔ آٹھ منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک اور دھماکا ہوا اور اس مرتبہ ملبے کے اس ڈھیر کا بھی صفایا ہو گیا۔

نیلسن ٹائم بموں کے دھماکے گِن رہا تھا جب وہ آٹھ دھماکے گِن چکا تو اس نے سب کو اُسی راستے سے واپس چلنے کا حکم دیا۔ ۲۰ منٹ بعد جب وہ غاروں کی بھول بھلیوں سے باہر نکلے تو آسمان پر دھوئیں کے مہیب بادل چھائے ہوئے تھے۔

ناروے کی خفیہ اور زیرِ زمین دوزِ سپلائی کی بندرگاہ تباہ ہو چکی تھی۔ جرمنوں کے پاس اور کوئی قریبی بندرگاہ نہ تھی۔ اب انہیں اپنی سپلائی لائن قائم رکھنے کے لیے طویل چکر کاٹنا پڑتا تھا اور جنگ کا پانسہ آہستہ آہستہ اتحادیوں کے حق میں پلٹتا جا رہا تھا۔

چرچل

میری زندگی کا ناقابلِ فراموش دَور وہی ہے جو میں نے سر ونسٹن چرچل کی معیت میں گزارا۔ خدا کی پناہ کیسے بھیانک دن تھے وہ بھی! ہٹلر برطانیہ کو تہس نہس کرنے پر تلا ہوا تھا۔ جرمن طیارے لندن پر چوبیس گھنٹے بمباری کر رہے تھے۔ ہر طرف آگ اور خون کا کھیل جاری تھا اور بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہٹلر اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب ہو جائے گا ——— اتحادی فوجیں حریف کو شکست دینے کے لئے سر توڑ کوششیں کر رہی تھیں۔ ان کے لیڈر آپس میں صلاح مشورے کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاتے تھے۔ امریکہ، برطانیہ اور روس مل کر ایک قوم بن گئے تھے۔ ایسا اتحاد دوبارہ دیکھنے میں نہیں آیا۔

برطانیہ کو بچانے کی ذمّے داری سر ونسٹن چرچل کے کندھوں پر آن پڑی تھی اور بیسویں صدی کا یہ سب سے بڑا انگریز جس مہارت، ہوشیاری، تدبر اور بہادری سے وطن کی حفاظت کر رہا تھا، اس کی تعریف خود حریف کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ہٹلر نے ان ہی دِنوں کہا تھا: "اگر برطانیہ کے پاس چرچل نہ ہوتا، تو میں اس ملک کو کرۂ ارض سے نیست و نابود کر دیتا۔" خدا جانے یہ روایت سچ ہے یا جھوٹ، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انگریزوں کو تباہی سے بچانے والا صرف یہی ایک مردِ عظیم تھا۔

میں اپنے آپ کو انتہائی خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ چرچل کے ساتھ میں نے چند سال اس طرح گزارے کہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ایک لمحہ بھی میرا ان سے رابطہ نہیں ٹوٹا۔ میں ان کے محافظ دستے کا انچارج تھا اور میرا فرض چرچل کی زندگی کی حفاظت

کرنا تھا۔ کہنے کو تو یہ ایک سادہ سا جملہ ہے، لیکن اس کی حقیقت کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ ایک ایسے شخص کی دیکھ بھال کتنا مشکل فریضہ تھا جسے اپنے عوام سے بے پناہ محبت تھی اور جو کسی بھی وقت ان سے ملنے کے لئے سڑکوں، بازاروں اور پناہ گاہوں میں جا سکتا تھا۔

دشمن کے طیّارے لندن پر آگ برسا رہے ہیں۔ بموں کے دھماکوں سے لندن لرز رہا ہے۔ زمین شق ہو رہی ہے۔ عمارتیں گر رہی ہیں اور سائرن چلّا رہے ہیں کہ یکایک چرچل اپنی کرسی سے اٹھتا ہے اور کمرے سے باہر نکل آتا ہے، وہ خود دیکھنا چاہتا ہے کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے، لوگ کیا کر رہے ہیں۔ ہم سب سائے کی طرح اس کے ساتھ ہیں، موت ہمارے تعاقب میں ہے، لیکن چرچل کے ہونٹوں پر ازلی و ابدی مسکراہٹ طاری ہے۔ وہ نہایت بے پروائی سے سگار پیتے ہوئے جیپ پر بیٹھا شہر کا چکر لگا رہا ہے۔ بعض لمحات ایسے بھی آئے ہیں کہ ہم اپنی جانوں کو صریحاً خطرے میں محسوس کر رہے ہیں اور خود چرچل کی زندگی کا اعتبار اٹھ گیا ہے، لیکن خوف کی علامت اس کے چہرے پر نمودار نہیں ہوتی، وہ موت کا ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

میں نے چرچل کو ہر حال میں دیکھا ہے۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا، پینا، تقریر کرنا لوگوں سے ملنا، ماتحتوں کو احکام جاری کرنا، سب کچھ میری نگاہ میں ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنے دَور کے مصروف ترین آدمی تھے۔ انہیں آرام کرنے کے لئے بمشکل وقت ملتا تھا۔

۱۲ر نومبر ۴۳ء کو مسٹر چرچل برطانوی بحریہ کے جنگی جہاز "ری ناؤن" کے ذریعے پلے ماؤتھ کی بندرگاہ سے قاہرہ کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ تہران کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا جا چکا ہے جس میں روس کے مردِ آہن مارشل سٹالن، امریکہ کے صدر روزویلٹ اور برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر چرچل شریک ہوں گے۔ وزیر اعظم کے ساتھ پورا عملہ جا رہا ہے اور گھر میں سے صرف ان کی بیٹی مس سارہ چرچل اپنے

باپ کے ہمراہ ہیں۔

پروگرام اصل میں یہ تھا کہ بحری جہاز کے ذریعے پہلے جبل الطارق جائیں گے۔ وہاں سے طیارے میں قاہرہ کی طرف پرواز کریں گے، لیکن عین وقت پر پتا چلا کہ جبل الطارق کا موسم بے حد خراب ہے اور طیارہ وہاں سے پرواز نہیں کر سکے گا، چنانچہ ہم مالٹا کے راستے مصر پہنچے۔ برطانوی فوجی دستوں نے پہلے ہی سے مینا ہوٹل کا چارج لے لیا تھا۔ یہاں ہمیں ٹھہرایا گیا۔ اسی روز مادام اور مسٹر چیانگ کائی شیک جنرل ایمو اور صدر روزویلٹ قاہرہ پہنچ گئے اور ان لوگوں نے نہایت پُرلطف ماحول میں گفتگو کی۔ ان کی حفاظت کے کڑے انتظامات کیے گئے تھے، چپے چپے پر فوجی سپاہی سنگینیں تانے ٹہل رہے تھے۔ اور ہر آنے جانے والے شخص کی سختی سے جانچ پڑتال کی جاتی۔ کانفرنس کے دوران میں یا اس کے بعد کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ کانفرنس کے بعد فیصلہ ہوا کہ ایک گروپ فوٹو لیا جائے، چنانچہ یہ لیڈر کانفرنس روم کی پچھلی جانب واقع باغ میں جمع ہوئے۔ صدر روزویلٹ نے چیانگ کائی شیک کو درمیان میں بٹھانا چاہا، لیکن چیانگ تیار نہ ہوا۔ اس پر تینوں لیڈروں کے مابین مذاق بھی ہوا، اور وہ ایک دوسرے پر فقرے چست کرتے اور قہقہے لگاتے رہے۔ آخر صدر روزویلٹ کو درمیان میں بیٹھنا پڑا۔ ان کی دائیں جانب چیانگ اور بائیں جانب مسٹر چرچل تھے۔

تہران روانہ ہونے سے ایک دن پہلے صدر روزویلٹ اور مسٹر چرچل ایک ہی کار میں بیٹھ کر اہرام اور ابوالہول کا مجسمہ دیکھنے گئے۔ انہوں نے ان تاریخی عجائبات کے معائنے میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اور دیر تک مصری فنِ تعمیر پر تبادلۂ خیالات اور بحث کرتے رہے۔ اس وقت ان دونوں کو دیکھ کر یہ احساس ہی نہ ہوتا تھا کہ وہ دنیا کے دو عظیم ملکوں کے سربراہ ہیں اور ایک طاقتور حریف سے لڑنے میں مصروف ہیں۔ اس کے بجائے وہ علمِ آثارِ قدیمہ کے دو ایسے ماہر نظر آتے تھے جن کو اپنے فن کے سوا کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں۔

ہمیں اپنے جاسوسوں کے ذریعے قاہرہ ہی میں یہ اطلاع مل چکی تھی کہ نازی ایجنٹوں کی

بڑی تعداد تہران میں موجود ہے' اور یہ لوگ اتحادی لیڈروں، خصوصاً مسٹر چرچل کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ نازی ایجنٹوں کی مہلک کارروائیاں میرے لئے کوئی نئی بات نہ تھی اور ہم میں ان سے دو دو ہاتھ کرنے کی صلاحیت تھی، لیکن مسئلہ ہمارا نہیں، برطانوی مدبر کو بچانے کا تھا جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ برطانوی قوم کو بچانے میں کام آ رہا تھا۔ ہمارا طیارہ تہران کے ہوائی اڈے پر اترا، تو میں نے محسوس کیا کہ برطانوی سفارتخانے نے اگرچہ وزیر اعظم کی حفاظت کے انتظامات خوب کیے ہیں، لیکن کچھ ایسے افراد بھی وہاں مختلف حیثیتوں سے موجود ہیں جن پر نازی ایجنٹ ہونے کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔ میں نے وزیر اعظم سے درخواست کی کہ ہوائی اڈے سے سفارت خانے میں پہنچنے تک اپنے جاں نثار کی ہدایت پر عمل کرنا پسند کریں، تو یہ قوم پر بڑا احسان ہو گا۔

انہوں نے میری بات غور سے سنی، ایک لمحے کے لئے سگار کا کش ملتوی کر کے مسکرائے اور شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولے: "ارے تھامپسن، تم فکرمند کیوں ہوتے ہو، جس طرح کہو گے تعمیل کروں گا۔"

یہ سن کر میری جان میں جان آئی۔ میں نے نازی ایجنٹوں کے بارے میں کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا اور سفارتخانے کے فوجی اتاشی سے حفاظت کے انتظامات پر چند ضروری باتیں دریافت کیں۔ اس نے بتایا کہ نازی ایجنٹوں پر کڑی نگاہ رکھی جا رہی ہے؛ تاہم خدشہ ضرور ہے کہ شاید وزیر اعظم پر حملہ کیا جائے۔

تماشائیوں کو ہوائی اڈے سے کافی دور ہی روک لیا گیا تھا۔ مسٹر چرچل بند گاڑی میں سوار ہو کر سفارت خانے پہنچے اور اپنے کمرے میں جاتے ہی انہوں نے مجھے طلب کیا۔

"مسٹر تھامپسن، مجھے اطلاع ملی ہے کہ جرمن ایجنٹ پیراشوٹ کے ذریعے تہران پر اتارے گئے ہیں اور ان کا ارادہ ہم پر حملہ کرنے کا ہے۔" ("ہم" میں چرچل نے سٹالن اور روزویلٹ کو بھی شامل کر لیا تھا)۔

میں حیرت سے ان کی طرف تکنے لگا۔ میں ان کے باڈی گارڈ دستے کا انچارج اور برطانوی سیکرٹ سروس کا رکن ہونے کے باوجود اس نئی خبر سے بے خبر تھا۔ ایسا

معلوم ہوتا تھا کہ وزیر اعظم کے پاس کوئی خفیہ ٹرانسمیٹر ہے جس سے وہ براہِ راست اطلاعات وصول کرتے ہیں۔ انہوں نے میرے اندرونی جذبات بھانپنے کے بعد مسکرا کر کہا۔

"سفارت خانے کے گرد جتنے آدمی ہیں، سب کی جانچ پڑتال کر کے مجھے بتاؤ اور امریکی سفارت خانے کو بھی اس خبر سے آگاہ کر دو۔"

صدر روز ویلٹ اپنے ملک کے سفارت خانے کی وسیع و عریض عمارت میں ٹھہرے ہوئے تھے جو ہمارے سفارت خانے سے ایک میل دور تھی اور مسٹر چرچل کو تھوڑی دیر بعد جانا تھا۔ میں ابھی نئے انتظامات میں مصروف تھا اور ڈیوٹیاں مقرر کی جا رہی تھیں کہ عین وقت پر چرچل نے مجھے دوبارہ اپنے پاس بلایا، اور فیصلہ کن لہجے میں کہنے لگے۔ "تھامپسن، میں اس وقت امریکی صدر سے ملنے نہیں جاؤں گا، میری بجائے تم گاڑی میں بیٹھ کر وہاں چلے جاؤ، لیکن اس انداز میں جس طرح مجھے جانا چاہیئے۔

میرے جسم پر جیسے کنکھجورے رینگنے لگے۔ مجھے مسٹر چرچل کا پارٹ ادا کرنا تھا؛ اگرچہ یہ نئی بات نہ تھی، مگر جان کسے پیاری نہیں ہوتی؟ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے وزیر اعظم کا مخصوص لباس پہنا، سگار منہ میں دبایا اور بند فوجی گاڑی میں اپنے حفاظتی دستے کے ساتھ روز ویلٹ کی قیام گاہ پر پہنچ گیا۔ مسٹر روز ویلٹ نے مجھے بتایا کہ نازی ایجنٹوں کی خطرناک سرگرمیوں کے بارے میں وہ مارشل سٹالن کو اطلاع بھجوا چکے ہیں اور سٹالن نے پیشکش کی ہے کہ اگر صدر روز ویلٹ روسی سفارتخانے میں قیام کریں، تو یہ زیادہ بہتر ہو گا اور ملاقاتیں کرنے میں بھی آسانی رہے گی۔ صدر روز ویلٹ نے سٹالن کی یہ تجویز منظور کر لی تھی۔

یہ سن کر مجھے کچھ سکون ہوا، کیونکہ روسی سفارت خانے کی عمارت برطانوی سفارتخانہ کے نزدیک تھی اور اس طرح مسٹر چرچل آنے جانے کی جان لیوا زحمت سے محفوظ ہو گئے۔ واپسی پر میں نے وزیر اعظم کو اس نئے منصوبے سے آگاہ کیا، تو وہ بھی خوش

ہوئے — روسی اور برطانوی سفارتخانے کے درمیان جو سڑک واقع تھی، اُسے عوام کی آمدورفت اور ٹریفک کے لئے بند کیا جا چکا تھا اور یہاں بڑی تعداد میں امریکی روسی اور برطانوی سپاہی تعینات تھے۔ انہیں متعین دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی جنگ چھڑنے والی ہے۔

"تہران کانفرنس" روسی سفارتخانے کی عمارت ہی میں ہوئی۔ وزیراعظم کیساتھ ان کے خاص کاغذات سنبھالے جب میں کمرے میں داخل ہوا، تو میں نے دیکھا کہ مارشل سٹالن کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ انہوں نے گرمجوشی سے ہاتھ ملائے۔ اس وقت دونوں لیڈر سگار پی رہے تھے اور اچھے موڈ میں تھے۔ صدر روزویلٹ کی گفتگو پُرلطف تھی۔ انہوں نے ایک لطیفہ سنایا اور میں نے دیکھا کہ اس کے اختتام پر تینوں لیڈر کھلکھلا کر ہنسے۔ بیضوی میز کے گرد بیٹھے ہوئے یہ تین خوش وخرم انسان کرۂ ارض کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے تھے۔

کانفرنس کئی دن جاری رہی۔ سینکڑوں دلچسپ باتیں سامنے آئیں۔ آپس میں تحفے تحائف کا تبادلہ بھی کیا گیا۔ اس دوران میں صرف ایک مرتبہ دشمن کی طرف سے گڑبڑ پھیلانے کی کوشش کی گئی، لیکن اسے ناکام بنا دیا گیا۔ اتحادیوں ہی میں سے ایک لیڈر کا پرسنل سیکرٹری نہ جانے کس طرح نازیوں کے ہتھے چڑھ گیا (میں اس لیڈر کا نام ظاہر نہیں کروں گا) اور انہوں نے اسے اپنے ساتھ ملا لیا اور بنک آف انگلینڈ کے کئی لاکھ پونڈ کی مالیت کے اصلی نوٹ رشوت میں دیئے۔ اس کا کام صرف یہ تھا کہ جس کمرے میں کانفرنس ہو رہی ہے، اس میں ایک ٹائم بم لے جا کر رکھ دے، لیکن کانفرنس روم میں ٹائم بم لے جانا تو درکنار، وہاں ایک حقیر سی سُوئی بھی دیکھے بھالے بغیر نہ جا سکتی تھی۔ پرسنل سیکرٹری تاک میں لگا رہا، لیکن کڑی نگرانی اور تلاشی کے باعث ٹائم بم کمرے میں لے جانے کا موقع نہ مل سکا؛ حالانکہ یہ ٹائم بم دیا سلائی کی ڈبیا کے برابر تھا۔

میں کئی روز سے اس شخص کی پُراسرار حرکات کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے

محسوس کیا کہ وہ کچھ پریشان سا ہے، لیکن مجھے پریشانی کا سبب معلوم کرنے کا کوئی راستہ نہیں سوجھ رہا تھا اور ویسے بھی پرسنل سیکرٹری پر ہاتھ ڈالنے کا اختیار نہ تھا۔ سوچ سوچ کر مسٹر چرچل سے اس کا ذکر کیا۔ ان کی کشادہ پیشانی پر غور و فکر کی لکیریں نمودار ہوئیں۔

"تمہیں یقین ہے کہ وہ شخص کچھ گڑ بڑ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟"

انہوں نے پوچھا۔

"جناب، مجھے "یقین" ہوتا، تو میں آپ سے ذکر کرنے کی ضرورت نہ سمجھتا اور اس معاملے کو بالا ہی بالا نمٹا دیتا، مجھے صرف "شک" ہے کہ وہ جرمنوں سے مل گیا ہے اور کسی شرارت پر تلا ہوا ہے۔"

"شک کی بناء پر کوئی کارروائی کرنا درست نہ ہوگا پیارے تھامپسن۔" یہ ان کی مخصوص ادا تھی۔ وہ رسمی طور پر مجھے پکارتے، تو تھامپسن کہتے، لیکن جب تنبیہہ کرتے، تو تھامپسن سے پہلے "پیارے" ضرور کہتے تھے۔

"تم جانتے ہو کہ وہ شخص بے قصور نکلا، تو یہ معاملہ کس حد تک بڑھ سکتا ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ سے ہماری کانفرنس ہی ناکام ہو جائے اور یہ جرمنوں کی بڑی کامیابی ہوگی۔ میں تمہیں کوئی ایکشن لینے کی اجازت نہ دوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ غسل خانے میں چلے گئے۔

اگلے روز یعنی ۳۰ نومبر کو چرچل کی انہترویں (۶۹) سالگرہ تھی اور وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ سالگرہ کی تقریب پورے وقار اور شان و شوکت سے منائی جائے گی۔ مہمانوں کی کل تعداد ۳۴ تھی اور ان میں وہ پرسنل سیکرٹری بھی شریک تھا۔ میں نے مسٹر چرچل سے درخواست کی کہ فہرست میں سے اس شخص کا نام کاٹ دینا چاہیئے۔

"تھامپسن، اس شخص کو تو ضرور آنا چاہیئے۔ اگر وہ بری نیت رکھتا ہے، تو یہ اس کے لئے بہترین موقع ہوگا۔ سب مہمان تحفے لے کر آئیں گے، ممکن ہے وہ بھی کوئی تحفہ لے کر آئے۔"

مسٹر چرچل کے منہ سے نکلے ہوئے جملے کے آخری حصّے نے مجھے چونکا دیا اور میں بے صبری سے آنے والے وقت کا انتظار کرنے لگا۔ ڈنر سے پہلے کاک ٹیل پارٹی ہوئی جس میں سب نے شرکت کی۔ سٹالن اپنے ترجمان مسٹر پالوف کی مدد سے ہر مہمان کے پاس گیا اور گھل مل کر باتیں کیں۔ میں ایک گوشے میں کھڑا پرسنل سیکرٹری پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ اس کا چہرہ متغیر تھا اور وہ بار بار اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اِدھر اُدھر دیکھتا۔ چرچل کو ملنے والے تحائف میز پر رکھے تھے۔

ڈنر کا وقت ہوا، تو مسٹر چرچل اپنے مہمانوں کو لے کر ڈائننگ ہال کی طرف بڑھے۔ پرسنل سیکرٹری چند لمحوں کے لئے رُکا اور پھر مڑ کر اس نے اپنی جیب سے خوبصورت سا پارسل نکالا، اسے میز پر رکھا اور تیزی سے ڈائننگ ہال میں داخل ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے وہ پارسل اٹھایا، اپنے ایک ماتحت کو پرسنل سیکرٹری کی نگرانی کا حکم دے کر میں جلدی سے دوسرے کمرے میں گیا اور پارسل کھولا، تو اس کے اندر گھڑی رکھی تھی۔ میں نے گھڑی کو الٹ پلٹ کر دیکھا، اسے کھولا، تو کوئی مشکوک بات معلوم نہ ہوئی۔ خاصی قیمتی گھڑی تھی۔ ڈائننگ ہال سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یکایک ایک خیال بجلی کی مانند میرے ذہن میں آیا میں نے گھڑی اسی پارسل میں بند کی۔ اسے دوبارہ میز پر رکھا اور ڈائننگ ہال کی طرف لپکا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ سب مہمان ایک لمبی میز کے گرد جمع ہیں جس پر بہت بڑا کیک رکھا ہے اور اس کیک پر ۶۹ موم بتیاں روشن ہیں۔ مسٹر چرچل کے دائیں بائیں جو مہمان کھڑے ہیں، ان میں صدر روز ویلٹ، مسٹر ایورل ہیری مین اور وزیراعظم کی بیٹی مس سارہ چرچل شامل ہیں۔ مجھے اطمینان تھا کہ سیکرٹری ان آدمیوں کی موجودگی میں مسٹر چرچل کو نقصان نہ پہنچا سکے گا، تاہم اس کی نگرانی ضروری تھی۔

کیک کاٹنے کی رسم ادا کرنے کے بعد سب لوگ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنے اپنے گلاس اٹھا لئے، مسٹر چرچل نے ایک نظر مہمانوں پر ڈالی، اپنی جگہ سے

اٹھے اور کہنے لگے۔

"اس تقریب میں آپ حضرات کی شمولیت سے میری جو عزت افزائی ہوئی ہے، اس کا دلی خلوص سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ خاص طور پر اپنے دو عظیم دوستوں، مارشل سٹالن اور صدر روزویلٹ کا بیحد ممنون ہوں کہ وہ اپنا قیمتی وقت صرف کرکے یہاں تشریف لائے"۔

چند لمحے چپ رہنے کے بعد مسٹر چرچل اسٹالن کی طرف متوجہ ہو کر انتہائی جذباتی انداز میں بولے۔

"میں تمہیں جوزف کہہ کر پکارتا ہوں اور تم بھی مجھے ونسٹن کہتے ہو۔ میں تمہیں اپنا بہترین دوست سمجھتا ہوں اور برطانوی عوام کی طرف سے آپ کا جام صحت تجویز کرتا ہوں ـــــ مارشل سٹالن عظیم شخصیت ہے۔ بہت عظیم ـــــ"

مارشل سٹالن اپنی نشست سے اٹھ کر چرچل کے قریب گیا۔ دونوں نے گلاس ٹکرائے، پھر سٹالن نے کہا:

"میں روسی عوام کی طرف سے برطانیہ اور امریکہ کی دوستی کا ہاتھ آپ کی طرف بڑھاتا ہوں۔ ہم اس دنیا میں گہرے دوستوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ برطانیہ اور امریکہ اپنے عمل سے یہ ثابت کریں کہ وہ ہمارے دوست ہیں"۔

یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر اپنا گلاس چرچل کے گلاس سے ٹکرایا اور ہاتھ بلند کرکے گرجدار لہجے میں کہا۔

"میں اپنے "لڑاکا دوست" کی سالگرہ کا جام تجویز کرتا ہوں"۔

مسٹر چرچل ایک بار پھر اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوئے۔ اس مرتبہ ان کا خطاب روزویلٹ سے تھا۔

"جناب صدر، ہماری آپ کی دوستی صدیوں پرانی ہے، لیکن اس جنگ

نے ہمیں نہ ٹوٹنے والے رشتے میں باندھ دیا ہے۔ میں برطانوی قوم کی جانب سے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم ہر حال میں آپ کے ساتھ ہیں اور ہم آپ کی دوستی کی قدر کرتے ہیں۔ دونوں قومیں ایک دوسرے کے جذبات کو سمجھتی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ہم ہزار ہا سال تک ایک دوسرے کے قدم بہ قدم سفر طے کریں گے۔" روزویلٹ نے جواب میں کہا:

"آج میرے پرانے اور مایہ ناز دوست ونسٹن چرچل کی انہتّرویں سالگرہ ہے۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ ونسٹن چرچل دنیا کی ان شخصیتوں میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں جو بچپن ہی سے "عظیم" ہوتی ہیں، بشرطیکہ ان کے ابتدائی نو سال شمار نہ کیے جائیں۔" اس جملے پر مہمانوں نے قہقہے لگائے۔

روزویلٹ کا اشارہ یہ تھا کہ مسٹر چرچل بچپن میں نہایت کند ذہن اور غبی سمجھے جاتے تھے اور اپنی جماعت میں سب سے پچھلی نشست پر بیٹھتے تھے اور استادوں نے ان کی ذہانت کے بارے میں بار بار مایوسی کا اظہار کیا تھا۔ روزویلٹ نے پھر تقریر شروع کی:

"ونسٹن نے آج اپنی عمر کے ۶۹ سال بخیر و عافیت پورے کر لئے ہیں یہ ان کی بڑی خوش نصیبی ہے۔ (قہقہے) چرچل اور سٹالن ہمارے دوست ہیں اور امریکی عوام کو ان کی دوستی پر فخر ہے۔"

تالیوں کی بے پناہ گونج میں صدر روزویلٹ اٹھ کر پہلے چرچل اور پھر سٹالن کے پاس گئے اور تینوں نے ایک دوسرے سے گلاس ٹکرائے۔ اس کے بعد مسٹر انتھونی ایڈن نے (جو بعد میں برطانیہ کے وزیر اعظم بنے) مسٹر مالوٹوف کا جام صحت تجویز کیا۔ شراب کا انتظام مسٹر چرچل کے خاص بٹلر مسٹر فرینک سویرز کے سپرد تھا۔ اس نے اپنے حسنِ انتظام اور عمدہ شراب سے مہمانوں کا دل موہ لیا۔ ایک مرتبہ جب وہ مہمانوں کے گلاس پر کرتا ہوا سٹالن کے پاس پہنچا تو سٹالن نے اسی کا جامِ صحت تجویز کر دیا اور یہ ایسا اعزاز تھا کہ اس سے پہلے سفارت خانے کے کسی برطانوی ملازم کو نہیں ملا۔

تقریب اپنے عروج پر اس وقت پہنچی جب مہمانوں نے کھانے کی میز پر دھاوا بول دیا۔ میں نے دیکھا کہ سٹالن کے مسلّح محافظ پوری طرح چوکنّے اور باخبر ہیں، انہوں نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنے لیڈر کو تنہا چھوڑنا پسند نہیں کیا۔ کبھی کبھی وہ آپس میں سرگوشیاں بھی کرتے تھے۔ کوئی آواز میرے کان میں کہہ رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ میں نے پرسنل سیکرٹری کی طرف دیکھا اس کا دھیان کھانے کی طرف نہیں تھا وہ بار بار سر کھجا کر کچھ سوچنے لگتا۔ یکایک میں نے محسوس کیا کہ وہ ہال کمرے کے آخری دروازہ کے قریب بہت دیر سے بیٹھا ہے، حالانکہ قاعدے کے مطابق وہاں اس کی نشست نہیں ہونی چاہیئے۔ میں نے دل میں کہا۔ تھامسن، چپ چاپ کھڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں، یہ تمہارے لیڈر کی زندگی کا سوال ہے، اگر اسے کچھ نقصان پہنچا، تو تم اپنی قوم کو منہ نہ دکھا سکو گے۔ میں آہستہ آہستہ بے پروائی سے چلتا ہوا پرسنل سیکرٹری کی طرف بڑھا۔ میں اس سے پانچ سات فٹ کے فاصلے پر تھا کہ سٹالن نے کچھ کہا جس کا انگریزی ترجمہ روسی ترجمان پالوف نے کیا۔ ابھی وہ بول ہی رہا تھا کہ ہال کمرے کا جنوبی دروازہ کھلا اور ایک ویٹر ہاتھوں میں بڑی سی ٹرے اٹھائے نمودار ہوا۔ ٹرے میں پڈنگ آئس کریم کے بھرے ہوئے کپ رکھے تھے۔ یکایک وہ لڑکھڑایا جیسے اس کا پیر پھسلا ہو، پھر وہ دھڑام سے وزنی ٹرے سمیت پالوف پر جا گرا اور پالوف کے کپڑے اور چہرہ آئس کریم سے لت پت ہو گئے۔ سب لوگ ویٹر کے گرنے کی آواز سن کر ادھر دیکھنے لگے اور پالوف کا حلیہ دیکھ کر کئی زور زور سے ہنسے، یکایک ہال میں گھپ اندھیرا چھا گیا اور اس کے ساتھ ہی کوئی شخص چلّایا۔

"ویٹر کو پکڑو۔"

چند ثانیوں کے لئے ہال میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پھر گولی چلی، برتنوں کے گرنے اور ٹوٹنے کی آوازیں اور مہمانوں کا غل غپاڑہ۔ میرا جسم پتّھر ہو گیا۔ اتنے میں چاروں طرف سے ٹارچیں روشن ہو گئیں۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وزیر اعظم محفوظ ہیں۔ صدر روزویلٹ اور سٹالن کو بھی ان کے باڈی گارڈ گھیرے میں لئے کھڑے ہیں۔ پرسنل سیکرٹری

ایک کرسی پر گرا ہوا تھا اور ایک نظر دیکھتے ہی پتا چل گیا کہ وہ مر چکا ہے۔ گولی اس کے سر میں لگی تھی اور گاڑھا گاڑھا خون اس کی کھوپڑی سے مسلسل نکل رہا تھا۔ پستول ایک کرسی کے نیچے پڑا ہوا تھا۔

ویٹر اوندھا پڑا تھا۔ اس کا جسم برف کی مانند سرد تھا۔ تینوں لیڈروں کو فوراً دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ اب ہم نے اس ٹرے کا جائزہ لیا، تو اس کے نیچے ایک بٹن دکھائی دیا۔ بٹن دبانے سے ٹرے کا نچلا حصّہ کھل گیا۔ اس کے اندر ایک چھوٹا سا ٹائم بم لغب تھا جس کے ساتھ لگی ہوئی ننھی سی گھڑی کی سوئی بارہ کے ہندسے پر رُکی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی، بارہ بجنے میں تین منٹ باقی تھے۔ گھڑی میں سے ٹک ٹک کی آواز آ رہی تھی۔ ہم نے اس کا میکنزم کھول کر ٹائم بم اسی وقت بیکار کر دیا۔ بعد میں ہمارے ماہرین نے بتایا کہ اگر یہ بم بروقت چل جاتا، تو اس کمرے کا کوئی شخص زندہ نہ بچتا۔

ان چونتیس مہمانوں میں سے کس شخص نے پرسنل سیکرٹری کو گولی ماری۔ یہ معمّہ آج تک لاینحل ہے۔ تاہم یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ وہ کوئی نازی ایجنٹ تھا۔ ویٹر کی گردن میں سوئی چبھی ہوئی پائی گئی جو بہت باریک اور تقریباً آدھ انچ لمبی تھی۔ یہ سوئی زہر میں بجھی ہوئی تھی۔

اگلے روز پریس کانفرنس تھی جسے تینوں لیڈر خطاب کرنے والے تھے، لیکن اس حادثے کے پیشِ نظر ہم لوگ بہت محتاط ہو گئے تھے۔ پریس کے رپورٹروں کی سختی سے تلاشی لینے کے بعد انہیں کمرے میں بٹھایا گیا اور ہر رپورٹر کے سر پر ایک مسلّح سپاہی متعین تھا۔ چرچل نے اس روز میری فرمائش پر ایر کموڈور کی وردی پہنی اور تصویریں اتروائیں۔

تہران سے ہمیں ایک بار پھر قاہرہ اور وہاں سے تیونس جانا تھا۔ جنرل آئزن ہاور ان دنوں تیونس میں تھے اور مسٹر چرچل سے ملنا چاہتے تھے۔

تہران کے برطانوی سفارت خانہ سے روانہ ہوتے وقت میں نے ایک انوکھی تدبیر سوچی۔ میں نے مسٹر چرچل کی کاریں ان کے پورے حفاظتی دستے کے ساتھ ایک سیکورٹی

افسر کو ہوائی اڈے پر بھیج دیا اور خود مسٹر چرچل کے ساتھ ایک پرانی کار میں بیٹھا۔ اس کار کی چھت پر میں نے دو تین ٹرنک بھی رکھوا دیئے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی ادنیٰ درجے کا برطانوی افسر جا رہا ہے۔ اگرچہ تدبیر آزمانے میں خطرہ بھی تھا، لیکن اس کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا۔ ہماری طرف کسی نے توجہ نہ دی اور ہم بخیریت ہوائی اڈا پر پہنچ گئے۔

صدر روز ویلٹ پہلے ہی قاہرہ پہنچ چکے تھے۔ یہاں دونوں لیڈروں کی پھر ملاقات ہوئی۔ گفتگو میں جنرل سمٹس نے بھی حصہ لیا۔ جنرل کی مسٹر چرچل سے یہ پہلی ملاقات تھی اور وہ ان کی شخصیت سے بے حد مرعوب اور متاثر ہوا۔ اس نے بعد میں مجھ سے کہا۔

"مسٹر چرچل بلاشبہ دنیا کے عظیم آدمی ہیں اور مسٹر تھامپسن، تمہیں فخر کرنا چاہیئے کہ تم ان کے محافظ ہو۔"

تیونس جانے کے لئے جب ہم طیارے میں سوار ہو رہے تھے، تو میں نے محسوس کیا کہ مسٹر چرچل بہت زیادہ تھکے ہوئے ہیں۔ ان کا چہرہ پژمردہ نظر آ رہا تھا اور وہ بیمار پڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ میں نے ان کے ذاتی معالج لارڈ موران کو بتایا کہ وزیر اعظم بیمار ہیں، تو اس نے یقین نہ کیا اور کہا کہ یہ صرف تھکن ہے اور کچھ نہیں، لیکن تیونس پہنچتے پہنچتے مسٹر چرچل کی حالت اور خراب ہو گئی۔ وہ سیدھے آئزن ہاور کی قیام گاہ پر گئے اور بستر پر لیٹ کر کئی گھنٹے تک سوتے رہے۔ اسی دن لارڈ موران نے ان کا طبی معائنہ کیا، تو پتا چلا کہ مسٹر چرچل پر نمونیے نے حملہ کیا ہے اور اب انہیں مکمل آرام کرنا ہوگا، لیکن مسٹر چرچل ایسے آدمی نہ تھے کہ قوم کو ابتلا میں چھوڑ کر خود آرام کرنے بیٹھ جاتے۔ وہ دن بھر کاغذات دیکھتے رہے اور بعض ضروری پیغامات بھجواتے رہے۔ رات کو ان کی طبیعت اور زیادہ بگڑ گئی۔ لارڈ موران نے اب اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر ایک سخت مزاج معالج کی حیثیت اختیار کر لی اور مسٹر چرچل کو سمجھایا کہ انہیں اپنے لئے نہیں، ملک اور قوم کی خاطر آرام کرنا چاہیئے۔ اس جذباتی اپیل کا ان پر اثر ہوا۔ اور وہ "شکریہ" کہہ کر بستر پر لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ ذاتی ملازموں کے علاوہ باہر کے

کسی ڈاکٹر پر اعتماد نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے مس سارہ چرچل نے اپنی اور میری یہ ڈیوٹی لگائی کہ باری باری مسٹر چرچل کی نگرانی کریں گے۔

رات گیارہ بجے مس سارہ چرچل مجھے اپنے والد کے پاس چھوڑ کر آرام کرنے چلی گئیں۔ مسٹر چرچل گہری نیند سو رہے تھے۔ ان کے سانس لینے کی آواز مجھے بخوبی سنائی دے رہی تھی۔ انہیں نیند میں خراٹے لینے کی پرانی عادت تھی۔ میں ایک کتاب لے کر بیٹھ گیا اور پڑھتا رہا۔ مسٹر چرچل کے خراٹوں کی آواز میرے کمرے میں برابر گونجتی رہی۔ نہ جانے کس وقت مجھ پر غنودگی سی طاری ہو گئی اور آنکھ یکایک اس وقت کھلی، جب کمرے میں بھیانک خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ مسٹر چرچل کے خراٹے بند ہو چکے تھے اور سانس لینے سے ان کے جسم میں زیر و بم کی جو کیفیت پیدا ہو رہی تھی وہ بھی زائل ہو چکی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میری روح کھینچ کر کلیجے میں سمٹ آئی ہے۔ سب سے پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ وزیراعظم ختم ہو گئے۔ میں نے کرسی سے اٹھنا چاہا، لیکن اعضا نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ چیخنے کی کوشش کی، مگر آواز حلق سے نہ نکلی۔ اس روز جیسی میری حالت ہوئی، اس سے پہلے، نہ آئندہ کبھی سابقہ پڑا۔ میرا جسم پسینے میں نہا گیا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے چرچل کے بستر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے یکایک ہوش آیا، میں لپک کر بستر کے قریب پہنچا اور مسٹر چرچل کے تکیے پر جھک کر آواز سننے کی کوشش کی۔ وہ بہت آہستہ آہستہ سانس لے رہے تھے۔ میں دوڑتا ہوا لارڈ موران کے کمرے میں پہنچا اور انہیں یہ خبر سنا کر بدحواس کر دیا کہ وزیراعظم کی نبضیں رک گئی ہیں۔ لارڈ موران اٹھے اور ننگے پیر دوڑتے ہوئے مسٹر چرچل کے کمرے میں آئے اور معائنہ کرنے کے بعد کہنے لگے۔

"بندۂ خدا تم نے تو مجھے ڈرا دیا۔ مسٹر چرچل اب اچھی طرح سانس لے رہے ہیں آپ براہ کرم باہر تشریف رکھیے۔"

میں شرمندہ ہو کر باہر چلا آیا اور دروازے کے قریب کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ لارڈ موران پانچ منٹ بعد باہر نکلے اور "شب بخیر" کہہ کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

آدھ گھنٹے بعد کمرے میں سے کھڑ بڑ کی سی آواز سنائی دی۔ میں فوراً اندر گیا۔ کیا

دیکھتا ہوں کہ مسٹر چرچل ڈریسنگ ٹیبل کے پاس کھڑے درازیں کھول کر کچھ تلاش کر رہے ہیں۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر وہ مڑے، ان کی آنکھیں سُرخ اور بوجھل تھیں۔

"تھامپسن، خواب آور گولیاں کہاں رکھی ہیں؟"

ڈاکٹر نے منع کر رکھا تھا کہ مسٹر چرچل کو خواب آور گولیاں ہرگز نہ دی جائیں، اسی لئے گولیوں کا پیکٹ دراز میں نہ تھا۔

"جناب، لارڈ موران نے گولیاں استعمال کرنے کی ہدایت نہیں کی۔ آپ کی صحت کے لئے یہ گولیاں مضر ہیں۔"

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور بستر پر لیٹ کر معصوم بچے کی طرح آنکھیں بند کر لیں۔

کئی روز تک ان کی طبیعت کا یہی عالم رہا۔ اس دوران میں جنرل آئزن ہاور کئی مرتبہ وزیر اعظم کی عیادت کے لئے آئے اور انہوں نے اپنے خصوصی معالجوں کو مسٹر چرچل کا طبّی معائنہ کرنے کی ہدایات کیں اور تیمارداری کے لئے قابلِ اعتماد نرسیں مقرر کیں۔

کرسمس کے دن ہم نے تیونس ہی میں گزارے اور جب مسٹر چرچل کی صحت قدرے درست ہوئی، تو ہم ہوائی جہاز کے ذریعے مراکش روانہ ہوئے۔ رائل ایئر فورس کا ایک ڈاکٹر آکسیجن وغیرہ لے کر ہمارے ساتھ گیا اور ہم نے سات ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کی۔ مراکش میں ایک ہفتہ قیام کے دوران ہم نے مسٹر چرچل کو دماغی کام کرنے کا موقع نہ دیا، بلکہ تفریح کے پروگرام بناتے رہے۔ یہاں سے ہم جبل الطارق پہنچے اور بحر یہ کے ایک جہاز میں سوار ہو کر وطن کی طرف چل پڑے۔ قوم نے اپنے وزیر اعظم کا جس جوش وخروش اور والہانہ انداز میں استقبال کیا، اس سے چرچل بے حد متاثر ہوئے۔ میں نے

بارہا ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے اور کئی مرتبہ تو وہ فوجی دستوں کی سلامی لیتے ہوئے بچوں کی طرح بلبلا کر روئے۔ قوم اور فوج سے ان کی محبت بے پناہ تھی۔ ۱۹۴۴ء چرچل کی زندگی میں بے حد مصروفیت کا سال تھا۔ رات کو دو یا تین گھنٹے سونے کے علاوہ انہوں نے بیس بیس گھنٹے روزانہ کام کیا۔ دورے، تقریریں، ملاقاتیں، معائنے، تصنیف و تالیف غرض یہ کہ ان پر کام کرنے کا جنون سوار تھا۔

۱۲ اپریل ۱۹۴۵ء کا دن میں کبھی نہ بھول سکوں گا۔ صبح کے تین بجے تھے۔ میرے کمرے

میں لگی ہوئی گھنٹی بجی۔ اس گھنٹی کا بٹن مسٹر چرچل کے کمرے میں تھا۔ میں حواس باختہ ہوکر ان کے کمرے میں داخل ہوا، تو دیکھا کہ وہ رو رہے ہیں اور ایک ہی لفظ ان کی زبان سے بار بار ادا ہو رہا ہے:

"اُف ..... اُف .....،"

مجھے دیکھ کر وہ چپ ہوئے، شدّتِ جذبات سے ان کا جسم کانپ رہا تھا، میں نے ان کی ایسی حالت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا:

"تھامپسن، تمہیں معلوم ہے صدر روزویلٹ انتقال کرگئے۔"

مجھے دھچکا سا لگا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ صبح کے تین بجے مسٹر چرچل مجھے یہ اندوہناک خبر سنائیں گے۔

وہ دیر تک اپنے پرانے اور عزیز دوست روزویلٹ کو یاد کرکے آنسو بہاتے رہے اور آخر میں انہوں نے یہ کہہ کر مجھے چونکا دیا:-

"تھامپسن، جانتے ہو آج کیا تاریخ ہے؟ تیرہ .....،"

شاید بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ مسٹر چرچل بھی ۱۳ کا عدد بہت منحوس سمجھتے اور اس معاملے میں اپنے ہم قوموں کی پیروی کرتے تھے۔ مجھے بہت سے دل چسپ واقعات یاد ہیں جو "چرچل کی تیرہ تاریخ" کے عنوان سے قلم بند کئے جاسکتے ہیں۔ اگرچہ تیرہ کا عدد خود چرچل کے لئے کبھی منحوس ثابت نہ ہوا لیکن اُن کے دل و دماغ پر ابتدا ہی سے ہیبت طاری تھی۔ وہ تیرہ تاریخ کو کوئی نیا منصوبہ نہ بناتے۔ سفر کرنے سے پرہیز کرتے اور اس روز تیرھویں ملاقاتی کو اپنے پاس آنے کا موقع نہ دیتے۔ جس ہوائی جہاز میں سفر کرتے یا محفل میں جاتے تو دیکھ لیتے کہ وہاں تیرہ کا عدد تو موجود نہیں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ قاہرہ میں جس روز صدر روزویلٹ کے ہمراہ اہرام دیکھنے گئے۔ تو ہماری جماعت میں تیرہ افراد شامل تھے۔ چرچل نے محافظوں میں سے فوراً ایک آدمی کو خارج کر دیا۔

وہ سگار پینے کے بے حد عادی تھے، حتیٰ کہ سگار چرچل کی خاص علامت (SYMBOL) بن گیا ہے۔ دن بھر میں نہ جانے کتنے سگار پی جاتے، لیکن تیرہ تاریخ کو وہ بارہ سگار گن

کر اپنے پاس رکھتے اور پورا دن انہی سگاروں سے شغل کرتے۔ تیرھواں سگار انہوں نے کبھی نہیں سلگایا۔

مسٹر چرچل اپنی بے پناہ عظمت اور عبقریت کے باوجود زمانۂ قدیم کے باوضع اور با اصول انگریزوں کی سچی تصویر تھے۔ اُن میں بیک وقت کئی شخصیتیں جمع ہوگئی تھیں۔ سپاہی سیاست دان، مُدبّر، فلسفی، ادیب، مؤرخ، اخبار نویس، مصوّر اور رہنما۔

بعض اوقات مَیں سوچتا ہوں کہ اگر ہماری قوم میں چرچل کا وجود نہ ہوتا، تو شاید ہم کرۂ سے نابُود ہو جاتے۔ اِس ایک شخص نے برطانوی قوم کو تباہی سے بچایا۔ کیا ایسی شخصیت پھر کبھی ہمارے ہاں پیدا ہوگی؟۔

خونیں داستان

رات نہایت تاریک اور پُرسکون تھی۔ دُور سے کتّوں کے بھونکنے اور مویشیوں کے ڈکرانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اُن کے مالک انہیں چھوڑ کر کہیں جا چکے تھے، ہم شمالی فرانس کے ایک محاذ پر اپنے مورچوں میں گُم سُم بیٹھے تھے، کئی روز سے یہ خبر گرم تھی کہ دشمن عنقریب ایک بھرپور حملہ کرنے والا ہے، ہم اپنی اپنی بندوقیں تھامے، پھٹی پھٹی نگاہوں سے کسی نئے حادثے کے منتظر تھے۔ جرمن فوج، فرانسیسی، برطانوی اور بلجیم افواج کو تین اطراف سے گھیرے میں لے چکی تھی۔ دشمن اُن پر برابر دباؤ ڈال رہا تھا اور وہ گزشتہ کئی روز سے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہے تھے۔

ہر محاذ سے اتحادیوں کی شکست کی خبریں پہنچ رہی تھیں، لمحہ بہ لمحہ پسپائی ناگزیر ہوتی جا رہی تھی۔ آخر کار ۲۶ مئی ۱۹۴۰ء کو برطانوی وزیر جنگ انتھونی ایڈن نے فوجی دستوں کو ساحل کی طرف سمٹنے کا حکم جاری کر دیا، لیکن اس وقت تک جرمن فوجیں برطانوی فوج کو گھیرے میں لے چکی تھیں۔ ان حالات میں پسپائی بھی دیوانے کا خواب بن کر رہ گئی۔ ڈنکرک سے برطانوی سپہ سالار جنرل وائیکاؤنٹ گورٹ، وزیر جنگ کو مطلع کر چکا تھا کہ برطانیہ کو اس مہم میں اپنی فوج کے بیشتر سپاہیوں اور اسلحہ سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

اگلے روز ایک محاذ پر جنرل وائیکاؤنٹ اپنے ماتحت فوجی افسروں سے کہہ رہا تھا۔

"مَیں تو سوچ رہا تھا کہ مجھے ایک ایسی مہم میں برطانوی فوج کی نمائندگی کرنی پڑے

گی جو تاریخ عالم میں ایک ذلت آمیز شکست کے نام سے لکھی جائے گی۔"

گزشتہ آٹھ ماہ کی مدت میں جنرل گورٹ کی فوج کے چار لاکھ سپاہیوں میں سے ایک چوتھائی ابدی نیند سو چکے تھے۔ برطانوی فوج نے ڈنکرک میں دو سو پچاس میل لمبے محاذ پر چار پانچ سو کنکریٹ کی خندقیں اور مورچے بنا رکھے تھے اور سپاہی کئی ماہ سے اِن مورچوں میں بیٹھے جرمنوں کی طرف سے حملے کے منتظر تھے۔

۱۰ رمئی کو دوسری عالم گیر جنگ نے اچانک ایک خطرناک رُخ اختیار کیا۔ جرمنی کی ایک سو سترھویں پیادہ فوج، دسویں بکتر بند ڈویژن کی مدد سے غیر جانب دار ملک ہالینڈ میں داخل ہوگئی۔ اِس کے بعد جرمن فوجیں بڑی تیزی کے ساتھ لکسمبرگ اور بلجیئم کی طرف پیش قدمی کر رہی تھیں۔ چند روز بعد جرمنی کے ساتویں ٹینک ڈویژن نے فرانسیسی فوج پر حملہ کر دیا اور سیڈان کے مقام پر فرانسیسی فوج کی صفوں کو چیرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ یورپ کے مدبّر اور سیاست دان سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ پہلے ہی معرکے میں اتحادیوں کی صفوں میں نقب لگ جائے گی۔

دوسری طرف سے برطانوی دستوں نے پیش قدمی شروع کر دی اور بلجیئم کو عبور کرتے ہوئے برسلز تک جا پہنچے۔ برطانوی اور فرانسیسی افواج کو پہلی عالم گیر جنگ کا قرضہ چکانے کے لئے جدید ترین اسلحہ سے لیس کیا گیا تھا۔ جنرل گورٹ کا خیال تھا کہ اس مہم میں برطانوی سپاہی بڑے بڑے کارنامے سر انجام دیں گے۔ لیکن اِس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا اور اتحادیوں کی تمام اُمیدیں ریت کی دیواریں ثابت ہوئیں۔ برطانوی اور فرانسیسی ٹینک اور توپیں کسی صورت میں بھی جرمن اسلحے کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔

دس دِنوں کے اندر اندر جرمن فوج، بلجیئم کو تین محاذوں پر شکست دے چکی تھی۔ بلجیئم کی فوج کا اسلحہ و بارود اور بندوقیں سو سال پُرانی تھیں، اسی لئے اُن کی صفوں میں جلد ہی پھوٹ پڑ گئی۔ دوسری طرف جرمن ٹینک، فرانس میں داخل ہو چکے تھے۔ اب جرمن فوج کا رُخ کیلے کی بندرگاہ کی طرف تھا۔ برطانوی دستے بھی کئی محاذوں پر پسپا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ حالات روز بروز سنگین صُورت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ گورٹ اپنی

فوج کے بچے کھچے سپاہیوں کو واپس انگلستان پہنچانا چاہتا تھا۔ یہ سپاہی مادرِ وطن کے جاں بازوں میں شمار ہوتے تھے۔ گورٹ کی ساری اُمّیدیں ڈنکرک کی بندرگاہ سے وابستہ تھیں، لیکن تمام سپاہیوں کا وہاں صحیح سلامت پہنچ جانا ممکن نظر نہیں آرہا تھا۔

ہاذ بتم کے جنوب میں ہماری چالیسویں پیادہ فوج مسلسل پسپا ہو رہی تھی۔ لانس کارپورال جان لنٹن اس دستے کی نمائندگی کر رہا تھا۔ اِس کے سپاہیوں کو ہر روز بیس پچیس میل کے فاصلے پر نئی خندقیں کھودنی اور خالی کرنی پڑتیں۔ ہر محاذ پر وہ چلاّتا، "دوستو، جلدی کرو، جرمن ہمارے پیچھے پیچھے آرہے ہیں۔ جو پیچھے رہ جائیں یا زخمی ہو جائیں، اِن کی پرواہ مت کرو۔"

ایک فوجی افسر جو درد گُردہ سے بلبلا رہا تھا۔ اُسے وہ لوگ پہلے محاذ ہی پر چھوڑ آئے تھے۔ رونک کے مقام پر جو برطانوی فوج متعیّن تھی، اس کے کپتان ہیرس نے اتوار کی رات کے آخری پہر واپسی کا حکم دے دیا۔

"ہر محاذ پر جرمنوں کو فتح نصیب ہو رہی ہے۔ میرے خیال میں ہمیں واپس انگلستان چلے جانا چاہیئے تاکہ جب موقع ملے ہم پھر اپنے سپاہیوں کو فرانس کی سر زمین پر اُتار سکیں۔"

تھوڑی دیر بعد واپسی کا بگل بجا تو برطانوی جاں بازوں کی ایک لمبی قطار سر جھکائے ساحلِ سمندر کی طرف روانہ ہوئی۔

۲۳ مئی کو جرمن ٹینک اور بکتر بند دستے ڈنکرک کے نواح میں پہنچ گئے۔ جنرل رون سٹیڈ نے برطانوی فوج کو گھیرے میں لینے اور سمیٹنے کا حکم دے دیا۔ اُسی دن ہٹلر بھی جنرل سٹیڈ کے ہیڈ کوارٹر میں پہنچ گیا۔ ڈنکرک کی دلدلی زمین کے پیشِ نظر ٹینکوں کی پیش قدمی ہٹلر نے روک دی۔ لیکن جوں ہی جنرل گورنگ کو معلوم ہوا، اس نے ہٹلر سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کیا اور اس فیصلے پر نظرِ ثانی کی درخواست کی۔ جرمن فوج کے دوسرے افسروں نے بھی اس فیصلے کے خلاف احتجاج کیا۔ تین دن تک اس موضوع پر لے دے ہوتی رہی۔ اِس اثنا میں برطانوی فوجوں کو از سرِ نو اپنی صفیں ترتیب دینے اور خندقیں

کھودنے کا موقع مل گیا۔ آخر کار، ۲۴ مئی کو ہٹلر نے ڈنکرک کے محاذ پر چند ٹینکوں کے استعمال کی اجازت دے دی۔

اب ڈنکرک کا شہر جرمنوں کے رحم و کرم پر تھا۔ دوسری طرف سو میل لمبے محاذ پر برطانوی دستوں میں خوف و ہراس پھیل چکا تھا۔ مغربی یارک کی دوسری رجمنٹ کے چھ سو سپاہی، جو واٹرلو کے شمال میں پسپا ہو رہے تھے۔ اُن پر جرمن طیاروں نے اشتہارات گرائے۔ ان اشتہارات میں برطانوی فوج کو گھوڑے کی نعل کی صورت میں دکھایا گیا تھا۔ میدانِ جنگ کی طرف اُس کی پُشت تھی اور وہ سمندر کی سمت بھاگ رہی تھی۔ اشتہار کی پُشت پر نقشے میں برطانوی دستوں کو تین اطراف سے جرمنوں کے گھیرے میں دکھایا گیا تھا۔ نقشے کے نیچے لکھا تھا۔

"ان حالات میں آپ کے لئے ضروری ہے کہ ہتھیار ڈال دیں۔ ورنہ آپ کا بچ نکلنا ممکن نہیں۔"

برطانوی سپاہیوں نے اشتہارات پڑھنے کے بعد وہیں پھینک دیئے اور انہیں اپنے پاؤں تلے روندتے ہوئے ڈنکرک کی سمت روانہ ہو گئے۔

دوسری طرف برطانیہ کی بحریہ کا کپتان ٹینٹ تباہ کُن جہاز وُلف ہاؤنڈ میں ڈنکرک کی طرف روانہ ہوا۔ برطانوی بندرگاہ ڈوور سے جہاز کو رخصت ہوئے ابھی چند منٹ گزرے تھے، کہ فضا میں جرمن بمبار طیارے نمودار ہوئے۔ ٹینٹ نے جہاز کے عملے کو توپوں کے دہانے کھول دینے کا حکم دے دیا۔ رُودبارِ انگلستان میں یہ معرکہ دو گھنٹے تک جاری رہا۔ آخر کار وُلف ہاؤنڈ ہوائی حملوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

دُور سے ڈنکرک کا شہر دیکھتے ہی ٹینٹ کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی۔ تیل صاف کرنے والی کمپنی سے آگ کے شعلے اور گہرے سیاہ رنگ کے دھوئیں کے بادل فضا میں اُٹھ رہے تھے۔ ایسا دکھائی دے رہا تھا کہ سارا شہر جل رہا ہے۔ بندرگاہ کا نام و نشان مٹ چکا ہے۔ آسمان پر پانچ چھ جرمن لڑاکا طیارے

محوِ پرواز تھے۔ وہ ڈولف ہاؤنڈ کو دیکھتے ہی اس کی طرف جھپٹے، فضا میں غوطہ لگایا، اور بہت سے بم گرانے کے بعد شمال کی جانب نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ خوش قسمتی سے تمام بم جہاز کے اِدھر اُدھر پانی میں جا گرے۔

چھے سات بجے شام ٹیننٹ نے ساحلِ سمندر پر قدم رکھا اور صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے گرد و پیش نگاہ دوڑائی۔ حالات انتہائی پریشان کن تھے۔ لندن اور ڈنکرک کے درمیان ایک ٹیلی فون کے علاوہ باقی سارا سلسلۂ مواصلات خراب ہو چکا تھا۔ ساحلِ سمندر پر متعین برطانوی فوج کے ایک افسر نے بتایا کہ گزشتہ چار گھنٹوں سے جرمن فوجوں نے ڈنکرک کے شہریوں پر پانی بند کر رکھا ہے۔ ایک افسر کی غلطی کے باعث ہماری سو پونڈ وزنی گولہ پھینکنے والی طیارہ شکن توپ تباہ ہو چکی ہے۔ اب ڈنکرک میں جرمن طیاروں کے حملوں کو روکنے کے لئے کوئی چیز نہیں ہے۔ صرف پیر کے دن برطانوی دستوں پر تین ہزار چھوٹے اور پندرہ ہزار بڑے بم گرائے گئے ہیں جس کے نتیجے میں ایک سو پندرہ ایکڑ طویل گودی اور پانچ میل لمبے پشتوں کا نام و نشان مٹ چکا ہے۔ شہر میں ہزاروں مرد، عورتیں اور بچوں کی لاشیں ملبے کے ڈھیروں کے اوپر نیچے پڑی ہوتی ہیں۔ شہر کا مشرقی حصّہ کھنڈروں میں تبدیل ہو گیا ہے۔

ذلّت آمیز شکست کی وجہ سے بیشتر سپاہی بغاوت اور من مانی کارروائیوں پر اُتر آئے تھے۔ تھوڑی دیر تک گم سم کھڑے رہنے کے بعد ٹیننٹ، ڈنکرک میں داخل ہوا۔ ابھی وہ چند قدم دُور گیا تھا کہ مخالف سمت سے سپاہیوں کی ایک ٹولی شہر میں ہُلڑ بازی کرنے کے بعد واپس اپنے کیمپوں کی طرف آ رہی تھی۔ سب نشے میں جھوم رہے تھے اور انہوں نے اپنے کندھوں پر نوجوان عورتیں اُٹھا رکھی تھیں۔ ٹیننٹ کو دیکھتے ہی انہوں نے عورتوں کو کندھوں سے اتار دیا، اور ایک دوسرے کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔

"تم سب کے سب شہر سے باہر ریت کے ٹیلوں پر جمع ہو جاؤ اور پچاس پچاس

کے گروپ میں ساحلِ سمندر کی طرف چل پڑو۔ اپنا اپنا اسلحہ ساتھ لے لینا۔ ممکن ہے ہمارا وطن ہی ہمارا آخری حصار ثابت ہو۔" ٹینینٹ کی آواز بھرّائی ہوئی تھی۔

شام کی سیاہی رات کی تاریکی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ بندرگاہ کی جگہ ملبے کا ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ صرف مشرقی پشتے کا کچھ حصہ جرمن طیاروں کے حملوں کی زد سے بچ سکا تھا۔ اور اس سے بندرگاہ کا کام لیا جا سکتا تھا۔ رات گئے ٹینینٹ نے سب سے قریبی جہاز کو مشرقی پشتے کی جانب آنے کا اشارہ کیا۔

آدھ گھنٹے بعد ایک جہاز رینگتا ہوا مشرقی پشتے کے ساتھ آ لگا۔ سب سے پہلے زخمیوں کو اسٹریچروں پر ڈال کر جہاز میں پہنچایا گیا۔ اُس کے بعد ڈاکٹر اور نرسیں وہاں پہنچ گئیں۔ سپیدۂ صبح نمودار ہوتے ہی یہ جہاز چھ سات سو فوجیوں کو لے کر انگلستان کے لئے روانہ ہو گیا۔

اُسی دن تین بجے سہ پہر وزیرِ اعظم سر ونسٹن چرچل نے لندن میں دارالعوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"معزز ارکانِ ایوان، اس وقت ہم انتہائی نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ مستقبل قریب میں حالات کیا رُخ اختیار کریں۔ اس لئے میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ ہمیں اپنے آپ اور قوم کو سنگین صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کر لینا چاہیئے۔"

چرچل نے جب تقریر ختم کی۔ تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اُسی روز وزیرِ اعظم کی سرکاری رہائش گاہ ۱۰۔ ڈاؤننگ اسٹریٹ میں برطانوی کابینہ کا اجلاس رات گئے تک جاری رہا۔ اجلاس برخاست کرنے سے تھوڑی ہی دیر پہلے چرچل نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ "ڈنکرک میں خواہ جنگ کا نتیجہ ہمارے خلاف ہی کیوں نہ نکلے۔ ہم ہر حال میں جنگ جاری رکھیں گے۔ آخر کار فتح ہماری ہوگی۔"

کابینہ کے ارکان نے وزیراعظم کے فیصلے کو جرآت مندانہ اور قابلِ تحسین قرار دیا۔

ڈنکرک میں دوسرے محاذوں سے بہت حوصلہ شکن خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ بلجیم کے بیشتر باشندے جرمن فوج کی آمد سے پہلے ہی فرار ہو چکے تھے۔ شاہراہیں پناہ گزینوں سے اٹی پڑی تھیں۔ دوسری طرف یہ افواہ گرم تھی کہ بعض چوراہوں پر برطانوی فوجی افسروں کے روپ میں جرمن فوجی ہمارے دستوں کو غلط راستہ بتا رہے ہیں۔ اگلے ڈویژنل ہیڈ کوارٹرز نے اطلاع دی کہ جرمن چھاتہ بردار مذہبی پیشواؤں کے بھیس میں ڈنکرک کے آس پاس اُتر رہے ہیں۔ ان خبروں نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی اور برطانوی دستوں میں مزید خوف و ہراس پھیل گیا۔

ڈنکرک سے ہزاروں سپاہیوں کو انگلستان واپس پہنچایا جا چکا تھا۔ اس کے باوجود بہت سے دستے ساحلِ سمندر پر بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ ان حالات میں کپتان ٹیننٹ نے ایڈمرل ریمزے کو فون پر اطلاع دی کہ ملک کے تمام چھوٹے چھوٹے جہاز اور موٹر لانچیں ڈنکرک بھیج دی جائیں۔

اس دوران میں ایک محاذ پر برطانیہ کے جاں باز سپاہیوں کی ایک بٹالین جرمن جرنیل فان بیک کی ڈویژن سے نبرد آزما تھی۔ جنرل بیک نے کئی بھرپور حملے کئے لیکن پسپا کر دیئے گئے۔ ایک موقع پر پیچھے ہٹتے ہوئے جرمن فوج میں بھگدڑ مچ گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کے بہت سے سپاہی زخمی ہو گئے۔ اس محاذ پر برطانوی فوج کے دستی بم پھینکنے والے سپاہیوں نے کمال ہوشیاری اور مستعدی کا مظاہرہ کیا۔ جب جرمن حملہ آوروں کا دباؤ بڑھ جاتا تو بپھرے ہوئے درندوں کی مانند وہ آگے بڑھ جاتے اور دشمن کو دھکیلتے ہوئے بہت پیچھے تک لے جاتے۔ لیکن اسلحے کا ذخیرہ ختم ہو رہا تھا۔ ہیڈ کوارٹر سے پیغامات اور ہدایات کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ اس لئے سپاہی بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ پر سوار دستے بریگیڈیر سمرسٹ کی ہدایات کے مطابق کرنل براؤن کی کمان میں ہیز بروک کے دفاع کے لئے روانہ کیے گئے تھے۔ اُن کے متعلق کل شام جرمن ریڈیو اعلان کر چکا تھا کہ

اُن کا نام و نشان بھی مٹا دیا گیا ہے۔

ڈنکرک سے چند میل مشرق کی سمت کرنل ہیورتھ ایک چھوٹے سے قصبے کی حفاظت پر متعیّن تھا۔ اس کے بٹالین کے بیشتر سپاہی تھکن اور زخموں سے چوُر تھے۔ اُن میں کچھ ایسے بھی تھے جو اپنا اسلحہ وغیرہ اس سے پہلے محاذ پر چھوڑ آئے تھے۔ ایک روز صبح سویرے وہ اگلے مورچوں میں اپنے سپاہیوں کو ہدایات دے رہا تھا کہ اچانک جرمنوں کی طرف سے ایک گولی آئی اور اس کا سینہ چیرتی ہوئی نکل گئی۔ بریگیڈیر سمرسٹ نے صورتِ حال کی اطلاع ملتے ہی اس بٹالین کو ڈنکرک سے پیچھے ہٹنے کا حکم دے دیا۔ ہیورتھ کے جانشین میجر ایلیٹ نے اپنی کمپنیوں کو بریگیڈیر کے حکم سے مطلع کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ جرمن جنرل کلیٹ ٹینکوں، بھاری توپ خانے اور بکتر بند دستوں کی مدد سے یکے بعد دیگرے کئی برطانوی کمپنیوں کا صفایا کر چکا تھا۔ اگلے مورچوں سے تو کوئی سپاہی بھی نہ بچ سکا۔ اس کے باوجود باقی ماندہ سپاہی ہتھیار ڈالنے کے لئے تیّار نہ تھے۔ جرمن فوج سیلاب کی مانند بڑھتی چلی آرہی تھی۔ تین بجے سہ پہر تک برطانیہ کی پیادہ فوج کا صفایا ہو چکا تھا۔ صرف توپ خانے کے چند سپاہی اپنے نوعمر افسر میجر ایلیٹ کی سرکردگی میں ڈنکرک تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔

ساڑھے تین بجے جرمن سپاہی قصبے میں داخل ہوئے۔ اُن کا توپ خانہ عمارات پر گولے برسا رہا تھا۔ مکانوں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ لوگ اپنے گھروں سے نکل کر دیوانہ وار سڑکوں پر دوڑ رہے تھے۔ چاروں طرف سے چیخ وپکار اور سسکیاں سُنائی دے رہی تھیں۔ دستی بم پھینکنے والا جرمن دستہ مشرق کی طرف سے قصبے میں داخل ہوا۔ اور سینکڑوں عمارتوں کو پیوندِ زمین کرنے کے بعد شہر کے مغربی دروازے سے باہر نکل گیا۔

جرمن فوج تین اطراف سے پیش قدمی کر رہی تھی۔ برطانوی دستے تمام محاذوں پر شکست کھانے کے بعد ڈنکرک کی طرف سمٹ رہے تھے۔ برطانوی فوج کا آخری حصار بھی ٹوٹ چکا تھا۔

ہر روز ہزاروں سپاہیوں کو جہازوں میں سوار کر کے انگلستان بھیج دیا جاتا لیکن ڈنکرک سے ڈوور تک جرمن طیارے ان جہازوں پر بم گرا رہے تھے۔ ہزاروں فوجی اور کئی جہاز غرقاب ہو چکے تھے۔ ان بدنصیب جہازوں میں ویک فل بھی شامل تھا۔

ویک فل کے کپتان نے آب دوزیں، کشتیاں اور بہت سا غیر ضروری سامان جہاز سے نکال دیا تاکہ زیادہ سے زیادہ فوجیوں کو ایک ہی وقت میں سوار کیا جا سکے۔ پہلی بار وہ چھ سو سپاہیوں کو صحیح سلامت برطانوی بندرگاہ پر اُتار آیا۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ ڈنکرک کی سمت دوبارہ روانہ ہوا۔ راستے میں جرمن طیّاروں نے کئی بار اس پر حملے کیے، لیکن وہ بچتا بچاتا اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے میں کام یاب ہو گیا۔

بدھ کی رات کے آخری پہر ویک فل چھ سو چالیس سپاہیوں کو لے کر وطن کے لئے روانہ ہوا۔ رات بڑی تاریک تھی۔ رُودبارِ انگلستان میں پانی کی سطح میں پر سکوتِ مرگ طاری تھا۔ جہاز کے عملے اور برطانوی سپاہیوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں ایڈمرا ریمزے متنبّہ کر چکا تھا کہ کئی جرمن آب دوزیں اور تباہ کُن جہاز رُودبارِ انگلستان میں داخل ہو چکے ہیں۔ جہاز کا کپتان فشر بہت افسردہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے تمام سپاہیوں کو عرشے کے نیچے چلے جانے کا حکم دیا۔ اپنے عملے کو ہدایات دینے کے بعد جہاز کے عرشے پر بنے ہوئے ایک چھوٹے سے چبوترے پر کھڑا ہو گیا۔ اور بڑی دیر تک دور خلا میں گھورتا رہا۔

اچانک پانی کی سطح پر روشنی کی دو لکیریں نمودار ہوئیں جو بڑی تیزی کے ساتھ سیدھی جہاز کی طرف آ رہی تھیں۔ فشر کا رنگ فق ہو گیا۔ اور وہ چیخنے لگا۔ مگر بے سود۔ ایک تارپیڈو جہاز کے عین وسط میں لگ چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے ویک فل ایک دھماکے کے ساتھ دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ چھ سو سے زیادہ فوجی سپاہی، جو نچلی منزل میں تھے، غرقاب ہو گئے تھوڑی دیر بعد ان کی لاشیں پانی کی سطح پر تیر رہی تھیں۔ جہاز ڈوب چکا تھا۔ صرف دنبالہ اور مستولوں کی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ فشر کو سُرنگیں صاف کرنے والے جہاز لمفرٹ کے عملے نے بچا لیا اور کچھ سپاہی بھی تیرتے ہوئے اسی جہاز تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد دو اور تباہ کُن جہاز گرافٹن اور لائڈ بھی ان سے آملے۔ دلھاتی بجے

صبح دو تارپیڈو گرافٹن سے آ ٹکرائے۔ جہاز غرقاب ہونے سے تو بچ گیا لیکن ایک تارپیڈو جہاز کو چیرتا ہوا نکل گیا پینتیس افسر اور بہت سے سپاہی ہلاک ہو گئے۔ افراتفری کے عالم میں لائڈ کے کپتان نے توپوں کے دہانے کھول دینے کا حکم دے دیا۔ اِس کا خیال تھا کہ اس کا ہدف ایک جرمن تارپیڈو بردار موٹر لانچ ہے۔ چند لمحے بعد گرافٹن نے بھی اِسی سمت آگ برسانی شروع کر دی۔ دونوں جہازوں کے افسروں کا خیال تھا کہ وہ ویک فل کو تباہ کرنے والے دشمن کو نیست و نابود کر رہے ہیں، لیکن وہ ایک افسوسناک غلطی کر رہے تھے۔ دونوں اپنے ہی جہاز کمفرٹ پر آگ برسا رہے تھے۔ بدنصیب ویک فل کے وہ مسافر جنہوں نے کمفرٹ میں پناہ لی تھی، نیم برہنہ حالت میں دیوانہ وار جہاز کے عرشے کی طرف لپکے۔

فشر چلّا رہا تھا "خدا کے لئے فائرنگ بند کر دو۔ ہم سب برطانوی باشندے ہیں"۔

توپ کے گولے اِس کے آس پاس گر رہے تھے، وہ بدستور چلّا رہا تھا دوسری طرف سے کسی نے اس کی پرواہ نہ کی، اور اس کی آواز توپوں کی دھنا دھن میں ڈوب کر رہ گئی۔ چند لمحے بعد ایک گولہ فشر کے سینے میں آ کر لگا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ لائڈ کے عملے کے ارکان جب اپنے دشمنوں کو گرفتار کرنے کے لئے دوسرے جہاز کے عرشے پر پہنچے تو اُس وقت انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا جہاز تباہ ہو چکا تھا۔ نچلی منزل، عرشے اور جہاز کی سیڑھیاں لاشوں سے اٹی پڑی تھیں، صرف دو سپاہی زندہ بچے۔

چند گھنٹے بعد ایک چھوٹا سا برطانوی جہاز ڈنکرک کی سمت جا رہا تھا۔ جہاز کے عملے کو ویک فل اور کمفرٹ کے حادثات کی اطلاع مل چکی تھی۔ اِس کا کپتان عرشے پر جنگلے کے قریب کھڑا تھا۔ سپیدۂ صبح نمودار ہو چکا تھا۔ جب یہ جہاز ویک فل کے قریب سے گزرا تو کپتان کو اس کے ڈھانچے میں گھرے ہوئے آدمیوں کی ہلکی ہلکی چیخیں سنائی دیں وہ کانپ اٹھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ اچانک شڑاپ شڑاپ کی آواز سنائی دی۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ پانی کی سطح پر بلبلے اٹھ رہے تھے۔ اور

جہاز کے مستول اور دنبالہ نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

۲۷ رمئی ہی کو پو پھٹنے سے پہلے برطانیہ کی بحریہ کا کپتان ایک ٹیش سرنگیں صاف کرنے والے ایک جہاز میں ڈنکرک سے نو میل کے فاصلے پر لاپانے کے مقام پر پہنچنے میں کام یاب ہو گیا۔ یہاں گورٹ نے اپنا فوجی ہیڈ کوارٹر قائم کر رکھا تھا۔ دھند کی دبیز چادر نے اردگرد کے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ٹیش نے ساحل پر قدم رکھتے ہی لیفٹیننٹ کمانڈر جان سے کہا، "جونی، مجھے تو یہاں کچھ نظر نہیں آ رہا، تم ہی بتاؤ کہ جنرل کا ہیڈ کوارٹر کس طرف ہے۔"

"جناب، جب تک دھند نہیں چھٹ جاتی، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

کچھ دیر بعد جب مشرق سے سورج آہستہ آہستہ نمودار ہوا۔ دھند چھٹ گئی تو دونوں ہکا بکا رہ گئے۔ اُن کے سامنے ہی چند گز کے فاصلے پر برطانوی سپاہی اپنے مورچوں میں بیٹھے تھے۔ ریت کے ٹیلے پر اُن کی قطار بل کھاتے ہوئے سانپ کی مانند دُور تک نظر آ رہی تھی۔ سپاہیوں کے چہروں پر مایوسی کے آثار ہویدا تھے۔ اُن میں کچھ ایسے بھی تھے جن کی وردیاں سمندر کے پانی میں شرابور تھیں۔

تمام برطانوی دستے بڑی بے تابی سے جہازوں اور کشتیوں کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ واپس انگلستان پہنچنے کے لئے قافلوں کی صورت میں یہاں تک آئے تھے ہزاروں فوجی پہنچ چکے تھے۔ اِس کے باوجود تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد اُن کے قافلے مشرقی سمت سے نمودار ہو رہے تھے۔ کوئی سکوٹر پر آیا اور کوئی موٹر سائیکل پر۔ چند سپاہی کوڑا کرکٹ والی گاڑی میں اور ایک میجر ٹریکٹر میں بیٹھ کر وہاں پہنچا تھا۔ پیدل چل کر آنے والوں کی حالت بڑی دگرگوں تھی۔ اِن میں سے بیشتر کے پیروں میں سے خون رِس رہا تھا۔ ایک ڈرائیور رات بھر ایک فوجی گاڑی کی پچھلی بتی کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ جب سپیدۂ صبح نمودار ہوا تو اس سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک جرمن ٹینک رینگ رہا تھا۔ ٹینک پر نازیوں کا نشان دیکھ کر اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی۔ وہ وہاں سے مڑا اور کئی میل تک بھاگنے کے بعد اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔

سڑکوں کے کنارے بکھری ہوئی بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور نوجوانوں کی لاشوں

کو گھیتے اور گدھ نوچ رہے تھے ڈنکرک سے کچھ فاصلے پر ایک جھاڑی میں تین راہباؤں اور پانچ چھ چھوٹے چھوٹے بچوں کی لاشیں نظر آ رہی تھیں۔

ڈنکرک کی پسپائی جدید ترین اسلحے سے لیس برطانوی سپاہ کے ماتھے پر کلنک کے ٹیکے سے کم نہ تھی۔ اس مہم میں وہ فوجی افسر اور سپاہی بھی شریک تھے، جنہوں نے ماضی میں افریقہ اور ایشیا کی مختلف جنگوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے پر تمغے اور انعامات حاصل کیے تھے۔ لیکن جرمن ٹینکوں، بمبار طیاروں، بکتر بند گاڑیوں اور بھاری توپ خانے کے سامنے وہ بالکل بے بس نظر آ رہے تھے۔ جہاں دیدہ فوجی افسر بھی افسردہ تھے، ڈنکرک کا محاذ اُن کے لئے تمغوں اور انعامات کے بجائے ذِلّت اور رسوائی لے کر آیا تھا۔

اسی دن دوپہر کے بعد مشرقی کینٹ کے ساتھ گیارہ برطانوی جہاز لنگر انداز ہوئے اُن کے کچھ فاصلے پر فرانسیسی تباہ کن جہاز مسترل، سارڈو اور سائیکلون کھڑے تھے۔ ساحل کے ساتھ ساتھ دور تک چھوٹی چھوٹی کشتیاں پانی کی سطح پر ہچکولے کھا رہی تھیں۔ آج رات برطانوی دستوں کے انخلا کا کام مکمل ہونے والا تھا۔ سپاہی اپنا اپنا بوریا بستر سمیٹ رہے تھے۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ جنرل فان رشتوفن گزشتہ کئی روز سے ایسے سنہری موقعے کی تاک میں تھا۔ اُس نے ڈنکرک سے پچاس میل کے فاصلے پر ایک زمیندار کے فارم میں اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کر رکھا تھا۔ ایک سو اسّی جدید ترین بمبار طیاروں کی کمان اُس کے سپرد تھی۔

شام کے چار بجے اچانک ہوائی جہازوں کی گڑگڑاہٹ سُنائی دی۔ مطلع تاریک ہو گیا۔ ہوائی حملوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ جرمن طیارے اندھا دُھند بم گرا رہے تھے۔ چاروں طرف گہرے سیاہ رنگ کے دُھویں کے بادل بُلند ہو رہے تھے۔ بموں کے دھماکوں اور زخمیوں کی چیخ پُکار سے کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ بمبار طیاروں کے شور سے سپاہیوں کے دل کانپ رہے تھے۔ وہ دیوانہ وار اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ اِنسانی گوشت کی بوٹیاں ہوا میں اُڑ رہی تھیں اور ہزاروں سپاہی خاک و خون میں تڑپ رہے تھے۔

اب دُھواں بھی قدرے سُرخی مائل ہو چکا تھا۔
جرمن طیارے فضا میں غوطے لگاتے اور بم گراتے ہوئے ڈنکرک سے نو میل دور لاپانے تک جا پہنچتے اور وہاں جنرل گورٹ کے ہیڈ کوارٹر پر بم گرانے کے بعد پھر ڈنکرک کا رُخ کرتے۔ ڈنکرک میں برطانوی فوج کی طیارہ شکن توپ ناکارہ ہو چکی تھی۔ اس لئے ان ہوائی حملوں سے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ برطانوی فضائیہ کے چند ہوابازوں نے اپنے دستوں اور بحری جہازوں کو بچانے کی کوشش کی مگر جرمن طیاروں کے مقابلے میں انھیں خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی۔
مشرقی پُشتے کے قریب سپاہیوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تین جہاز لنگر انداز تھے۔ چند سپاہی ابھی تک بموں سے بچنے بچاتے، کشتیوں میں سوار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک ایک جرمن طیارے نے برطانیہ کے تباہ کن جہاز "گرینیڈ" پر غوطہ لگایا اور یکے بعد دیگرے تین بم گرا دیئے، دو بم سمندر میں جا گرے۔ اور ایک بم جہاز کی چمنی میں جا گرا۔ دوسرے ہی لمحے ایک خوف ناک دھماکہ ہوا۔ جہاز کا عرشہ تازہ خون کے ایک تالاب میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اور اس میں سینکڑوں لاشیں ماہیٔ بے آب کی مانند تڑپ رہی تھیں۔
چند لمحے بعد جہاز سے آگ کے شعلے بلند ہوئے اور تھوڑی ہی دیر میں آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ بظاہر یہ نظر آ رہا تھا کہ جہاز جلد ڈوب جائے گا اور دوسرے جہازوں کے نکلنے کا راستہ بھی بند ہو جائے گا۔ اس اثنا میں کمانڈر جیک کلاڈسٹن نے، جو اس وقت مچھلیاں پکڑنے والے ایک چھوٹے سے جہاز میں سوار تھا۔ اپنے ساتھیوں کی مدد سے جلتے ہوئے جہاز کو رسّوں سے کھینچنا شروع کر دیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ جہاز کو آہستہ آہستہ کھینچتے ہوئے راستہ صاف کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ابھی وہ واپس ہی آ رہے تھے کہ گرینیڈ کے بارود خانے میں آگ لگ گئی۔ دوسرے ہی لمحے سینکڑوں گولیاں تڑاتڑ کرتی ہوئی آسمان کی طرف نکل گئیں۔
شام کے دُھندلکے پھیل رہے تھے لیکن ہوائی حملے بدستور جاری تھے۔ جرمن بمبار پلٹ پلٹ کر حملے کر رہے تھے۔ سمندر میں بم گرنے کی وجہ سے پانی سو سو فٹ اونچے

فواروں کی شکل میں بلند ہو رہا تھا۔ جرمن طیارے، برطانوی جہازوں اور کشتیوں پر بار بار غوطہ لگاتے اور مشین گنوں سے گولیوں کی بوچھاڑ کر دیتے۔ دوسرے ہی لمحے پانی کی سطح پر بیسیوں لاشیں تیرتی ہوئی نظر آتیں۔ ڈنکرک شہر کو آگ کے شعلوں اور دھوئیں کے بادلوں نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ بندرگاہ پر جہازوں میں سامان لادنے اور اتارنے والی مشینیں پگھلے ہوئے لوہے میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ ساحلِ سمندر پر دُور دُور تک انسانی لاشے پڑے ہوئے تھے۔ کئی سپاہی اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے تھے اور دیوانہ وار ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ جن سپاہیوں نے ڈنکرک کی دکانیں لوٹ لی تھیں اور اپنے بچوں کے لئے کھلونے اکٹھے کر رکھے تھے۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، لیکن ابھی تک انہوں نے کھلونوں کو اپنے ہاتھوں میں بھینچ رکھا تھا۔

برطانوی سپاہ کی تعداد ہزاروں سے گھٹ کر سینکڑوں میں تبدیل ہو چکی تھی ابھی تک جرمن طیاروں کی یلغار جاری تھی۔ ایک فرانسیسی افسر نے کسی برطانوی میجر کو مشورہ دیا کہ وہ فوراً کسی پناہ گاہ یا خندق میں چلا جائے۔ لیکن میجر نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ وہ آخری دم تک اپنی توپ کی حفاظت کرے گا۔ تھوڑی دیر بعد جب فرانسیسی افسر اسی جگہ پہنچا تو میجر کا نام ونشان تک نہ تھا۔ البتہ توپ سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک مسخ شدہ لاش پڑی تھی۔

دوسری طرف بدقسمت اسٹیمر ایگل سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اس کے عملے کے ارکان واویلا کر رہے تھے اور پاگلوں کی طرح سمندر میں کود رہے تھے۔ ساحلِ سمندر پر بچے کھچے چار پانچ سو سپاہی انہیں دیدۂ عبرت سے تکنے کے سوا کر ہی کیا سکتے تھے۔ لیفٹیننٹ ڈیوس "ادرائل" کے عرشے پر کھڑا ان ہی سپاہیوں کی سمت ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ اکثر فوجیوں کی وردیاں چیتھڑوں میں تبدیل ہو چکی تھیں اور ان کے چہرے گرد وغبار سے اَٹے ہوئے تھے۔ وہ حسرت و یاس کی تصویر بنے اس آخری برطانوی جہاز کی طرف دیکھ رہے تھے۔ لیفٹیننٹ نے ایک ایک کر کے لنگر اٹھانا شروع کئے اور آہستہ آہستہ جہاز کو مشرقی پشتے کے ساتھ لا کھڑا کیا۔ تھوڑی دیر بعد تمام فوجی "ادرائل" میں سوار ہو چکے تھے۔ اگلی لہر اُٹھتے ہی جہاز نے آہستہ آہستہ حرکت کرنا شروع

کی۔ اچانک کسی سپاہی نے بگل بجانا شروع کیا۔ قومی ترانے کی دھنوں نے مایوس سپاہیوں کے دلوں میں ایک نئی رُوح پھونک دی۔

"ہمارا ملک اُمیدوں اور کامرانیوں کا گہوارہ ہے"۔

ان سپاہیوں میں سے بیشتر زخموں سے چُور تھے، لیکن ذہنی طور پر انہوں نے ابھی تک شکست تسلیم نہیں کی تھی۔ انہیں اپنے وزیر اعظم سر ونسٹن چرچل کی پیش گوئی پر پختہ یقین تھا۔

"آخر کار فتح ہماری ہوگی"

مصنوعی شہر

دوسری جنگ عظیم نقطۂ عروج پر تھی۔ نازی فوجیں جنرل رومیل کی قیادت میں اتحادی فوجوں پر زبردست دباؤ ڈال رہی تھیں اور اتحادی ہوائی فوج "بن غازی" شہر اور بندرگاہ پر تابڑ توڑ حملے کر رہی تھیں، لیکن دل چسپ بات یہ تھی کہ اتحادیوں کی زبردست بم باری کے باوجود بن غازی کی بندرگاہ دو سال تک محفوظ رہی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ نازی فوجوں نے اتحادی ایئر فورس کو دھوکہ دینے کے لئے اصل بن غازی شہر سے دس میل دور ایک مصنوعی شہر تعمیر کر رکھا تھا اور ان کے طیارے ہمیشہ نقلی شہر پر بم باری کر کے چلے جاتے تھے۔ آخر لیفٹیننٹ نارمن اوپالڈ کے جرأت مند قدم نے اس راز پر سے پردہ اٹھایا اور جنرل رومیل کی طاقت کو ہمیشہ کے لئے شمالی افریقہ سے ختم کر دیا۔

نارمن اوپالڈ نے اپنے بم بار طیارے ۲۴۔ بی کا رُخ تبدیل کیا اور مائیکروفون پر اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا۔

"راؤنڈ پورا ہو چکا ہے ـــــ میں بیس ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے آ رہا ہوں۔"

چند سیکنڈ بعد آپریٹر کی آواز نارمن کے کانوں سے ٹکرائی۔

"سب ٹھیک ہے۔"

اور ان مختصر جملوں کے ساتھ ہی دوسری جنگِ عظیم کے اَن گِنت ڈراموں میں سے ایک اور ڈرامے کا آغاز ہوا جس کی تفصیلات جب منظرِ عام پر آئیں تو دنیا حیران رہ گئی۔ ۱۹۴۱ء میں ہٹلر کی فوجیں بن غازی کی بندرگاہ پر قابض ہو چکی تھیں اور بندرگاہ پر قابض رہنے کے لئے جان توڑ کر لڑ رہی تھیں۔ فیلڈ مارشل اروین رومیل اتحادی فوجوں کی اچھی طرح پٹائی کر رہا تھا۔ اور اس کی نت نئی جنگی چالوں نے بڑے بڑے اتحادی جنرلوں کے چھکّے چھڑا دیئے تھے۔ رومیل نے دوسری جنگِ عظیم میں جو کارنامے پیش کئے وہ نہایت عجیب ہیں اور ان ہی کارناموں میں سے ایک کارنامہ مصنوعی بن غازی کی تعمیر بھی ہے۔ رومیل نے اصلی اور نقلی دونوں بندرگاہوں کی حفاظت کا معقول انتظام کر رکھا تھا۔ چپّے چپّے پر طیارہ شکن توپیں نصب تھیں اور جب بھی اتحادی طیّارے بم باری کرنے نمودار ہوتے، ان سینکڑوں توپوں کے دہانے بیک وقت آگ اُگلنے لگتے اور ہر حملے میں اتحادی ایئر فورس کو اپنے بہت سے طیّاروں سے ہاتھ دھونے پڑتے۔

رومیل نے یہ چال چل رکھی تھی کہ اتحادی طیّارے بن غازی پر حملے کے لئے جب بھی آتے تو مصنوعی شہر کو روشن کر دیا جاتا تھا۔ اتحادی ہوا باز جب اصلی شہر کو دیکھنے کے لئے روشنی کے گولے پھینکتے تو جرمن توپیں دھوئیں کے گولے اگلنے لگتیں اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری بندرگاہ تاریکی کے دبیز پردوں میں چھپ جاتی اور یوں اتحادیوں کا مشن ناکام ہو جاتا۔ اصلی بن غازی کی نشاندہی سب سے بڑا مسئلہ تھا جو کسی طرح حل ہونے میں نہ آتا تھا اور نارمن اوپالڈ اس وقت اصلی بندرگاہ کا سراغ لگانے کے لئے اپنے بم بار طیّارے میں بہت بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔ اس نے دل میں مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ وہ اس بندرگاہ کا سراغ لگا کر اسے ختم کر دے گا یا خود ختم ہو جائے گا۔ اُسے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اصل بن غازی کو تباہ کرنا بچوں کا کھیل نہیں، کیوں کہ رومیل نے بندرگاہ کو بچانے کے لئے نہایت کڑے اور پیچیدہ انتظامات کر رکھے ہیں۔ اُس نے اپنے طیّارے کی اسکرین پر نگاہ ڈالی۔ بلیک آؤٹ کی وجہ سے بندرگاہ گہری تاریکی میں غرق ہو چکی تھی۔ نارمن اوپالڈ نے ٹرانسمیٹر کا بٹن دبا کر اپنے ساتھیوں کو تیار رہنے کا حکم دیا وہ شاید اپنے دل میں کوئی فوری فیصلہ کر چکا تھا۔ دفعتہً طیّارے کے پچھلے حصے میں بیٹھا ہوا مشین گن اپریٹر اپنے مائیکروفون پر چلّایا۔

"فائر ــــــ وہ طیارے پر فائرنگ کر رہے ہیں۔"

نارمن نے فوراً اسکرین پر دیکھا۔ بے شک طیارے کے گرد کئی شعلے پھیلے ہوئے تھے، جو غالباً طیارے کی آواز سنتے ہی فضا میں بلند ہونا شروع ہو گئے تھے "دوستو" ... نے نہایت سکون سے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا: "جرمن توپوں کی دہانوں سے نکلنے وا... شعلوں پر کڑی نظر رکھو، اس طرح ہمیں اصل بندرگاہ کا سراغ مل سکے گا۔"

طیارے کے دائیں ونگ میں نیوی گیڈا وڈیل کی ڈیوٹی تھی۔ وہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتے ہوئے شعلوں کے بارے میں نارمن کو برابر مطلع کر رہا تھا۔ نارمن پلک جھپکائے بغیر اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ گولوں کے پھٹنے سے شعلے اس کے طیارے کے گرد تیزی سے لپک رہے تھے۔ بڑا بھیانک اور ڈراؤنا منظر تھا۔ توپ کا گولہ جوں ہی طیارے سے ذرا فاصلے پر پھٹتا، چند ثانیوں کے لئے فضا روشن ہو جاتی اور پھر وہی انتہائی تاریکی اور سناٹا ــــــ طیارہ آگ کے طوفان سے گزر رہا تھا۔ نارمن کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ آگ کے شعلوں کے ایک بیکراں سمندر میں گھر گیا ہے۔ اس نے یکایک فیصلہ کیا کہ طیارے کی بلندی کو اور کم کر دیا جائے۔ اسکرین پر نقطوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اس تنہا طیارے پر سینکڑوں جرمن توپوں نے اپنے اپنے منہ کھول دیے تھے۔ تھوڑی دیر بعد پھٹتے ہوئے گولوں کے ٹکڑے طیارے سے آن آن کر ٹکرانے لگے۔

یک لخت طیارہ تھرتھرایا اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ دائیں طرف مڑ گیا۔ مشین گن آپریٹر اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ مائیکروفون پر چیخا، "نارمن ــــــ طیارے کی آدھی دُم اُڑ چکی ہے۔"

یہ سنتے ہی نارمن کا دل دھک دھک کرنے لگا اور اُس کا بدن پسینے میں نہا گیا۔ اگر وہ چند ثانیے کی مزید تاخیر کرتا تو طیارے کے لازماً پرخچے اُڑ جاتے۔ اس نے طیارے کا توازن برقرار رکھنے کے لئے دائیں پاؤں سے رڈل کو پوری قوت سے دبا دیا۔ اس نے ابھی تک اپنے دوسرے ساتھیوں کو یہ نہیں بتایا تھا کہ طیارے کی آدھی دُم غائب ہو چکی ہے۔

"انجن نمبر ایک کے تیل کا دباؤ کم ہو رہا ہے ــــــ" انجنیئر کی آواز پہلی بار اُس نے سُنی، "طیارے کو واپس اڈّے کی طرف لے چلو۔"

"نہیں ــــــ" نارمن نے سختی سے کہا، "سب ٹھیک ہے ــــــ ہم اُس وقت تک

پرواز جاری رکھیں گے، جب تک ہمارے دم میں دم ہے اور مشینری ہمارا ساتھ دیتی ہے۔"

یہ کہتے ہی اُس نے اپنی دائیں ٹانگ کا رہا سہا بوجھ بھی رڈل پر ڈال دیا۔ وہ ہر قیمت پر طیارے کے توازن کو برقرار رکھنے کا ارادہ کر چکا تھا۔

"ہم سے دو میل دائیں جانب مصنوعی بندر گاہ ہے ——" نیوی گیٹر نے اطلاع دی۔

"بہت اچھا —— لیکن اچھی طرح دیکھ لو تاکہ دوسرے راؤنڈ میں ہمیں یہ جگہ یاد رہے۔" نارمن نے جواب دیا۔

"دوسرا راؤنڈ" انجینئر حلق پھاڑ کر چلایا" نارمن کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟ بم پھینکو اور اس دوزخ سے جلدی نکل چلو۔"

نارمن نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ اس کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ اُبھری۔ وہ سوچنے لگا کہ بم پھینک کر تو پہلے بھی اتحادی ایر فورس کے پائلٹ بھاگتے رہے ہیں میں سینکڑوں میل کا فاصلہ اس لئے طے کر کے نہیں آیا کہ بموں کو وسیع صحرا کے سینے پر پھینک کر بھاگ جاؤں۔ ان بموں کی قیمت بن غازی شہر اور بندرگاہ ہے اور میں یہ قیمت وصول کرنے کے لئے ہر خطرہ مول لینے کے لئے تیار ہوں —— ابھی وہ اسی سوچ بچار میں گم تھا کہ انجینئر نے دوبارہ احتجاج کیا۔

"میں پھر کہتا ہوں کہ طیارے کو واپس لے جاؤ —— اگر تم اسی طرح بغیر دُم کے اسے اُڑاتے رہے تو ہم میں سے کوئی زندہ نہ بچے گا۔"

"چپ رہو۔" نارمن نے اسے ڈانٹا۔" اگر تم اتنے ہی بزدل تھے تو تمہیں کس نے کہا تھا کہ ایر فورس میں بھرتی ہو جاؤ۔" پھر اُس نے مائیکروفون پر اپنے ایک ساتھی ہاگن کو مطلع کیا" بم گرانے کا ابھی موقع نہیں، ہم شہر پر ایک چکر اور لگائیں گے۔"

ہاگن نہایت تجربے کار ہوا باز تھا اور بہت سے فضائی معرکوں میں اپنے جوہر دکھا چکا تھا، لیکن حقیقت یہ تھی کہ اسے نارمن کی یہ تجویز قطعی پسند نہ آئی۔ اس نے صرف اتنا کہا" میرا خیال ہے کہ شہر پر دوسرا چکر لگانے سے پیشتر ہی ہم تباہ ہو جائیں گے۔"

"کچھ ہو —— میں ایک چکر ضرور لگاؤں گا۔" نارمن نے انجن نمبر ایک کے تیل کے دباؤ کی سوئی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ تیل کا دباؤ آہستہ آہستہ کم ہوتا جا رہا تھا اور درجۂ حرارت اسی رفتار

سے بڑھ رہا تھا۔ نارمن نے طیارے کو سیدھا کر کے اُس کا رُخ شہر کے مغربی حصے کی طرف پھیر دیا۔ دائیں رڈل پر دباؤ ہلکا کر دیا اور جہاز رفتہ رفتہ نیچے آنے لگا۔ بن غازی پر یہ اس کا دوسرا چکر تھا وہ سنبھل کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ اُس کے کان جرمن توپوں کی گرج پر لگے ہوئے تھے۔

"اوہ خدایا ——" انجنیئر دہشت سے تقریباً رو پڑا، "یہ صریحاً خودکشی ہے —— پاگل پن ہے —— دیوانگی ہے —— ہم کبھی —— کبھی یہ چکّر پورا نہیں کر سکتے۔"

"بکواس بند کرو اور تیل کے دباؤ کا خیال رکھو" نارمن غصے سے بے تاب ہو کر دھاڑا۔

بم بار طیارہ جوں ہی بن غازی کی حدود میں داخل ہوا، ہر جرمن توپ گولے اگلنے لگی۔ نارمن نے اسکرین پر مغرب کی طرف دیکھا۔ تقریباً سارا شہر روشن تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہی وہ شہر ہے جو نازیوں نے اتحادی ایئر فورس کو دھوکہ دینے کے لئے بنایا ہے۔ مشرق کی طرف بھی دور فاصلے پر طیارہ شکن توپیں گولے پھینک رہی ہیں۔ یہ توپیں اصل بن غازی شہر اور بندرگاہ پر نصب تھیں۔ اس طرح نارمن کے سامنے اصل شہر اور بندرگاہ کا مکمل خاکہ واضح ہو گیا۔ بندرگاہ کی طرف سے زبردست گولہ باری ہو رہی تھی۔ نارمن کا طیارہ ابھی تک محفوظ تھا اور وہ خود حیران تھا کہ گولوں کی بارش میں طیارہ کیوں کر محفوظ ہے۔ مصنوعی شہر کو بار بار روشن کیا جا رہا تھا وہ یہ روشنی دیکھ کر مسکرایا۔ اور کہنے لگا۔

"نازی گدھو! اب تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ یہی وہ روشنیاں ہیں، جو ہمارے پائلٹوں کو مغالطے میں ڈال دیتی ہیں۔"

جرمن طیارہ شکن توپچی اپنی پوری کوشش سے بم بار طیارے پر آگ برسا رہے تھے۔ اصل میں وہ ایک اس اتحادی طیارے کو اپنے اس قدر قریب پا کر بوکھلا گئے تھے۔ نارمن جہاز کے توازن کو برقرار رکھنے کی جان توڑ کوشش میں لگا ہوا تھا۔ کبھی کبھی وہ اسکرین کو دیکھتا اور کبھی توپ کے گولوں کی نارنجی، قرمزی اور سُرخ رنگ کی لاتعداد روشنیوں میں اصلی بن غازی شہر اور بندرگاہ پر نظریں دوڑاتا۔

"اب وہ نہیں بچ سکتے۔ میں نے اُنہیں دیکھ لیا ہے" نارمن نے جوشیلی آواز میں اپنے ساتھیوں سے کہا، "تیسرے راؤنڈ میں بم گرانے کے لئے تیار رہو۔"

"تیسرا راؤنڈ" طیارے کا عملہ حیران تھا کہ نارمن کو کیا ہو گیا ہے۔ تیسرا راؤنڈ پورا کرنے کے لئے کسی معجزے کی ضرورت ہے اور یہ معجزہ کہاں رونما ہو گا؟ آخر اوڈیل نے تنگ آ کر کہا:
"نارمن! تم قومی ہیرو بننے کے لئے ہماری اور اپنی جان کو خواہ مخواہ خطرے میں کیوں ڈال رہے ہو۔ تیسرے راؤنڈ کا خیال ترک کر دو۔"

"لعنت ہے قومی ہیرو پر۔" نارمن نے گرج کر کہا، "یقین کر و میں تیسرے راؤنڈ میں ضرور کامیاب رہوں گا۔ گھبراؤ نہیں، کوئی غیبی طاقت میرے کان میں کہہ رہی ہے کہ ہم اس مرتبہ لازماً بازی جیتیں گے۔"

ابھی وہ کچھ اور کہتا، لیکن یکایک طیارے نے ایک زوردار جھٹکا کھایا اور پھر تیزی سے زمین کی طرف جانے لگا۔ نارمن کے کانوں سے مائیکروفون کے ریسیور کھسک گئے، مگر اس نے فوراً اپنے حواس پر قابو پا لیا اور دائیں رڈل پر پورا دباؤ ڈالتے ہوئے طیارے کا توازن دوبارہ درست کیا۔ اس کی ٹانگ میں شدید درد ہو رہا تھا، بازو شل اور حلق خشک ہو چکا تھا۔ پہلی بار اُسے خطرے کا صحیح معنوں میں احساس ہوا، مگر —— کچھ ہو —— وہ تیسرا راؤنڈ ضرور لگائے گا —— ضرور —— وہ اپنے مشن میں ناکام نہیں لوٹے گا۔

مغرب کی طرف سے یکایک تیس کے قریب جرمن ایئر فورس کے طیارے نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ۲۴۔ بی کے گرد پھیل گئے۔ ان تیس طیاروں کے پائلٹوں میں ہینز جیکم مارسیلی بھی شامل تھا، جو "افریقہ کا پائلٹ" کے نام سے مشہور تھا اور جرمن ایئر فورس میں "جاں باز ہیرو" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ نارمن اوپالڈ نے جوں ہی تیسرا راؤنڈ لگانے کے لئے طیارے کا رُخ بن غازی کی طرف کیا۔ جرمن پائلٹ ہینز جیکم نے پھرتی سے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔

"ساتھیو! حملے کے لئے تیار رہو۔" نارمن نے مائیکروفون پر کہا اور طیارے کی رفتار تیز کر دی۔ جرمن طیاروں نے اگرچہ نارمن کے طیارے کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ کافی دور ہی رہے۔ شائد وہ بھاری بھرکم ۲۴۔بی سے خوف زدہ ہو گئے تھے، البتہ ہینز جیکم ۲۴۔بی کے پیچھے پہنچ کر گولیاں برسا رہا تھا۔

یوں تو ۱۹۴۱ء کے اوائل ہی میں جنگی نقطۂ نظر سے بن غازی کی بندرگاہ خاصی اہمیت حاصل کر چکی تھی۔ برطانوی اور امریکی طیارے قاہرہ کے ہوائی اڈے سے اُڑ کر دو سال سے اس بندرگاہ اور شہر پر مسلسل حملے کر رہے تھے، لیکن یہ حملے رومیل کی دوراندیشی اور جنگی چالوں کے باعث ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھتے۔ اپنی سپلائی لائن کو قائم رکھنے کے لئے رومیل ہر لحاظ سے شہر اور بندرگاہ کی حفاظتی تدابیر میں مصروف تھا۔ بن غازی شہر اور بندرگاہ کو اتحادی قوت کی نظر سے بچانے کے لئے اس قدر مکمل انتظام کیا گیا تھا کہ یہ دونوں جگہیں اتحادی طیاروں کی نظروں سے اتنے عرصے تک چھپی رہیں۔ رومیل نے برطانوی اور امریکی پائلٹوں کو دھوکہ دینے کے لئے دس میل کے فاصلے پر ایک مصنوعی شہر بنا لیا تھا جو تین سال تک اتحادیوں کے لئے معمہ بنا رہا۔

۴۲ء میں فیلڈ مارشل منٹگمری نے نمبر آٹھ ڈویژن کے ساتھ ایک بھرپور حملہ کیا تھا کہ نازیوں کو افریقہ سے باہر نکال دیا جائے۔ العلمین کے مقام پر اُس نے رومیل کی فوجوں کو پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا اور سال کے اختتام پر تو فیلڈ مارشل منٹگمری کی کامیابی یقین میں بدلتی جا رہی تھی۔ منٹگمری کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح اتحادی فوجیں ان بندرگاہوں پر قابض ہو جائیں، جن کی وجہ سے نازی فوجوں کی سپلائی لائن قائم ہے تو یقیناً رومیل کو یہ ملک چھوڑنا پڑے گا۔ جوں ہی صحرا میں سردیوں کا آغاز ہوا۔ امریکی اور برطانوی ایئر فورس نے بن غازی پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیے، لیکن بندرگاہ بالکل محفوظ رہی اور اتحادیوں کی سپریم کمان یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ بن غازی حاصل کرنے کے لئے جنگی چالوں میں تبدیلی لازمی ہو گئی ہے۔

ان ہی دنوں جب کہ شمالی افریقہ میں اتحادی فوجوں پر نازیوں کا دباؤ برابر بڑھتا جا رہا تھا، امریکا کی طرف سے اپنی فوجوں کو پے در پے کمک پہنچنے لگی۔ سامان رسد اور اسلحہ بارود کے ساتھ ساتھ مزید اعلیٰ فوجی افسر اور پائلٹ بھی بھیجے گئے۔ پائلٹوں کو مصر کے ۴۷۶ بم گروپ کے لئے مخصوص کیا جا چکا تھا، چنانچہ ان پائلٹوں کو مصر بھیج دیا گیا۔ نارمن اوپالڈ بھی ان میں شامل تھا۔

نئے پائلٹوں کے آنے کی اطلاع ملتے ہی مصر میں امریکی ایئر بیس ہیڈ کوارٹر کا انچارج جنرل میگ گوائر اسی وقت پائلٹوں سے ملنے کے لئے پہنچا۔ سب سے آخر میں اس نے نارمن اوپالڈ سے ہاتھ ملایا۔ وضع قطع سے نارمن پائلٹ کے بجائے ایک عام آدمی دکھائی دیتا تھا، چھوٹا سا قد

چندھی آنکھیں اور دُبلا پتلا جسم، کرنل نے نارمن کو غور سے دیکھا اور ابھی کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ نارمن بول پڑا۔

"کرنل! جنگ کہاں ہو رہی ہے؟ ہم مرنے مارنے کے لئے بالکل تیار ہیں۔"

کرنل نے بے تابی سے اپنے ہاتھ ملے اور مغرب کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا:

"آپ لوگوں کے آنے سے خوشی ہوئی، رہا جنگ کے متعلق، تو یوں سمجھ لیجیے کہ وہ ہمارے چاروں طرف آگ کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ یہ کہہ کر اُس نے نارمن کو ایک بار پھر اوپر سے نیچے تک دیکھا اور مزید کچھ کہے بغیر جیپ میں سوار ہو کر چلا گیا۔ راستے میں اُس نے بڑبڑا کر کہا۔

"اونہہ ___ بے وقوف کا بچہ ___ کہتا ہے جنگ کہاں ہو رہی ہے اس گدھے کو اگر بن غازی کے جہنم کی سیر کرائی جائے تو چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا ___ بلڈی فول، نان سنس ___"

کرنل میک گوائر بہترین پائلٹ ہونے کے علاوہ اچھا کمانڈنگ آفیسر بھی تھا۔ نارمن اپیالڈ کے بارے میں اُسے وہی غلط فہمی ہوئی جو اُسے اکثر اس قسم کے آدمیوں کو دیکھ کر ہو جایا کرتی تھی۔ دراصل وہ ظاہری نام و نمود اور شخصیت کا قائل تھا۔ اس نے نارمن کے خدوخال اور ٹھنگنے قد کو دیکھ کر غلط رائے قائم کی۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ اس چھوٹے قد کے اندر کتنی بڑی صلاحیتیں اور خوبیاں چھپی ہوئی ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ نارمن ایک خوش باش اور جوشیلا پائلٹ ہے لیکن وہ اس کے بالکل برعکس انتہائی سنجیدہ قسم کا نوجوان تھا۔

جن دنوں نارمن اپیالڈ مچی گن یونیورسٹی میں کیمیکل انجینئرنگ کا طالب علم تھا۔ جنگ زوروں پر تھی اور آئے دن فضائیہ میں بھرتی کے لئے اخباروں میں بڑے بڑے اشتہار چھپتے رہتے تھے۔ ایک روز نارمن نے ایسا ہی اشتہار پڑھا اور یکایک پائلٹ بننے کا ارادہ کر لیا۔ اخباروں میں ہوابازوں کے کارنامے چھپتے تو وہ انہیں بڑے شوق سے پڑھتا۔ آہستہ آہستہ اس کی آتش شوق بھڑکنے لگی اور ایک روز وہ چپکے سے فضائیہ میں بھرتی ہو گیا۔ ٹریننگ لینے کے بعد اس نے کئی فضائی مہموں میں حصہ لیا اور سرخ رو واپس آیا، اب اس کے حوصلے بلند اور ہمت درجۂ کمال پر پہنچ چکی تھی اور یہی وجہ تھی کہ ایک روز اسے بن غازی پر حملہ کرنے کے لئے منتخب کیا گیا۔

مصر میں آنے کے بعد اس نے جلد ہی اپنی غیر معمولی صلاحیتوں، دوراندیشی اور جنگی تدابیر کے باعث کرنل میگ گوائر کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ کرنل سمجھ چکا تھا کہ نارمن کے اندر انتہائی خوبیاں موجود ہیں۔ ان ہی دنوں رائل ایئر فورس کے دو اسکواڈرن طیاروں نے بن غازی پر بھرپور حملہ کیا۔ اتحادیوں کے ولنگٹن طیارے روشنی کے بم پھینک پھینک کر اپنی فضائیہ کی رہنمائی کر رہے تھے، لیکن اس زبردست حملے کو جرمن طیارہ شکن توپوں نے بُری طرح ناکام بنا دیا۔ رائل ایئر فورس کے طیارے اپنے بہت سے بم مصنوعی بن غازی پر پھینک کر واپس آ گئے۔ اس کے بعد دوبارہ اتحادی طیاروں نے بن غازی پر حملہ کرنے کی کوشش کی اور اس مرتبہ بھی بہت سے طیارے ضائع کرنے کے بعد یہ مشن ناکام لوٹ آیا۔ اس مشن کی ناکامی کا جب نارمن کو علم ہوا تو وہ فوراً کرنل میگ گوائر کے سامنے پیش ہوا اور کہنے لگا:

"جناب میں نے سُنا ہے کہ کل ہمارا ایئر فورس کا مشن ناکام ہو گیا ہے؟"

"ہاں!" کرنل نے پریشانی سے کہا، "ہمارے طیارے اصل بن غازی سے دس میل شمال کی جانب بم باری کرنے کے بعد ناکام لوٹ آئے ہیں اور گزشتہ دو برس سے یہی ہو رہا ہے، آخر کب تک ایسا ہوتا رہے گا؟"

بظاہر ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ کے لئے یہ سوال غیر متوقع تھا، لیکن نارمن قدرے سنبھلا اور دائیں جانب دیوار پر لگے ہوئے افریقی محاذوں کے نقشے کے قریب جا کھڑا ہوا اور دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ کمرے میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ کرنل اپنی کرسی پر بیٹھا خاموشی سے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ دفعتہً نارمن نے کہا:

"جناب! اگر مجھے موقع دیا جائے تو میں اصل بن غازی شہر اور بندرگاہ پر بمباری کر سکتا ہوں۔"

کرنل نے اپنے کاغذات نہایت اطمینان سے فائل میں رکھے اور نارمن کو گھورنے لگا:

"اس مشن میں بڑے بڑے تجربہ کار اور نڈر پائلٹ کام آ چکے ہیں۔ تم کس طرح کامیاب ہو سکتے ہو؟"

"میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے، بشرطیکہ آپ سننا پسند کریں ——" نارمن نے جواب دیا۔

"کہو میں سن رہا ہوں۔"

"جناب، بات دراصل یہ ہے کہ ہمیں پہلے اصلی بن غازی کا سراغ لگانا ہوگا۔ اس کے بعد تجویز یہ ہے کہ حملے کے دوران میں ۲۵ ہزار فیٹ کی بلندی سے بم پھینکے جائیں۔ جرمن ہمیں دھوکہ دینے کے لئے فوراً مصنوعی شہر کو روشن کر دیں گے اس طرح پہلے راؤنڈ میں ہم اس مصنوعی شہر کے متعلق جان جائیں گے اور دوسرے راؤنڈ میں ہم اس مصنوعی شہر کو نظر انداز کر دیں گے۔"

"دوسرا راؤنڈ؟" کرنل نے حیرت سے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

"جی ہاں، دوسرا راؤنڈ۔" نارمن نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "پہلے راؤنڈ میں ہم اپنے بم نہیں گرائیں گے، بلکہ مصنوعی شہر کے گرد و نواح کا جائزہ لیں گے اور دیکھیں گے کہ جرمن طیارہ شکن توپیں کہاں کہاں نصب ہیں۔"

کرنل میک گوائر نے دل چسپی اور حیرانی کے ملے جلے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا "یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم دوسرے راؤنڈ میں اصل بن غازی شہر اور بندرگاہ پر بمباری کر دو گے؟"

"نہیں جناب، آپ میرا پروگرام نہیں سمجھے۔" نارمن نے نفی میں سر ہلایا۔ "دوسرے راؤنڈ میں نازیوں کو یہ احساس ہوگا کہ وہ مصنوعی بن غازی کے ذریعے ہمیں دھوکہ نہیں دے سکے اور ہم اصل شہر پر حملہ کرنے والے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اصل شہر میں نصب کی گئی ہر طیارہ شکن توپ سے ہم پر گولہ باری شروع کر دیں گے۔ اس کے بعد بیس ہزار فیٹ کی بلندی سے ہم بہ آسانی طیارہ شکن توپوں کے فائر دیکھ کر اصل بن غازی شہر اور بندرگاہ کا تعین کر سکیں گے اور تیسرے راؤنڈ میں ہم اپنے بم بغیر کسی مشکل کے صحیح نشانوں پر گرا سکیں گے۔"

کرنل نے چند لمحے نارمن کو غور سے دیکھنے کے بعد کہا: "تمہارا مطلب میں سمجھ گیا۔ تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ ایک گروپ بھیجوں اور میرا خیال ہے کہ جہاں تمہاری اور گروپ کے تمام افراد کی جانیں ضائع ہوں گی۔ وہاں چند بمبار طیارے بھی ضائع کرنے پڑیں گے۔ میں تمہیں جتنا بے وقوف سمجھتا تھا، تم اس سے کہیں زیادہ بے وقوف ہو۔"

"میں آپ سے کئی طیارے نہیں مانگتا۔ مجھے صرف ایک طیارہ درکار ہے۔ جب میں اصل بن غازی اور بندرگاہ پر بم گرانے میں کامیاب ہو جاؤں گا تو بعد میں آپ اور طیاروں کا دوسرا

گروپ بن غازی کی مزید تباہی کے لئے بھیج سکتے ہیں۔"

"اس مشن کا مقصد سوائے خودکشی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا" کرنل نے میز پر گھونسا مار کر کہا، "بن غازی پر ایک راؤنڈ لگانا اور آگ اگلتی ہوئی بے شمار توپوں سے بچ نکلنا ہی ایک معجزہ ہے اور تم کہتے ہو تین راؤنڈ ــــــ ناممکن، قطعی ناممکن۔"

نارمن نے چند لمحے توقف کے بعد کہا "جناب مجھے اعتماد ہے کہ میں ناکام نہیں ہوں گا۔ اچھا یہ بتایئے کہ آپ کے ذہن میں کوئی تجویز ہے؟"

کرنل نے کوئی جواب نہ دیا اور جواب ہی کیا دیتا؟ اُس کے ذہن میں کوئی تجویز نہ تھی۔ وہ چھت کی طرف گھورتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ نارمن کی تجویز ہر اعتبار سے اچھی ہے لیکن اس میں سراسر خطرہ ہے ــــــ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ اگر یہ بے وقوف ایک مرتبہ اپنے مشن میں کامیاب ہو گیا تو اصل بن غازی اور بندرگاہ کو نیست و نابود کرنا مشکل نہ ہو گا۔ اس کے بعد کئی اسکوڈرن بم بار بھیجے جا سکتے ہیں ــــــ لیکن ــــــ اگر ــــــ کرنل اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔ اس کا ذہن اُلجھ گیا۔ آخر اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کیا تم اس مشن کے لئے اپنے آپ کو رضا کارانہ حیثیت سے پیش کر رہے ہو؟"

"جی ہاں ــــــ" نارمن نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کیا تم اس خطرے کو اچھی طرح سمجھتے ہو کہ ناکامی کی صورت میں جرمن توپیں تمہارے طیارے کے پرخچے اڑا دیں گی۔"

"ممکن ہے جناب، لیکن خطرہ مول لئے بغیر ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔"

"بہت اچھا، اگر تمہیں اپنے اوپر اعتماد ہے تو ایک بم بار، چھ آدمیوں کا گروپ اور ایمونیشن کا یہ جوا ضرور کھیل سکتے ہو۔"

نارمن کا چہرہ روشن ہو گیا اور اُس نے کہا، "شکریہ، کرنل۔"

"لیکن ــــــ" کرنل نے فوراً کہا۔ "تم آج رات ہی اس مشن پر جاؤ گے اور تمہیں ایک پرانا ۲۴۔بی بم بار طیارہ ملے گا۔"

"اوہ، تو آپ نیا طیارہ ضائع نہیں کرنا چاہتے۔" نارمن نے مسکرا کر کہا اور باہر جانے کے لئے مڑا۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے اور نارمن کا پرانا بمبار طیارہ کافی بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔ تجویز کے مطابق وہ بن غازی شہر پر دو راؤنڈ لگا چکا تھا اور اب تیسرے اور آخری راؤنڈ کی باری تھی۔ جرمن لڑاکا طیارے ایم ای ۱۰۹ چاروں طرف سے گھیر ڈال چکے تھے اور مسلسل فائرنگ کر رہے تھے، لیکن نارمن نہایت سکون سے ڈائل پر نظریں جمائے ۲۴۔بی کو تیسرے راؤنڈ کے لیے بن غازی کی طرف لے جا رہا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ جرمن سپاہی "مصنوعی شہر" میں بار بار روشنی کر رہے ہیں، مگر اب وہ ان کے فریب میں نہیں آسکتا تھا۔ جرمن اصل شہر اور بندرگاہ کو چھپانے میں ناکام ہو چکے تھے۔

"اسکرین پر ـــــــ اسکرین پر ـــــــ" بائیں ونگ پر موجود مشین گن آپریٹر دفعتہً چلّایا۔

نارمن نے سکرین پر غور سے دیکھا۔ باہر آسمان سیاہ نہیں تھا، بلکہ سرخ، قرمزی اور نارنجی روشنیاں تیزی سے پھیل رہی تھیں۔ توپوں کے گولے فضا میں طیارے کے آس پاس پھٹ رہے تھے۔ ایک کے بعد دوسرا گولہ اس تسلسل سے آرہا تھا کہ ۲۴۔بی کے گرد نارنجی روشنی کا ایک ہالہ سا بن گیا تھا۔

"ہم کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔" نیوی گیٹر نے مائیک پر کہا، "ہمارے بچ نکلنے کا کوئی امکان نہیں۔"

"پھر وہی بکواس۔" نارمن نے جھلّا کر جواب دیا، "مجھے یہ بتاؤ کہ جرمن طیارے مجھ سے کتنے فاصلے پر ہیں؟"

"بہت نزدیک ہیں نارمن ـــــــ تقریباً ۵۰۰ گز ـــــــ اور یہ فاصلہ کم ہوتا جا رہا ہے۔"

نارمن نے اپنی دائیں ٹانگ کو سہلایا اور انجن نمبر ایک کے تیل کا دباؤ دیکھا۔ دباؤ اب ٹھیک تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ واپس جانے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کیا وہ خود کو اور اپنے ساتھیوں کو آگ کے اس جہنم میں پھینک دے؟ جرمن طیاروں سے پیچھا چھڑانا آسان کام نہیں ـــــــ یک لخت وہ اپنے مائیک پر چیخا۔

"فائر کھول دو ـــــــ" اور اس حکم کے ساتھ ہی ۲۴۔بی کی پانچوں مشین گنوں کے منہ کھل گئے اور جرمن طیاروں پر گولیاں برسنے لگیں۔ طیارہ خشک پتے کی طرح فضا میں کانپتا

ہوا پرواز کر رہا تھا۔ چند لمحے بعد نارمن نے جوشیلی آواز میں دوسرا حکم جاری کیا۔ "فائرنگ بند ـــــ میں غوطہ لگا رہا ہوں ـــــ بم گرانے کے لئے تیار رہو۔"

بائیں ونگ کے مشین گن آپریٹر نے کچھ اور سمجھ کر خوشی سے نعرہ لگایا۔

"بہت اچھے ـــــ بہت اچھے ـــــ اب بھی وقت ہے، واپس مصر بھاگ چلو۔"

یہ سن کر نارمن کا خون کھول گیا۔ اس نے دل ہی دل میں آپریٹر کو موٹی سی گالی دی اور توپوں سے بچنے کے بجائے پوری رفتار سے انہی کی طرف غوطہ لگایا۔

"خدا کی پناہ ـــــ نارمن تم غلط رُخ جا رہے ہو۔" مشین گن آپریٹر کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی "واپس مُڑو ـــــ نارمن ـــــ" نارمن کے پاس اب اتنا وقت نہیں تھا کہ جواب دیتا۔ وہ طیارے کو قابو میں رکھنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔ جرمن توپیں اب بھی بیس ہزار فیٹ کی بلندی تک گولے برسا رہی تھیں۔ نازیوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اتحادیوں کا طیارہ ایک دم غوطہ لگائے گا۔

"بم گرانے کے لئے تیار رہو ہاگن" نارمن چیخا۔

۲۴۔بی نہایت ڈراؤنی آواز پیدا کرتا ہوا تیزی سے زمین کی طرف آرہا تھا۔

۱۸ ہزار ـــــ ۱۶ ہزار ـــــ ۱۴ ہزار ـــــ ۱۲ ہزار ـــــ اور فوراً ہی جرمن توپچیوں کو احساس ہو گیا کہ دشمن کا طیارہ نیچے آرہا ہے۔ دوسرے ہی لمحے گولے طیارے کے دائیں اور بائیں اور اوپر پھٹنے لگے۔

"اصل نشانے سے ہم کتنی دور ہیں؟" نارمن نے پوچھا۔

"تین میل ـــــ دس ڈگری دائیں جانب مُڑو۔"

نارمن نے طیارے کی رفتار دس ہزار فیٹ کی بلندی پر تھوڑی دیر کے لئے کم کر دی، تاکہ ہاگن اپنے نشانوں کو دیکھ سکے۔ گولوں کی تیز روشنی میں ہاگن اپنے نشانوں کو اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ جرمن توپیں نشانے بدل بدل کے گولے پھینک رہی تھیں۔ طیارے کے پچھلے حصے میں بیٹھا ہوا مشین گن آپریٹر مسلسل ایم ای ۱۰۹ طیاروں کے بارے میں رپورٹ دے رہا تھا۔ اصل نشانہ اب صرف ایک میل دُور تھا۔ نارمن نے طیارے کا رُخ تین ڈگری

دائیں طرف کیا۔ اب وہ ہاگن کی یہ آواز جلد سے جلد سننے کے لئے مضطرب تھا کہ "بم گرائے جا چکے ہیں۔"

"دائیں طرف ـــــ ایک ڈگری ـــــ ایک ـــــ دائیں ـــــ ٹھیک ـــــ بم گرائے جا چکے ہیں۔"

ہاگن کی آواز جوں ہی نارمن کے کانوں میں گونجی، ایک ناقابلِ برداشت مسرّت سے اس کا دل اچھلا۔ اُسے فوراً محسوس ہوا کہ طیارہ بموں کے بوجھ سے ہلکا ہو گیا ہے اس نے بمبار کا رُخ بائیں جانب کیا اور تیزی سے سمندر کی طرف بڑھنے لگا۔ اچانک ایک گولہ طیّارے کے کاک پٹ کے نزدیک اس دھماکے اور چمک سے پھٹا کہ ایک لمحے کے لئے نارمن اندھا ہو گیا۔

"طیّارہ زخمی ہو گیا ہے ـــــ" انجنیئر کی آواز سنائی دی۔ نارمن کے ہاتھ کنٹرولنگ وہیل پر کانپنے لگے۔ بمبار تیزی سے زمین کی طرف جا رہا تھا۔ نارمن دیوانہ وار کنٹرولنگ وہیل سے کشتی لڑ رہا تھا جو جام ہو گیا تھا۔ اس کا جسم پسینے سے تر ہو گیا۔ طیّارہ اپنا توازن کھو چکا تھا۔ اُس نے بدحواس ہو کر مائیکروفون کو منہ کے آگے کرنے کے لئے دایاں ہاتھ بڑھایا تاکہ ساتھیوں کو پیراشوٹ کے ذریعے چھلانگ لگانے کی اجازت دے، لیکن جوں ہی کنٹرولنگ وہیل پر ہاتھ کا دباؤ دور ہوا، وہ ایک دم اصلی حالت پر آ گیا۔ اس نے فوراً طیّارے کا توازن ٹھیک کیا۔ دراصل کاک پٹ کے قریب دھماکہ ہونے کے باعث کنٹرولنگ وہیل اپنی جگہ سے ذرا ہٹ کر جام ہو گیا تھا۔

"ساتھیو! گھبراؤ نہیں۔ ہم مصر واپس جا رہے ہیں۔" اس نے اعلان کیا۔ اب وہ ڈیرانہ کے ساحلی علاقے پر پہنچ چکا تھا اور سمندر کی سطح سے صرف دو سو گز کی بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔ نارمن نے اسکرین پر دیکھا۔ بن غازی کی بندرگاہ اور شہر دھوئیں اور آگ کے شعلوں میں لپٹے ہوئے تھے۔

صبح چار بج کر ۱۲ منٹ ہوئے تھے کہ ۲۴۔بی مصر میں واقع امریکی ہوائی اڈے کے جنوب میں اُفق پر اُبھرا۔ چند لمحوں بعد پورے اڈے پر نارمن اور پالڈ کے مشن کی کامیابی کے چرچے پھیل چکے تھے۔ کرنل میک گو اثرِ حیرت کے عالم میں رن وے پر کھڑا نارمن کو زخمی بمبار طیّارے سے نکلتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے نارمن کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے کہا "لیفٹیننٹ میں تمہیں دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔"

چندروز کے اندراندر اتحادی فضائیہ کے طیاروں نے اصل بن غازی اور بندرگاہ پر زبردست بم باری کی اور نازی انہیں روک نہ سکے۔ بندرگاہ بالکل تباہ ہوچکی تھی اور آخر جنرل رومیل کو اپنی فوجوں کے ساتھ شمالی افریقہ کے اس محاذ سے فرار ہونے ہی میں عافیت نظر آئی۔

عورتوں کی بٹالین

۲۲ اپریل ۱۹۴۵ء کی صبح تقریباً ساڑھے دس بجے، امریکی تباہ کن جہاز ٹربیبے، جزیرہ یوناکونی کے قریب لنگر انداز ہوا۔ سامنے چھوٹے بڑے جزیروں کا سلسلہ دور تک پھیلا نظر آ رہا تھا۔ جنوب میں اوکی ناوا تھا، جو امریکی حملے کا مرکز تھا۔ اس جزیرے پر جاپانیوں کا قبضہ تھا اور امریکیوں کی سر توڑ کوشش کے باوجود جزیرے پر قبضہ ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ جوں ہی ان کے اسلحے سے لدے ہوئے تباہ کن جہاز اوکی ناوا کی سمت بڑھتے، چشم زدن میں جاپانیوں کے تارپیڈو طیارے فضا میں نمودار ہوتے اور جہازوں کی چمنیوں میں غوطہ لگا کر خود بھی تباہ ہو جاتے اور ان کے بھی پرخچے اُڑا دیتے۔ یہ چھوٹے چھوٹے تارپیڈو طیارے جاپانیوں کے ایجاد کردہ تھے۔ ان میں نہایت طاقت ور بم تھے اور صرف ایک پائلٹ ہوتا تھا۔ تارپیڈو طیارے اڑانا دراصل ہراکری تھی۔ خودکشی کے لیے جاپانیوں کی یہ معروف اصطلاح ہے، جسے قومی فریضے کی حیثیت حاصل ہے۔

یہ صورتِ حال امریکیوں کے لیے پریشان کُن تھی اوکی ناوا پر قبضے کا تصور بھی محال نظر آتا تھا، لیکن اس کے بغیر ان جزیروں کو جاپانیوں کے تسلط سے آزاد کرانا ناممکن تھا۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ تارپیڈو طیاروں کا اڈّہ یوناکونی ہے۔ جاپانیوں نے اس جزیرے کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ یہ گھنے اور قدآور درختوں

سے گھرا ہوا تھا حتیٰ کہ سورج کی شعاعیں بھی بمشکل زمین تک پہنچتی تھیں۔ یہیں سے تارپیڈو طیارے پرواز کر کے امریکی بحریہ کے لیے موت کے پیغام بر بنتے تھے۔ امریکیوں کو یقین تھا کہ یوناکونی میں جاپانیوں کا ایک مضبوط دستہ تعینات ہے۔ انہیں جزیرے سے نکالنے اور تارپیڈو طیاروں کے اڈے ختم کرنے کے لیے چھٹی ڈویژن کے ۲۴ مضبوط آدمی منتخب کیے گئے۔ سارجنٹ ویلس، جے ہولنگ کو ان کا کمانڈر مقرر کیا گیا اور انہیں ضروری راشن، پانی اور اسلحہ دے کر اس خطرناک اور اہم مہم پر روانہ کیا گیا۔

ٹارپیڈو، یوناکونی کے قریب لنگر انداز ہوا تو سارجنٹ ہولنگ اور اس کے آدمی سامان اور اسلحے سمیت ربڑ کی کشتیوں میں سوار ہوئے۔ چند منٹوں بعد وہ یوناکونی کے ساحل پر گھٹنوں کے بل رینگ رہے تھے۔ ٹارپیڈو، انہیں چھوڑ کر واپس جاتا نظر آ رہا تھا اور سارجنٹ ہولنگ کے آدمی سوچ رہے تھے کہ شاید وہ اسے دوبارہ نہ دیکھ سکیں۔ اس مہم کے لیے انہوں نے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کی تھیں اور انہیں واضح طور پر بتا دیا گیا تھا کہ یوناکونی سے ان کی صحیح سلامت واپسی ایک معجزہ ہی سمجھی جائے گی۔

جزیرے پر پہنچتے ہی سارجنٹ ہولنگ نے تصویریں اور نقشہ اپنے سامنے پھیلایا اور ان کی مدد سے منصوبے بنانے لگا۔ اس نے جلد ہی فیصلہ کر لیا کہ گھنے جنگلوں میں بڑھنے سے پہلے چار چار آدمیوں پر مشتمل دو گشتی دستے صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے بھیجے جائیں۔ ان کی واپسی پر موقع محل دیکھ کر اگلا قدم اٹھایا جائے۔ جس جگہ سے وہ جزیرے میں داخل ہوئے تھے، وہ ایک ٹاپو تھا۔ ساحل کے ساتھ ساتھ چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں۔ سارجنٹ ہولنگ کو یقین تھا کہ جاپانیوں کو ان کی آمد کی ابھی اطلاع نہیں ملی۔ بعض چٹانیں تو اتنی اونچی تھیں کہ انہیں ٹارپیڈو، نظر نہیں آیا ہوگا۔ مزید برآں، امریکی بحریہ کی تمام تر یلغار دو کی ناوا پر تھی۔ یوناکونی پر زندگی کے کوئی آثار نہ تھے، اس لیے جاپانیوں کی دانست میں، امریکی اس طرف کا رخ بھی نہ کر سکتے تھے۔ یہ بات ان کے

لئے باعثِ اطمینان تھی۔

گشتی دستے بھیج کر سارجنٹ ہولنگ نے ایک محفوظ دراڑ منتخب کی اور اپنے آدمیوں سمیت اس میں بیٹھ گیا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور تخیل میں جاپانیوں کی طاقت کا اندازہ لگاتا اور ان سے نبرد آزما ہونے کے منصوبے بناتا رہا۔ اس کے ساتھیوں میں سے کچھ سگریٹ پی رہے تھے، کچھ اپنے بیوی بچوں اور محبوباؤں کی تصویروں سے دل بہلا رہے تھے اور کچھ آئندہ پیش آنے والی صعوبت اور تکان کے پیشِ نظر کمر سیدھی کر رہے تھے۔

دفعتہً جزیرہ جاپانی رائفل "آریسکا" کے فائر کی آواز سے گونج اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی امریکی "ایم آئی" اسٹین گن چلنے کی آواز آئی۔ سارجنٹ ہولنگ اور اس کے آدمی ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ آوازیں اس سمت سے آئی تھیں جس طرف شمالی گشتی دستہ گیا تھا۔

"فوراً چھپ جاؤ اور پوزیشن سنبھال لو" سارجنٹ ہولنگ نے حکم دیا۔

سب لوگوں نے مشین گنوں اور رائفلوں کے رُخ جنگل کی سمت پھیر دیے اور اگلے حکم کا انتظار کرنے لگے۔ جنگل پر بھیانک سکوت طاری تھا۔ ہوا بند تھی اور ایک پتا بھی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ جزیرہ اس حد تک ویران تھا کہ جیسے اس میں کسی پرندے کا کبھی گزر نہیں ہوا۔ سارجنٹ ہولنگ اور اس کے آدمی نیم تاریک جنگل پر نظریں گاڑے، مشین گنیں اور رائفلیں سنبھالے بیٹھے تھے اور کسی ان جانے خوف سے اُن کے دل دھڑک رہے تھے۔

ایک گھنٹہ اسی طرح گزر گیا۔ سارجنٹ ہولنگ کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے، تاہم کسی شک و شبہے کی گنجائش نہ رہی۔ جاپانیوں کو ان کی موجودگی کا علم ہو گیا تھا۔ وہ بری طرح گھر چکے تھے۔ گشتی دستوں کا صفایا ہو چکا ہو گا اور کوئی دم میں وہ جاپانی تارپیڈو طیاروں کے نشانے کی زد میں ہوں گے۔ جاپانی پیدل دستے نہیں حصار میں لیا ہی چاہتے ہیں۔ معاً اس نے فیصلہ کر لیا جب تک ایک آدمی بھی زندہ ہے مقابلہ کرنا ہو گا۔

"تین تین آدمی چٹانوں پر پھیل جائیں۔" اُس نے دانت بھینچ کر حکم دیا۔

دوسرے ہی لمحے وہ اسلحہ اٹھائے سائے کی طرح رینگنے لگے دراڑ میں اس کے ساتھ تین آدمی رہ گئے۔ اچانک جنگل میں سرسراہٹ ہوئی۔ سارجنٹ ہولنگ نے اشارے سے اپنے آدمیوں کو خبردار کیا اور اپنی عقابی نظریں جنگل پر گاڑ دیں چند لمحوں میں جنوبی گشتی دستے کے چاروں آدمی جنگل سے نمودار ہوئے۔

"ایک کھلے میدان میں عارضی فضائی مستقر بنایا گیا ہے۔ اس پر سات ناکارہ طیّارے کھڑے ہیں اور ۲۷ آدمی انہیں ٹھیک کر رہے ہیں۔ ان کے قریب ہی بانس اور پتوں سے عارضی ورکشاپ بنائی گئی ہے۔ جنوب میں ان کے علاوہ کوئی متنفّس نہیں ہے۔" گشتی دستے کے کمانڈر کارپورل مارک ایلن شیل نے رپورٹ دی۔

"تم نے گولیاں چلنے کی آواز نہیں سُنی؟" سارجنٹ ہولنگ نے پوچھا۔

"سنی تھی۔" مارک نے جواب دیا، "یہ آواز جنگل کی دوسری سمت سے آئی تھی۔"

"جاپانیوں نے بھی اسے سُنا؟" سارجنٹ ہولنگ نے دوسرا سوال کیا۔

"انہوں نے اپنے کام کی رفتار تیز کر دی۔" مارک نے بتایا، "وہ بھاگ بھاگ کر ورکشاپ میں آجا رہے تھے اور تیز تیز لہجے میں باتیں کر رہے تھے، جیسے وہ اپنا کام جلد ختم کرنا چاہتے ہوں۔"

"ہوں۔" سارجنٹ ہولنگ نے کچھ سوچا، "انہوں نے کتنے طیّاروں کی مرمّت کر لی ہے؟"

"غالباً ایک کی بھی نہیں۔" مارک نے کہا۔

سارجنٹ ہولنگ نے گشتی دستے کو بھی ایک چٹان پر تعینات کیا اور شمالی دستے کے متعلّق سوچنے لگا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اگر نصف گھنٹے تک اس کا کوئی آدمی واپس نہ آیا تو وہ جاپانی طیّاروں پر حملہ کر دے گا۔

ابھی بیس منٹ ہی گزرے تھے کہ جنگل میں پھر سرسراہٹ سنائی دی اور دوسرے ہی لمحے شمالی گشتی دستے کا کمانڈر۔ کارپورل ٹونی کواٹو اپنے تینوں آدمیوں سمیت نمودار

ہوا۔ انہیں دیکھتے ہی سارجنٹ ہولنگ کے ہونٹوں سے ایک دبی دبی سیٹی نکل گئی اور چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا۔ کارپورل ٹوٹی، دراڑ کے قریب آیا تو ہولنگ نے آگے بڑھ کر گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبایا۔

"سارجنٹ، مجھے افسوس ہے کہ ہمیں مجبوراً گولی چلانی پڑی"، کارپورل ٹوٹی کو احساس تھا کہ اس سے ایک زبردست غلطی سرزد ہوگئی ہے۔ "ہم کوئی پچاس گز تک گئے ہوں گے کہ ایک گولی سنسناتی ہوئی ہمارے اوپر سے گزر گئی۔ میں نے گھبرا کر مشین گن چلا دی۔ ایک ہلکی سی چیخ سنائی دی اور ہماری لیفٹنٹ کی طرف کوئی چار گز کے فاصلے پر ایک جاپانی دھڑام سے گر پڑا۔ اس کے بعد سناٹا چھا گیا، غالباً یہ بھی گشتی سپاہی تھا۔ ہم اس کے قریب گئے اور دیکھا تو وہ عورت تھی۔"

"عورت؟" سارجنٹ ہولنگ اچھل پڑا۔

"آگے بھی تو سنئے"، کارپورل ٹوٹی نے ہنس کر کہا، "چونکہ گولی پیچھے سے آئی تھی، ہم نے شمال مغرب کا راستہ اختیار کیا۔ مزید پچاس گز چلنے پر ایک تالاب دکھائی دیا۔ اس میں سے چودہ برہنہ عورتیں جلدی جلدی نکل کر وردیاں پہن رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ چاق چوبند فوجیوں کی طرح تن کر کھڑی ہوگئیں اور اپنی اپنی رائفلیں اٹھا کر تیزی سے مارچ کرتی روانہ ہوگئیں۔ ہم نے ان کا پیچھا کیا۔ وہ ہمیں درختوں کے گھنے جھنڈ میں گھری، شاخوں اور ناریل کے پتوں سے بنی ہوئی ایک بارک تک لے گئیں۔ یہ بارک اتنی محفوظ جگہ پر ہے کہ ہمارے فرشتوں کو بھی اس کا علم نہ ہو سکتا تھا۔"

"بارک میں کتنی عورتیں تھیں؟" سارجنٹ ہولنگ نے بے تابی سے پوچھا۔

"کم از کم سو۔ وہ سب کی سب وردیوں میں تھیں۔ کچھ رائفلوں کو صاف کر رہی تھیں، کچھ سنگینوں کی دھار تیز کر رہی تھیں، چند اپنی پھٹی ہوئی وردیاں سی رہی تھیں، اور ......"

آخری جملے پر خود ٹوٹی کو ہنسی آگئی، "وہ بڑا دلچسپ منظر تھا۔" اس نے ہنستے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"فوجی عورتیں؟ یہ میں نے آج تک نہیں سنا۔" سارجنٹ ہولنگ نے اضطراب

سے پہلو بدلا۔

"انہیں عورتیں نہ کہیئے جناب" مارک نے سنجیدگی سے کہا، "اگر انہوں نے ہمیں دیکھ لیا تو وہ عورتیں نہیں رہیں گی۔ وہ بڑی تگڑی اور باقاعدہ تربیت یافتہ ہیں۔ ان کے پاس مشین گنیں، رائفلیں، ریوالور اور دستی بم سب ہی کچھ ہے۔"

"سارجنٹ، یہ آیواساکی ہیں" پرائیوٹ ہیری نے پہلی مرتبہ مداخلت کی، "جاپانی فوج میں ان کی ایک باقاعدہ بٹالین ہے۔"

اتحادیوں نے عورتوں کی فوجی تنظیم "ویکائی" قائم کر کے اپنی دانست میں بڑا تیر مارا تھا۔ یہ تنظیم میدانِ جنگ اور ہسپتالوں میں زخمیوں کی مرہم پٹی میں ہاتھ بٹانے، ان کی دیکھ بھال کرنے اور بارکوں میں سپلائی بہم پہنچانے کے کام پر مامور تھی۔ دوسرے لفظوں میں اس کا کام خدمت، نرسنگ اور کلرکی تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ فوجیوں کو سامانِ دل بستگی فراہم کرنے کا فریضہ بھی انجام دیتی تھی۔ دراصل فوجیوں کے دلوں سے اپنے گھروں اور شہروں سے دُوری کا احساس مٹانے کے لیے یہ عورتیں بھرتی کی گئی تھیں۔ اس تنظیم میں کوئی شریف عورت شامل نہیں ہوتی تھی۔ اس کے برعکس جاپانیوں کی آیواساکی تنظیم مختلف تھی۔ یہ اعلیٰ پیمانے پر فوجی تربیت یافتہ عورتوں کی دنیا بھر میں اپنی نوعیت کی واحد تنظیم تھی، جسے بٹالین کی حیثیت حاصل تھی۔ افسروں کا انتخاب جبری بھرتی کے قانون کے تحت کیا گیا تھا۔ جس عورت کو موزوں سمجھا گیا، جبراً تربیت دے کر افسر بنا دیا گیا، البتہ سپاہیوں کے لیے رضاکارانہ خدمات حاصل کی گئی تھیں۔

جاپانیوں کو یہ تنظیم بنانے کا خیال کیسے آیا؟ یہ خود اپنی جگہ ایک دل چسپ داستان ہے۔ جاپان میں عورتوں کو ہمیشہ کم زور اور کم تر سمجھا جاتا رہا ہے، جن کا کام کھانا پکانا، گھر کی صفائی اور بچے پالنا ہے۔ دیہاتی عورتیں البتہ کھیتوں میں مردوں کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں جب مردوں کو فوج میں جبراً بھرتی کیا گیا تو اکثر بڑے بڑے تاجروں نے اپنا کاروبار بیویوں کو سونپ دیا۔ مردوں کی غیر موجودگی میں ان عورتوں نے حیرت انگیز معاملہ فہمی، تدبر اور مہارت کا ثبوت دیا، جس سے جاپانی حکمران متاثر

ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے نہ صرف اپنے شوہروں کا کاروبار تباہ ہونے سے بچالیا، بلکہ سپلائی لائن برقرار رکھ کر حکومت کی گراں قدر خدمات بھی انجام دیں۔

کاروبار میں عورتوں کی کامیابی اور سجھ بوجھ دیکھتے ہوئے اکثر غیر شادی شدہ فوجی اور شہری حکاّم نے کسی نہ کسی عورت کو اپنی زمینوں اور نجی کاروبار کا انتظام سونپ دیا۔ ان میں وزیرِ داخلہ جینکی ایبے بھی شامل تھا۔ اس کی نظرِ انتخاب ۴۳ سالہ ٹاکینو یاماموٹو پر پڑی۔ اس کا شوہر فوج میں اعلےٰ افسر تھا۔ برطانیہ میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے ٹاکینو کا انگریزی لب و لہجہ نہایت شستہ اور عام جاپانی عورتوں سے مختلف تھا۔ وہ تجربہ کار اور ہوشیار بھی تھی۔ جینکی ایبے اس کے ہاتھوں میں اپنا نجی کاروبار سونپ کر اطمینان سے بیٹھ رہا۔ ستمبر ۴۴ء میں اچانک اس پر انکشاف ہوا کہ ٹاکینو اسے دھوکا دے رہی ہے۔ اور ہیراپھیری سے اس کی دولت اپنے قبضے میں کر رہی ہے۔ یہ معلوم ہوتے ہی اس کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی۔ وہ اس کے دفتر میں جا پہنچا۔

"تم مجھے فریب دے رہی ہو؟" وہ غصّے سے بے قابو ہو کر چیخا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو" ٹاکینو نے مکون سے مسکرا کر کہا، "لیکن یہ تمہارے گاڑھے پسینے کی کمائی کب ہے؟ یہ دولت تم نے ملک اور قوم کو دھوکا دے کر سمیٹی ہے۔ اگر تم اس معاملے کو عدالت میں لے گئے تو تمہیں جیل کی ہوا کھانی پڑے گی، یا "ہراکری" کرنی ہوگی۔"

"اس کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ مَیں خود تمہارا گلا گھونٹ دُوں گا۔" جینکی، ٹاکینو کی طرف لپکا۔ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوسرے ہی لمحے جینکی فرش پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ اسے علم نہ تھا کہ یہ طویل قامت مضبوط جسم کی عورت اپنے شوہر اور تینوں بیٹوں سے، جو خود بھی فوج میں افسر تھے، "جوڈو" کی مشق کرتی رہی ہے۔ جینکی کی گردن اور پشت کی ہڈّی پر اس بری طرح چوٹ لگی کہ وہ بمشکل اٹھ کر کھڑا ہو سکا۔ اس نے ایک تیز نظر ٹاکینو پر ڈالی اور بڑبڑاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

دو دن تک وہ آتشِ انتقام میں جلا بُھنا مختلف منصوبے بناتا رہا، لیکن کوئی منصوبہ

کارگر ہوتا نظر نہ آیا۔ مسلسل دو راتیں جاگنے کے بعد وہ تیسرے دن صبح اٹھا تو اس کا ذہن ایک نیا منصوبہ تیار کر چکا تھا۔ وہ سیدھا وزیرِ اعظم کی اقامت گاہ پر پہنچا۔ بیرن کینٹا، روسزوکی، وزیرِ اعظم ہونے کے علاوہ شاہی افواج کا کمانڈر انچیف بھی تھا۔

"میری تجویز ہے کہ صحت مند اور مضبوط جسم کی عورتوں کو فوج میں جبراً بھرتی کیا جائے۔" اس نے تجویز پیش کی۔

"اچھا خیال ہے۔" وزیرِ اعظم نے کہا، "ہماری عورتیں مردوں کی ہم پلہ ثابت ہو رہی ہیں۔ انہیں کیمپوں کی صفائی اور لکھنے پڑھنے کا کام سونپا جا سکتا ہے۔"

"میرا مطلب ہے انہیں لڑاکا فوجی بنایا جائے۔" جینکی جلدی سے بولا، "ہم اب تک ان کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ آپ کو شاید اندازہ نہیں کہ عورتیں پھرتیلی اور ذہین ہونے کے علاوہ کتنی محنتی، طاقت ور اور مرد مار ہیں۔" وہ اپنی چوٹ سہلانے لگا۔

جاپان کو فوجیوں کی شدید ضرورت تھی۔ دور دراز کے جزیروں پر قبضہ رکھنے کے لیے آدمیوں کی بے حد کمی محسوس کی جا رہی تھی۔ کافی سوچ بچار کے بعد طے کیا گیا کہ فی الحال چھ ہزار عورتیں بھرتی کی جائیں۔ یہ رضاکار ہوں گی اور اگر تجربہ کامیاب رہا تو مزید بھرتی کی جائے گی۔ وزیرِ داخلہ کے جذبۂ حب الوطنی اور تدبر نے وزیرِ اعظم کو بے حد متاثر کیا۔

"لیکن افسر مقرر کرنے کے لیے موزوں عورتوں کو جبری بھرتی کیا جائے۔" جینکی نے جال پھینکا، "میں کم از کم ایک عورت کو جانتا ہوں، جو مناسب تربیت ملنے پر نہایت اچھی افسر بن سکتی ہے۔ اس کا شوہر اور تین بیٹے بھی فوج میں افسر ہیں۔"

اور اس طرح دائیو اساکی، تنظیم وجود میں آئی ——— دوسری عورتوں کی طرح ٹاکینو کو بھی براہِ راست جونیئر لیفٹیننٹ بھرتی کیا گیا۔ جینکی خوش تھا کہ اس کی املاک اور دولت ٹاکینو کے کام نہیں آ رہی۔ اسے صوفے، گدے، لذیذ کھانا اور عمدہ شراب چھوڑ کر کیمپوں میں چٹائی پر سونا اور ابلے ہوئے چاول، سڑے ہوئے نیم پختہ آلوؤں کے ساتھ

کھانے پڑیں گے اور چند دن بعد دشمن کی گولی اس کا خاتمہ کر دے گی۔ اگر زندہ ان کے ہاتھ آگئی تو وہ اس کا ایسا حشر کریں گے کہ مرتے دم تک یاد رکھے گی۔ چالاک ہونے کی خوش فہمی اور وجود، جاننے کا زعم ہوا ہو جائے گا۔

آیوا ساکی، تنظیم نے دوسری جنگِ عظیم میں جاپان کی ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ اراکین کو دُور دراز کے سنسان جزیروں میں تعینات کیا گیا جہاں انھوں نے مردوں کی اعانت کے بغیر اتحادیوں کا بے جگری سے مقابلہ کیا۔ شکست ہوتی نظر آئی تو ان کی ہوس کا نشانہ بننے اور فوجی راز افشا کرنے کے بجائے، ہراکری، کر لی۔ اکثر اتّحادی فوجیوں کو ان کے متعلّق علم نہ تھا جنہیں علم تھا وہ یقین نہ کر سکتے تھے کہ اپنے گھروں سے ہزاروں میل دُور غیر آباد جزیروں میں یہ تنہا عورتیں ان کے سامنے مردوں کی طرح ڈٹ سکتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے ملک میں حفاظتی انتظام کر سکتی ہوں گی۔ اگر ان سے مٹھ بھیڑ ہو بھی جاتی تو یہ اندازہ نہ ہوتا کہ وہ عورتیں ہیں یا مرد۔ وہ اس مہارت اور بے جگری سے لڑتیں کہ اتحادیوں کے چھکّے چھوٹ جاتے۔

سارجنٹ ہولنگ بھی ان ہی لوگوں میں سے تھا جنہیں، آیوا ساکی، سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ یہ جان کر کہ عورتوں سے لڑنا ہے، اسے خفّت ہو رہی تھی۔ اور جھنجھلاہٹ بھی۔ اس کا خیال تھا کہ یوناکونی میں دشمن کی آہنی طاقت سے سامنا کرنا پڑے گا، اسی لیے وہ کیل کانٹوں سے لیس ہو کر آیا تھا۔ اس کی چھوٹی سی جماعت میں پرانے تجربہ کار اور قابلِ اعتماد آدمی شامل تھے۔ ہر شخص اپنی جگہ بھاری تھا۔ اس کے علاوہ دُور مار ہلکی توپیں، ایم آئی مشین گنیں، تباہ کن دستی بم، دور تک نشانہ لگانے والی خاص قسم کی بی اے آر رائفلیں، پٹرول کے پیپے اور بارود کا ذخیرہ ساتھ تھا۔ اسے حکم دیا گیا تھا کہ یوناکونی کے فضائی اڈّے کو ہر قیمت پر تباہ اور وہاں موجود طیاروں کو نیست و نابود کرنے کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کرنی ہے کہ ہوا باز اور دوسرے فوجی زندہ گرفتار کر لیے جائیں تاکہ دشمن کے دوسرے اڈّوں کا پتا لگایا جائے۔

گشتی دستے کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق جزیرے میں سَو کے لگ بھگ فوجی

یعنی رائیوا ساکی، بٹالین اور ۲۷ ہوا باز تھے۔ ان سب کو زندہ گرفتار کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا، لیکن اس سے پہلے کہ ہوا باز اپنے طیاروں کو ٹھیک کر کے مہم پر روانہ ہو جائیں، ان کے سر پر پہنچ جانا ضروری تھا اور یہ صریحاً خودکشی تھی۔

جاپانیوں کو ان کی موجودگی کا علم ہو چکا تھا، تاہم ان کی طرف سے کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ غالباً وہ وقت ٹالنا چاہتے تھے تاکہ اس اثنا میں طیاروں کی مرمت کرنے کا وقفہ مل جائے۔ انہیں مہلت دینا خطرناک غلطی تھی۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ ان پر شب خون مارا جائے۔ سارجنٹ ہولنگ بُری طرح پھنس گیا تھا۔ اس نے سوچا گشتی دستے نے احتیاط نہیں برتی۔ اسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ جزیرے کے چپے چپے پر جاپانی دستے گشت لگا رہے ہوں گے۔ اگر ان پر گولی چلائی بھی گئی تھی تو کاپورل ٹونی کو مشین گن سے جواب دینے کے بجائے کسی طرح حملہ آور کو قابو میں کرنا چاہیئے تھا۔ صرف رائیفل فائر سے دشمن یہ سمجھتا کہ اس کے کسی گشتی دستے نے کسی وجہ سے گولی چلائی ہے، لیکن مشین گن کی آواز نے اسے خبردار کر دیا ہے۔ اب مہم کی کامیابی کا امکان پانچ فی صد بھی نہ تھا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر سارجنٹ ہولنگ نے صرف آدمیوں کو سستانے کا حکم دیا اور خود چٹان سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ سگریٹ جلایا تو نئے نئے خیالات ذہن میں آنے لگے۔ عین ممکن ہے وہ شب خون مارنے کی سوچ ہی رہا ہو کہ آئیوا ساکی، سر پر پہنچ جائیں۔ اس صورت میں چٹانوں سے نکلنا بھی ناممکن ہو جائے گا، مگر رات سے پہلے ان کا حملہ کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ سورج چھپنے سے پہلے جنگل میں رُوپوش ہو جانا چاہیے، جو ہونا ہے، ہو کر رہے گا۔ اس نے گھڑی دیکھی چار بجنے والے تھے۔ جنگل پر نظر دوڑائی، بدستور ساکن اور بھیانک تھا۔ اس نے سگنل دے کر آدمیوں کو قریب بلایا اور کہا۔

"ہم سات آدمی جنگل میں جا رہے ہیں۔ باقی آدمی اسی دراڑ میں رہیں۔ توپیں مشین گنیں اور دستی بم تیار رکھے جائیں، لیکن دشمن کو دیکھ کر کوئی حرکت نہ کی جائے

جب تک میرا سگنل نہ ملے، حملہ نہ کیا جائے۔ دراڑ سے باہر کسی صورت میں نکلا نہ جائے۔" یہ احکام دے کر اس نے کارپورل لوٹی، ٹو ڈیسک بردلسن اور پرائیویٹ لیری، ایڈ کرچ اور ہیری کو اپنے ساتھ لیا اور دراڑ سے باہر نکلا۔ چٹانوں سے ایک پتلی پگ ڈنڈی نکل کر جنگل میں گم ہو جاتی تھی۔ اس کے آگے گھاس کی بے ترتیب پگ ڈنڈی شروع ہوتی تھی۔ دونوں طرف بڑے بڑے تنوں والے قد آور گھنے درخت اور جابجا اونچے نیچے ٹیلے تھے، جو گھاس اور جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ سارجنٹ ہولنگ نے پگ ڈنڈی کے دونوں طرف محفوظ جگہ تلاش کی۔ تین آدمیوں کو ایک طرف بٹھایا اور خود باقی تینوں سمیت دوسری طرف بیٹھ گیا۔

چھ بج گئے، لیکن کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ شام کا دھندلکا چھا گیا اور جنگل تاریک تر نظر آنے لگا۔ سگریٹ پینے کی اجازت نہ تھی۔ سب آدمی حد درجے ذہنی کوفت محسوس کر رہے تھے۔ انہیں اس طرح بت بنے بیٹھے رہنا پسند نہ تھا۔ کچھ ہونا ہی ہے تو ہو کیوں نہیں جاتا۔

یکایک جنگل کی طرف سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ سارجنٹ ہولنگ اور اس کے ساتھی چوکنے ہو گئے۔ انہوں نے جنگل کی اسی طرف نظریں گاڑ دیں۔ آہستہ آہستہ آواز قریب آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کئی قدم ہولے ہولے زمین پر پڑ رہے ہوں۔ چند منٹ گزر گئے۔ سارجنٹ ہولنگ اور اس کے آدمی دم سادھے بیٹھے تھے اور پھر وہ لمحہ آ پہنچا جس کا وہ شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ تین آیوا ساکی، رائفلیں اٹھائے قطار میں دبے پاؤں چلی آ رہی تھیں۔ سب سے آگے والی مضبوط جسم چوڑے چکلے چہرے اور پکی عمر کی تھی۔ باقی دونوں کم سن تھیں۔ زیادہ سے زیادہ سولہ سترہ برس کی۔ ان کے دبلے پتلے ستے ہوئے چہروں سے بلا کی معصومیت ٹپک رہی تھی۔ امریکی سپاہیوں کو ان پر بڑا ترس آیا۔ سارجنٹ ہولنگ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ان کے پیچھے کوئی نہ تھا۔ اتنے میں وہ جنگل کے کنارے پہنچ چکی تھیں اور ان کا رخ چٹانوں کی طرف تھا۔ دفعتہً سارجنٹ ہولنگ اچھل کر کھڑا ہو گیا!

"ہاتھ اوپر اٹھالو" اس نے گرج کر کہا، "ورنہ بھون ڈالی جاؤ گی"
تینوں عورتوں نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا، لیکن کسی کو نہ پاکر تیزی سے واپس مڑیں۔ سارجنٹ نے سیٹی بجائی اور اس کے ساتھیوں نے عورتوں کو گھیر لیا۔ انہوں نے رائفلیں پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔

"عورتیں ہیں نا، اسی لیے آسانی سے ہتھیار ڈال دیے۔ مرد ہوتے تو مر جاتے، لیکن رائفلیں نہ پھینکتے ——" کارپورل نوویلیک نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اگر آیوا ساکی یہی ہیں تو پھر......" جملہ سارجنٹ ہولنگ کے منہ میں اٹکا رہ گیا۔ جنگل کی طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ تینوں عورتیں، نوویلیک، برونسن اور لیری ڈھیر ہو گئے۔ ٹونی، ایڈ کرچ اور ہیری بھی گر پڑے، سارجنٹ ہولنگ چٹانوں کی طرف منہ کر کے چلایا، "فائر"، اور کود کر ٹیلے کے پیچھے ہو گیا۔ ٹونی، ایڈ کرچ اور ہیری زخمی ہو گئے تھے۔ سارجنٹ کا حکم سنتے ہی کھسک کر ٹیلوں کی طرف بڑھنے لگے۔ جنگل کی سمت سے گولیوں کی بوچھاڑ جاری تھی اور لحظہ بہ لحظہ قریب تر آ رہی تھی۔ چٹانوں کی طرف سے بھی دور مار توپیں چلنے لگیں۔ ایک گولہ لیری کی لاش پر آ گرا اور اس کے پرخچے اڑ گئے۔ اچانک گولیاں چلنی بند ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی توپیں بھی خاموش ہو گئیں۔ پھر سکوت چھا گیا۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ سارجنٹ ہولنگ اپنی جگہ سے نکلا اور رینگتا ہوا لاشوں کے قریب گیا۔ اس نے ایڈ کرچ کے سسکنے کی آواز سنی۔ وہ گھٹنوں کے بل اس کی طرف بڑھا۔ گولی اس کے دائیں شانے میں لگی تھی اور تکلیف سے اس کے دانت بھنچے ہوئے تھے۔ سارجنٹ ہولنگ نے سگنل دیا اور دراڑ سے آدمی یکے بعد دیگرے نکلنے لگے وہ سب رینگتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، لیکن جنگل میں مکمل سکوت طاری تھا۔ آیوا ساکی، سب ماری گئیں، یا بھاگ نکلیں —— سارجنٹ ہولنگ نے سوچا اور اپنے ساتھیوں کی مدد سے زخمیوں کو اٹھا کر دراڑ میں لے گیا۔

سارجنٹ جارج شیڈلے زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے لگا تو ہولنگ بڑبڑایا، "انہوں

نے ہمیں 'پرل ہاربر' بنا دیا۔ ان تین چڑیلوں کو 'شکار' بنا کر بھیجا اور میں نادان شیر کیطرح ان کے جال میں پھنس گیا۔"

رات کی سیاہ چادر چاروں طرف تن گئی۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ کبھی کبھار زخمیوں کی کراہ سکوت کو توڑ دیتی تھی۔ اسے روکنے کے لیے ان کے منہ میں رومال ٹھونس دیے گئے۔ کہیں اور محاذ ہوتا تو انہیں خواب آور گولیاں کھلا دی جاتیں، لیکن یہاں تو رات کاٹنی محال نظر آ رہی تھی۔ ہر لحظہ بھرپور حملے کا دھڑکا تھا۔

رات بھیگنے لگی، لیکن دشمن کا کہیں نشان نہ تھا۔ سارجنٹ ہولنگ سخت بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ اس کے ساتھی ٹکٹکی باندھے جنگل کی سمت دیکھ رہے تھے تاریکی میں نظر خاک آتا؟ کہیں سے ہلکی سی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ سارجنٹ نے ٹارچ کی روشنی میں گھڑی دیکھی۔ دو بج چکے تھے۔ پھر چار بجے اور ایک گھنٹے بعد پو پھٹنے لگی۔ صبح کاذب کی دھندلاہٹ میں انہوں نے دیکھا کہ چٹانوں سے جنگل تک متعدد جھاڑیاں قدرے فاصلے فاصلے پر نسیم سحر کے جھونکوں سے حرکت کر رہی ہیں۔ ان پر نظر پڑتے ہی سارجنٹ ہولنگ چونکا۔ رات بھر میں یہ جھاڑیاں کیسے اُگ آئیں؟ آہ! آئیواساکی ——— اس کا خیال صحیح تھا۔ جھاڑیوں میں جنبش ہوئی اور دھائیں دھائیں گولے برسنے لگے۔ اس مرتبہ 'آئیواساکی' ہلکی توپیں استعمال کر رہی تھیں۔ سارجنٹ ہولنگ نے اپنے ساتھیوں کو ساکت رہنے کا حکم دیا۔ "کوئی کھانسے بھی نہیں۔" اس نے کہا۔

دس منٹ تک گولہ باری ہوتی رہی۔ گولے دراڑ کے عین اوپر آکر پھٹتے اور ان کی چنگاریاں آس پاس گرتیں، لیکن دراڑ کی دو طرفہ چٹانیں تقریباً دس فیٹ اونچی اور مخروطی تھیں۔ اوپر جا کر ان کے درمیان کوئی آدھ فٹ کا فاصلہ رہ جاتا تھا۔ سارجنٹ ہولنگ خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے پہلے ہی سے یہ جگہ منتخب کر لی تھی۔ کسی اور چٹان پر ہوتے تو کب کے بھُن گئے ہوتے۔

اب 'آئیواساکی' نے قریب آکر دستی بم پھینکنے شروع کیے۔ یہ بڑا نازک وقت تھا، مگر 'آئیواساکی' دستی بم پھینکنے کی ماہر نہ تھیں۔ بہت سے بم چٹانوں سے دور جا رہے

تھے۔ مزید دس منٹ تک یہ سلسلہ جاری رہا، پھر اچانک بند ہو گیا۔ سارجنٹ ہولنگ نے درز میں سے جھانک کر دیکھا اور اندازہ لگایا کہ تیس کے قریب جھاڑیاں ہوں گی۔ ایک جھاڑی میں اگر تین عورتیں بھی فرض کر لی جائیں تو گویا آئیوا ساکی، اپنی پوری طاقت سے مقابلے پر آگئی تھیں۔

"سارجنٹ شیڈلے" اس نے آہستہ سے کہا۔ سارجنٹ شیڈلے کھسک کر اس کے قریب آیا۔

"وقت ضائع کرنا فضول ہے" سارجنٹ ہولنگ نے اس کے کان میں کہا "یہ تقریباً نوّے عورتیں ہیں یعنی پیچھے صرف دس بارہ رہ گئی ہوں گی۔ اگر ان کا خاتمہ کر دیا جائے تو سمجھو میدان مار لیا۔ اُدھر ہوا باز، طیارے ٹھیک کرنے میں لگے ہوں گے۔ یہ ہمیں یہاں گھیرے رہیں گی اور وہ اپنا کام کر جائیں گے۔ بہتر ہے کہ ہلّہ بول دیا جائے۔"

سارجنٹ شیڈلے آرمی میڈیکل کور کا آدمی تھا۔ فوج میں شامل ہونے سے پہلے وہ ڈاکٹر تھا اور اسی حیثیت میں بھرتی ہوا تھا۔ دشمن عورتیں تھیں، لیکن بہر حال دشمن تھیں اور انہیں اپنا فرض پورا کرنا تھا۔ ڈاکٹر پیچھے ہٹ گیا۔ فوجی سامنے آگیا۔

"ٹھیک ہے" اس نے رائے دی۔ سارجنٹ ہولنگ نے فاصلے کا اندازہ لگایا۔ تیس گز سے زیادہ نہ ہوگا۔ اس کی ہدایات ایک دوسرے کے ذریعے سب تک پہنچ گئیں۔

"فائر" وہ چلایا۔ دشمن پر توپوں، مشین گنوں اور دستی بموں سے بوچھاڑ کر دی گئی۔ اسے سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملا۔ آئیوا ساکی، جھاڑیاں ہٹا ہٹا کر نکل بھاگیں۔ کئی بھاگتی ہوئی ڈھیر ہو گئیں۔ سب سے زیادہ دستی بم کارگر ہو رہے تھے۔ پندرہ منٹ تک زبردست گولہ باری کے بعد مخالف سمت سے کوئی جواب نہ پا کر توپیں اور مشین گنیں خاموش ہو گئیں، البتہ اکّا دکّا دستی بم پھینکا جاتا رہا۔ جھاڑیاں تتّر بتّر ہو چکی تھیں اور ان میں توپیں، مشین گنیں، رائفلیں اور لاشیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

وقت ضائع کیے بغیر سارجنٹ ہولنگ نے اپنے آدمیوں کو آگے بڑھنے کا حکم

دیا۔ توپیں چار، مشین گنیں چھ اور لاشیں تیس تھیں۔ مرنے والی عورتوں کی عمریں اٹھارہ اور پچیس سال کے درمیان تھیں۔ گشتی دستے کے دو آدمیوں، پرائیویٹ کروگ اور جورڈزی کو آگے کر کے سارجنٹ ہولنگ پیٹرول کے پیپے، بارود اور اسلحہ لیے جنگل میں گھس گیا۔ تینوں زخمی اور چار آدمی درواڑ میں چھوڑ دیے گئے۔ ان سے کہا گیا کہ اگر شام تک سارجنٹ ہولنگ اور اس کے ساتھی نہ لوٹیں تو وہ وائرلیس کے ذریعے اوکی ناوا کے قریب گزرتے ہوئے جہازوں سے رابطہ قائم کریں اور انہیں بتائیں کہ مہم ناکام ہوگئی۔

تقریباً چار میل تک چلنے کے بعد کروگ اور جورڈزی رک گئے اور درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کیا۔ سارجنٹ ہولنگ نے دوربین سے دیکھا تو لکڑی کا بنا ہوا ایک بڑا کیبن سا نظر آیا۔ اندازہً کوئی سو فیٹ لمبا اور تیس فیٹ چوڑا ہوگا۔ اس میں ایک ہی دروازہ تھا۔ کھڑکی کوئی نہ تھی۔ اس پر ناریل کے پتوں کا چھپر تھا۔

"ہوائی اڈہ اس کے پیچھے ہے"، جورڈزی نے سرگوشی میں کہا۔

"کتنے فاصلے پر؟" سارجنٹ ہولنگ نے پوچھا۔

"تقریباً دس گز پر۔" جواب ملا۔ سارجنٹ ہولنگ سمیت کل ۱۴ آدمی تھے۔ ہواباز، گزشتہ روز کی اطلاع کے مطابق ۲۷ تھے۔ ان کے علاوہ 'آیوا ساکی' کی نامعلوم تعداد الگ تھی۔ اگر ہوائی اڈے پر توجہ مرکوز کی جاتی تو پیچھے سے 'آیوا ساکی' کے طوفانی حملے کا خطرہ تھا، اگر پہلے ان پر قابو پانے کی کوشش کی جاتی تو ہواباز سر پر آ پہنچتے تاہم کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ضروری تھا۔

"آٹھ آدمی اس جگہ مورچہ بنالیں۔ خدا کا شکر ہے کہ بارک کا ایک ہی دروازہ ہے۔ 'آیوا ساکی' باہر نکلیں تب ہی گولہ باری کی جائے، ورنہ نہیں۔" اس نے حکم دیا اور جورڈزی اور کروگ سمیت باقی آدمیوں کو لے کر بارک کی دوسری طرف بڑھا۔ اس مقام سے بارک تقریباً پچاس گز کے فاصلہ پر تھا۔ اس کے آگے دس گز کا فاصلہ اور تھا۔ دن کی روشنی میں یہ ساٹھ گز کا فاصلہ، ساٹھ کوس لگ رہا تھا۔ ہر قدم پر دل دھڑکتا کہ بارک

میں سے کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔ سارجنٹ ہولنگ کے ساتھیوں میں سے دو ہلکی توپ کھینچ رہے تھے۔ ایک کے پاس پیٹرول سے لبریز دس بوتلیں تھیں، دو نے مشین گن سنبھال رکھی تھی۔ سارجنٹ ہولنگ کے پاس اسٹین گن تھی۔ دستی بم ہر شخص کے پاس تھے۔ اس موقع پر رائفلیں رکھنے کا کوئی جواز نہ تھا۔

بارک تک پہنچنے پر بھی کوئی سانحہ پیش نہ آیا تو سارجنٹ ہولنگ نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے اطمینان کا سانس لیا۔ اب ان کا گروہ بارک کے عین عقب میں تھا۔ سارجنٹ ہولنگ نے نظریں دوڑا کر جائزہ لیا۔ لکڑی کے بڑے بڑے ناہموار تختوں کی دیوار تھی۔ بعض تختوں میں اتنا فاصلہ تھا کہ اندر سے باہر کا منظر بخوبی دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ پختہ چھت کی جگہ پتوں کے چھپر، دیوار سے صرف اتنے اونچے تھے کہ ان میں سے انسانی سر بہ آسانی باہر نکل سکتے تھے۔ بارک کیا تھی، ایک قلعہ تھا جس کے اندر والے ہر طرح محفوظ اور باہر والے قطعی غیر محفوظ تھے۔ اگر وآیواساکی دیکھ لیں تو انہیں دروازے سے باہر نکلنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ اندر بیٹھے ہی بیٹھے انہیں بھون سکتی تھیں۔ یہ صورتِ حال انتہائی جان لیوا تھی، لیکن اس کا سامنا کرنے کے سوا دوسرا راستہ نہ تھا۔

بارک سے قدرے فاصلے پر درختوں کا جھنڈ تھا۔ سارجنٹ ہولنگ کے حکم سے توپ کو اس میں لے جایا گیا۔ کارپورل شیل، کارپورل ہال اور پرائیویٹ ٹیلر کو ہدایات دی گئیں کہ اگر وآیواساکی نے بارک کی اس سمت سے ذرا بھی حرکت کی، تو وہ توپ اور مشین گن بلا تامل حرکت میں لے آئیں۔ اس کے بعد سارجنٹ ہولنگ، پرائیویٹ کروگ اور جورڈزی سمیت ایک مشین گن، ایک اسٹین گن اور پیٹرول کی بوتلیں لیے آگے بڑھا، لیکن چند قدم چل کر اسے رک جانا پڑا۔ اس جگہ درختوں کے جھنڈ ختم ہو گئے تھے اور سامنے زمین ہموار کر کے ایک کچا ہوائی مستقر بنایا گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ سو گز لمبا اور تیس گز چوڑا ہو گا۔ بارک کا طول و عرض بھی اتنا ہی تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ بارک کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ اس وقت صرف چار تارپیڈو طیارے کھڑے تھے گویا

تین اتنے عرصے میں اپنی مہم پر روانہ ہو چکے تھے۔ سارجنٹ ہولنگ کو حیرت ہوئی کہ اس کی پارٹی پر تارپیڈو سے حملہ کیوں نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ ان کی مہم زیادہ اہم تھی۔ اس نے ہوابازوں کی تعداد گننے کی کوشش کی، لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ جاپانی اس پھرتی سے ورک شاپ میں داخل ہوتے اور نکلتے کہ نظر چوک جاتی۔ اس کے علاوہ طیاروں کے اندر بیٹھ کر بھی کام کیا جا رہا تھا۔ اصولاً ۱۲ آدمی ہونے چاہئیں، سارجنٹ ہولنگ نے سوچا۔

ورک شاپ ایک اور آدمی کم ہونے کی وجہ سے طیارے قریب قریب کھڑے تھے۔ ان کا درمیانی فاصلہ گز بھر سے زیادہ نہ تھا۔ حملہ آور پارٹی کے لیے یہ اچھی علامت تھی۔

"تم دونوں میں بہتر نشانہ کس کا ہے؟" سارجنٹ ہولنگ نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔

"میں کرکٹ کھیلتا رہا ہوں" کروگ نے کہا۔

"اچھا تو باؤلنگ کے لیے تیار ہو جاؤ" اس نے حکم دیا۔

"ڈِسک تھروئنگ میں تو میں بھی بُرا نہ تھا" جورڈزی نے مُنہ بنا کر کہا۔ سارجنٹ ہولنگ ہنس پڑا۔

"تم دونوں کا انتخاب اسی لیے تو کیا گیا ہے۔ میں اپنی پارٹی کے ہر آدمی کے متعلق پوری پوری معلومات رکھتا ہوں" سارجنٹ ہولنگ نے کہا، "اچھا غور سے سنو، پانچ سیکنڈ میں پٹرول کی دو دو بوتلیں طیاروں پر اور ایک ایک بوتل ورک شاپ پر پھینکنی ہے۔ اس طرح ایک آدمی طیاروں پر چار اور ورک شاپ پر ایک بوتل پھینکے گا۔ دو بوتلوں کے بعد تیسری ورک شاپ پر پھینکی جائے گی۔ جورڈزی تمہاری ڈسک تھروئنگ دائیں طرف کے طیاروں پر ہوگی، اور کروگ، تم بائیں طرف کے طیاروں پر باؤلنگ کرو گے۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک" دونوں بیک زبان بولے۔

"ون، ٹو...... تھری" سارجنٹ ہولنگ کے منہ سے نکلا اور اس کے

ساتھ ہی طیّاروں اور ورک شاپ پر بوتلیں برسنے لگیں۔ سارجنٹ ہولنگ کے
ہاتھ تیزی سے دستی بموں پر چلنے لگے۔ یکے بعد دیگرے دھماکوں سے جنگل گونج
اٹھا اور طیّارے آگ کے سُرخ شعلوں میں نظروں سے چھپ گئے۔ اس کے
ساتھ ہی عقب سے توپیں اور مشین گنیں چلنے کی آواز آئی۔ سارجنٹ ہولنگ نے
اپنے ساتھیوں کو جھنڈ میں دبک جانے کا اشارہ کیا اور خود اسٹین گن لیے سینے کے بل
رینگنے لگا۔ طیّاروں میں رکھے ہوئے بم زبردست دھماکوں کے ساتھ پھٹ رہے
تھے اور آگ کے گولے دُور دُور تک گر رہے تھے۔ سارجنٹ ہولنگ کے لئے
آگے بڑھنا ممکن نہ رہا تھا، وہ پیچھے لوٹ آیا اور اپنے ساتھیوں سے مل گیا طیّارے
دھڑ دھڑ جل رہے تھے۔ ورک شاپ زمین بوس ہو چکی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک
بہت بڑا الاؤ روشن ہے۔ زمین سے آسمان تک شعلوں اور دھوئیں کی ایک دبیز چادر
تن گئی تھی، جس پر شعلے بھُوتوں کی طرح ناچ رہے تھے ——— عقب سے
گولہ باری کی آواز بدستور آ رہی تھی۔

اس کام سے فارغ ہو کر سارجنٹ ہولنگ اپنے ساتھیوں کو لے کر پیچھے مڑا
بارک پر دوطرفہ حملہ ہو رہا تھا۔ اس میں سے بھی آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔
اس نے ہدایت دی تھی کہ کم سے کم جانی نقصان کیا جائے اور دشمن کی زیادہ سے
زیادہ تعداد زندہ گرفتار کی جائے، لیکن وا آیوا ساکی، ڈٹ کر مقابلہ کر رہی تھیں دوسرے
لفظوں میں وہ ہراکری، پر تُل گئی تھیں۔ یہ تشویش ناک بات تھی۔ وہ تیزی سے آگے
بڑھا۔ بارک کا بڑا حصّہ کوئلے کا جلا ہوا ملبہ بن چکا تھا اور گولہ باری رکنے میں نہ آتی
تھی۔ معاً بارک کے دروازے پر متعیّن دستے نے ہاتھ روک لیا۔ سارجنٹ ہولنگ نے
بھاگ کر عقبی دستے کو بھی گولہ باری سے روک دیا۔ فضا اب بھی طیّاروں میں پھٹنے
والے بموں کی آواز سے گونج رہی تھی، لیکن بارک کے قریب مکمّل سکوت تھا۔ سارجنٹ
ہولنگ عقبی دستے کو لے کر آگے بڑھا۔

درختوں کے جھنڈ سے نکل کر اس نے دیکھا کہ گیارہ آیوا ساکی، قطار میں کھڑی ہیں

اور اس کے ساتھی ان کے گرد حلقہ ڈالے کھڑے ہیں۔ وہ ان کے قریب پہنچا تو قطار میں کھڑی پہلی عورت نے اس کی وردی پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور نہایت شستہ انگریزی میں بولی، "مبارک ہو سارجنٹ"۔

سارجنٹ ہولنگ بھونچکا سا رہ گیا۔ اس نے اسے غور سے دیکھا۔ خاصے مضبوط جسم کی عورت تھی۔ اس کے چہرے سے خوف کی جگہ رُعب ٹپک رہا تھا۔ وردی سے افسر لگتی تھی۔

"میں اس دستے کی کمانڈر ہوں، سارجنٹ ٹاکینو یاماموٹو"۔ اس نے اپنا تعارف کرایا۔

سارجنٹ ہولنگ نے ہاتھ بڑھایا، لیکن اس نے ہاتھ ملانے سے انکار کر دیا۔

"تم نے اتنی جلد ہتھیار ڈال دیے؟"، سارجنٹ ہولنگ نے جھینپ مٹانے کے لیے طنزاً پوچھا۔

"ہم سے کیا سلوک کیا جائے گا۔؟"، سارجنٹ ٹاکینو نے اس کا سوال نظر انداز کر کے کہا۔ سارجنٹ ہولنگ نے کوئی جواب نہ دیا اور آگے بڑھ گیا۔ چند قدم چل کر اس نے پیچھے دیکھے بغیر حکم دیا۔

"مارچ"

چٹانوں کے قریب پہنچ کر قیدیوں کی تلاشی لی گئی اور سب کچھ چھین لیا گیا۔ سارجنٹ ہولنگ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ہر قیدی کے پاس ایک نہایت تیز پھل والا چھوٹا سا چاقو ہے۔

"یہ کس لیے؟"، اس نے ایک چاقو اٹھا کر پوچھا۔

"اس لیے کہ اگر تم امریکی ہماری عزت سے کھیلنے کی کوشش کرو تو ہم اپنی جان دے سکیں"، سارجنٹ ٹاکینو نے کہا۔

"خوب، یعنی ہراکری"، سارجنٹ ہولنگ زیرِ لب مسکرایا، "لیکن تم نے ایسا فرض کیوں کر لیا؟"

"فرض نہیں کیا، حقیقت ہے"، سارجنٹ ٹاکینو نے سپاٹ لہجے میں کہا، "ہر

محاذ پر یہی ہوا ہے۔"

"ہر جگہ 'آیوا ساکی' نے ہرا کری کر لی؟" سارجنٹ ہولنگ نے ازراہ مذاق کہا۔

"خوش نصیب تھیں وہ جنہیں اس کا موقع مل گیا۔" ٹاکینو نے افسردگی سے کہا اور ہولنگ خاموش ہو گیا۔ دن کا باقی حصہ زخمیوں کی دیکھ بھال اور کھانے پینے میں گزرا۔ رات آ گئی۔ سارجنٹ ٹاکینو اور اس کی ساتھیوں کے زرد چہرے خوف و ہراس سے بھیانک نظر آنے لگے۔ دراڑ ان کے لیے مخصوص کر دی گئی اور سارجنٹ ہولنگ نے اپنے آدمیوں کو آس پاس کی چٹانوں پر پھیل جانے کو کہا۔ صبح تک پہرے داروں کی تبدیلی کے سوا کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔

صبح قیدی اٹھے، تو ان کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔ خوف کی جگہ آنکھوں میں معصومانہ چمک تھی۔

"ہمیں نہانا ہے۔" ٹاکینو نے کہا۔

"ہرا کری چاقو کی بجائے پانی سے کرنی ہے!" سارجنٹ ہولنگ نے ہنس کر کہا۔ وہ بھی ہنس پڑی اور بولی،

"ہمیں اس کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔"

انہیں سمندر کی طرف جانے کی اجازت دے دی گئی، البتہ ساحل کے کنارے چٹانوں کی اوٹ میں آدمی تعینات کر دیے گئے کہ اگر 'آیوا ساکی' خودکشی کرنے کی کوشش کریں تو وہ پانی میں چھلانگ لگا کر انہیں پکڑ لیں۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد سب کی سب پانی سے باہر نکلیں اور سارجنٹ ہولنگ نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب وہ کافی بے تکلف ہو گئی تھیں، لیکن ان کی کمانڈر کے سوا کسی کو انگریزی نہیں آتی تھی۔ تاہم سارجنٹ ہولنگ کے ساتھی ٹاکینو کے ذریعے ان سے مزے مزے کی باتیں کرتے اور لطف اندوز ہوتے رہے۔ ان پر 'آیوا ساکی' کے کارناموں کے متعلق بڑے بڑے انکشاف ہوئے جن سے انہیں حیرت بھی ہوئی اور اپنے ملک پر غصہ بھی آیا۔

دوپہر کے قریب اچانک ٹاکینو کے رویے میں تبدیلی آ گئی۔

"سارجنٹ، میں اپنی زیر کمان عورتوں کو تمہارے ساتھیوں سے ہنسنے بولنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔" اس نے درشتی سے کہا۔ اس کی ساتھیوں کے منہ لٹک گئے اور ان کی زبانوں پر تالے لگ گئے۔

"مادام، تم اب کمانڈر نہیں ہماری قیدی ہو۔" سارجنٹ ہولنگ نے خشک لہجے میں جواب دیا، "تم اور تمہاری ساتھی عورتیں میری کمان میں ہیں۔"

ٹاکینو خاموش ہو گئی، لیکن کچھ دیر بعد اس نے اپنی ساتھیوں سے جاپانی میں کچھ کہا اور وہ پھر چہکنے لگیں۔

سہ پہر کے قریب "ٹرپیپے" کچھ فاصلے پر لنگر انداز ہوا۔ سارجنٹ ہولنگ قیدیوں اور زخمیوں کو لے کر اپنے ساتھیوں سمیت ربڑ کی کشتیوں پر سوار ہو گیا۔ "آیوا اساکی" تنظیم کی داستان، سارجنٹ ٹاکینو نے "ٹرپیپے" میں امریکی افسروں کو سنائی۔ سارجنٹ ہولنگ کو فخر تھا کہ اس نے اس عظیم تنظیم کے قیام کی ذمے دار عورت کو امریکا کا جنگی قیدی بنایا ہے۔

ایراوتی کا پُل

آسام میں سخت جانی نقصان اٹھانے کے بعد جاپانی برما میں دور تک پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ برطانوی اور ہندوستانی دستے ان کے تعاقب میں تھے۔ ۱۹۴۴ء کے اواخر تک یوں لگتا تھا، جیسے جاپانی افواج کا کمانڈر منڈالے کے شمال مغرب میں واقع پیائی ایراوتی اور چنڈون کی جغرافیائی پوزیشن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا دفاع مستحکم کرے گا، لیکن بعد کے حالات سے اتحادیوں کو یقین ہو گیا کہ اس کا ارادہ دریائے ایراوتی کے پیچھے مضبوط مورچے قائم کرنا ہے۔ اتحادیوں کے منصوبے کے تحت ان کی ۳۳ ویں کور کو منڈالے تک دھکیلنا اور چوتھی کور کو جنوب میں وادیٔ گنگا تک پہنچ کر دریائے ایراوتی کو عبور کرنا اور میکٹیلا پر قبضہ کرنا تھا، جو اتحادیوں کی چودھویں آرمی کے خلاف جاپانیوں کی فوجی کارروائیوں کا اہم ترین مرکز تھا۔ اس طرح چوتھی کور دشمن کی تمام ڈویژنوں کے عین وسط میں پہنچ جاتی، جنہوں نے اتحادیوں کی ۳۳ ویں کور کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ایراوتی کو عبور کرنے کا کام چوتھی کور کی ساتویں انڈین ڈویژن کو ۲۵۵ ٹینک بریگیڈ کے ساتھ دریا پار کر کے میکٹیلا پر قبضہ کرنا تھا۔ ۱۹ جنوری ۴۵ء کو چوتھی کور نے وادیٔ گنگا سے پاکو کو اور دریائے ایراوتی کی سمت بڑھنا شروع کیا۔ گھنے جنگلوں کا یہ دشوار گزار راستہ ۴۵ میل لمبا تھا۔

میں نے اٹھ دسمبر ۱۹۴۴ء کو ساتویں انڈین ڈویژن کی کمان سنبھالی، جس کا ہیڈکوارٹر

ٹامو نامی ایک گاؤں کے قریب تھا۔ اس گاؤں کی اذیت ناک یاد فوجیوں اور غیر فوجیوں کے ذہن میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ دریائے چنڈون کے کنارے واقع وادی کباؤ کے گھنے جنگلوں کے سرے پہ آباد یہ پُرسکون برمی گاؤں جنگ سے پہلے غیر معروف تھا۔ کبھی کبھار کوئی اکاڈکا یورپین کسی سیاسی یا تجارتی مقصد سے یہاں آنکلتا تھا۔ اسے ہندوستان اور امپھال سے ملانے والا ۷۰ میل لمبا راستہ ناقابلِ عبور پہاڑیوں میں سے گزرتا تھا۔ بارش کے دنوں میں یہ راستہ قطعاً بند ہو جاتا۔ گزشتہ دو سال سے ٹامو اتحادیوں اور جاپانیوں کی جھڑپوں کا مرکز بنا ہوا تھا، یہ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے۔ جب میں ۱۹۴۴ء میں یہاں پہنچا تو صورتِ حال قدرے مختلف تھی۔ گاؤں اجڑا ہوا تھا، مگر امپھال تک ٹینکوں کی آمدورفت کے لیے سڑک بنائی جا چکی تھی۔ اس پہ فوجیوں اور ٹٹوؤں سے لدے ٹرک دوڑتے نظر آرہے تھے۔ ہر وقت گہماگہمی رہتی تھی۔ سارا علاقہ اتحادیوں کی نقل و حرکت کے لیے کھلا تھا۔

کمان سنبھالنے کے بعد مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ اراکان محاذ کے میرے تمام ساتھی یہاں موجود تھے۔ رِٹم ہیلی توپ خانے کا کمانڈنگ آفیسر تھا۔ ہیوے فرسٹ گریڈ اسٹاف آفیسر ایلن کرو تھر ۸۹ بریگیڈ کا کمانڈنگ آفیسر اور رنگ کول بھی آس پاس ہی کہیں تھا۔ ساتویں انڈین ڈویژن کا کمانڈر فرینک میسروی، جس سے میں نے چارج لیا تھا، ترقی پا کر چوتھی کور کی کمان کر رہا تھا۔ اس کا ہیڈکوارٹر ۴۰ میل دُور جنوب میں تھا۔ ہیوے نے مجھے بتایا کہ ہماری پوری فوج دو سو میل سے زیادہ علاقے میں پھیلی ہوئی ہے۔ ایک سو چودھویں بریگیڈ ابھی آگے بڑھی تھی۔ ۸۹ ویں بریگیڈ ایک دو روز میں کسی قریبی مقام پر جمع کی جانے والی تھی، لیکن ۳۳ ویں بریگیڈ ڈیڑھ سو میل دور کوہیما میں تھی اور اس کے بغیر ہماری پیش قدمی ممکن نہ تھی۔

اگلے دن میں طیارے میں بیٹھ کر فرینک میسروی سے ملنے اس کے ہیڈکوارٹر پہنچ گیا۔ اس نے وقت ضائع کیے بغیر مجھے سارا منصوبہ بتایا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ جاپانیوں کو بالکل تاریکی میں رکھا جائے اور جہاں تک ممکن ہو، انہیں دھوکا دیا

جائے۔ اس مقصد کے لیے متعدد منصوبے بنائے گئے تھے۔ حال ہی میں گیارہویں ایسٹ افریقن ڈویژن، جس نے جاپانیوں کو وادی کباؤ میں شکست دی تھی، ہندستان بھیج دی گئی تھی۔ چوتھی کور کے پروگرام کو راز میں رکھنے کے لیے طے کیا گیا کہ جاپانیوں کو یہ نہ بتایا جائے کہ وہ ہٹالی گئی ہے۔ اس کے برعکس انہیں یہ تاثر دیا جائے کہ اس کا رُخ وادیٔ گنگا کی سمت ہے۔ اس وقت وادیٔ گنگا میں لوشائی بریگیڈ تعینات تھی، جو اراکان کے شمال میں واقع لوشائی کے پہاڑی باشندوں پر مشتمل تھی۔ منصوبے کے مطابق ہندستان سے اٹھائیسویں بریگیڈ کو منگوا کر لوشائی بریگیڈ کی جگہ وادیٔ گنگا میں تعینات کرنا تھا۔ وقت آنے پر اسے ساتویں انڈین ڈویژن کا ایک حصّہ بن کر، یہ ظاہر نہ کرتے ہوئے آگے بڑھنا تھا کہ اس کے پیچھے ساتویں انڈین ڈویژن اور چوتھی کور ہے۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ پیش قدمی اور حملے کے دَوران میں وائرلیس بالکل استعمال نہ کیا جائے۔ اس فیصلے پر عمل مشکل نظر آتا تھا، کیوں کہ تین سو میل علاقے میں پھیلے ہوئے دستوں میں رابطہ قائم رکھنا آسان نہ تھا، جب کہ چار سو گھنے جنگل تھے اور جن میں دشمن نہ جانے کہاں دبکا بیٹھا تھا۔

فرینک میسروی نے بتایا کہ ۲۰ جنوری سے پہلے وادیٔ گنگا سے روانگی مشکل ہے، تاہم ہر ممکن کوشش کی جائے گی، کیوں کہ ۱۵ فروری سے پہلے پاکوکو اور چاوک کے درمیان کہیں نہ کہیں دریائے ایراوتی کو عبور کرنا ضروری تھا۔ مقام کا تعیّن طیارے سے لی گئی تصویروں اور مزید معلومات حاصل کرنے کے بعد کیا جاتا تھا۔ بالفاظ دیگر چھبیس روز میں ڈویژن کو گھنے جنگلوں سے پُر، ۴۵۰ میل لمبا دشوار ترین فاصلہ طے کر کے گنگا سے پاکوکو تک پہنچنا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے تھا کہ دریا کے دوسرے کنارے پر دشمن کی فوج ہماری منتظر ہو گی۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ ہمیں کالیمیو سے جنوب کی سمت بیل گاڑی کے کچّے راستے کو اتنا پختہ اور ہموار کرنا تھا کہ اس پر ۲۲۵ ٹینک بریگیڈ اور دریا کو عبور کرنے کے لیے ضروری سامان آلات اور کشتیوں سے لدی لاریاں آسانی سے گزر سکیں۔ ان کے بغیر ٹینکوں، توپوں اور اسلحے کو دریا کے پار لے جانا ممکن نہ تھا۔

ہماری بات چیت اتنی طویل ہو گئی کہ میرے لیے ٹامو واپس جانا ممکن نہ رہا، چنانچہ

رات ہیڈ کوارٹر ہی میں کاٹنی پڑی — ساری رات میں سوچتا رہا کہ یہ مہم کیسے سر کی جائے وقت کم تھا اور جاپانیوں کی طرف سے رخنہ اندازی کا پورا یقین تھا۔

منصوبے کے تحت ہمیں یکم فروری تک پاوک پر قبضہ کر لینا تھا، جو ۷۰ میل کے فاصلے پر تھا۔ میں اٹھ کر نقشہ دیکھنے لگا کہ شاید کوئی ایسا راستہ مل جائے، جو قریب ترین ہو اور جس میں جاپانیوں سے مڈھ بھیڑ کا خطرہ بھی نہ ہو۔ قریب ترین راستہ ایک گھنے جنگل میں نظر آیا، لیکن بدقسمتی، اس میں سے ٹینک اور لاریاں گزر نہ سکتی تھیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی یقین نہ تھا کہ راستے میں پانی دست یاب ہو گا اور ٹٹوؤں کے لیے پانی ضروری تھا۔ پانی کے علاوہ بریگیڈ کا انتخاب بھی دقت طلب تھا، کیوں کہ جنگل گھنا ہونے کی وجہ سے ٹٹوؤں کے ذریعے ایک ہی بریگیڈ بھیجی جا سکتی تھی۔

اگلی صبح دونوں مشکلیں حل ہو گئیں۔ مقامی ذرائع سے معلوم ہوا کہ کہیں کہیں پانی موجود ہے اور ایلن کروڈھر کی ۸۹ ویں بریگیڈ بھی موزوں نظر آئی۔ وہ متواتر تین سال سے مختلف محاذوں پر لڑ رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ جنگلوں میں لڑنے کا ماہر تھا۔ اس کی کمان میں لڑنے والی کنگز اون اسکاٹش بارڈرز بٹالین، گیارھویں سکھ رجمنٹ اور آٹھویں گورکھا رائفلز بھی تجربہ کار تھیں اور اراکان اور امپھال میں دادِ شجاعت دے چکی تھیں۔ مجھے اپنے انتخاب پر اطمینان محسوس ہوا۔

وادیٔ گنگا میں جاپانیوں کے قدم پوری طرح جمے ہوئے تھے۔ انہوں نے مضبوط مورچے بنا رکھے تھے۔ طے کیا گیا کہ ایک بھرپور فضائی حملہ کر کے انہیں ۱۰ جنوری سے پہلے پسپا کر دیا جائے تاکہ لوشائی بریگیڈ گنگا گاؤں پر قبضہ کر لے اور ساتویں ڈویژن کو پیش قدمی کا موقع مل جائے۔ مقررہ دن میں، فرینک میسروی، آرمی کمانڈر جنرل سلم اور برطانوی فضائیہ کے اعلا افسروں کی معیت میں ہوائی حملے کا منظر دیکھنے گیا۔ حملہ کامیاب رہا جاپانی مورچوں کے پرخچے اڑ گئے اور لوشائی بریگیڈ نے گنگا گاؤں پر قبضہ کر لیا۔ اس کے دو دن بعد اٹھائیسویں ایسٹ افریقن بریگیڈ بھی پہنچ گئی اور اس نے لوشائی بریگیڈ کی جگہ پوزیشن سنبھال لی۔ سارا کام منصوبے کے عین مطابق ہوا۔ اب دریائے ایراوتی کی

سمت کوچ باقی رہ گیا۔ فیصلہ کیا گیا کہ تمام رسد اور خوراک طیاروں کے ذریعے فراہم کی جائے گی۔ اس کے لیے راستے بھر میں مختلف مقامات پر عارضی ہوائی اڈے بنانے تھے۔ یہ کوئی دشواریات نہ تھی، خزاں کا موسم تھا، کھیت خشک ہو کر پتھریلے بن گئے تھے۔ جدید مشینوں اور آلات کے ذریعے انہیں طیاروں کے اترنے کے قابل بنانا آسان تھا۔ سب سے پہلا ہوائی اڈہ کان کے مقام پر بنایا گیا، جو ڈویژن ہیڈ کوارٹر سے زیادہ دُور نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی انجینئر جنگل کو صاف کر کے بھاری ٹینکوں اور لاریوں کے لیے راستہ بنانے میں مصروف ہو گئے۔

۱۸ جنوری کی شام تک دریا کو عبور کرنے کا ابتدائی مرحلہ طے ہو گیا۔ میں نے شام کا دھندلکا نمودار ہونے سے پہلے ۸۹ ویں بریگیڈ کا معائنہ کیا، جو روانگی کے لیے آخری تیاریاں کر رہی تھی۔ اس میں دو ہزار آدمیوں پر مشتمل تین بٹالین تھیں۔ اس نے دو روز کا راشن ساتھ لیا تھا اور فیصلہ کیا گیا تھا کہ اس کے بعد طیاروں کے ذریعے خوراک اور رسد مہیا کی جائے گی۔

۱۹ جنوری کو کوچ کا حکم دیا گیا۔ اتحادی فوجیں کئی طرف سے دریائے ایراوتی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ مشرق میں لوشائی اسکاؤٹس تھے۔ اس سے کچھ فاصلے پر ۴/۱ پنجاب رجمنٹ دریائے چنڈون کے دائیں کنارے کے ساتھ ساتھ بڑھ رہی تھی۔ گنگا گاؤں میں اٹھائیسویں ایسٹ افریقن بریگیڈ تھی۔ اس کے پیچھے ۱۱۴ ویں بریگیڈ تھی، جس کی کمان مشہور کمانڈر بریگیڈیر ایچ، ڈبلیو، ڈن وڈی کر رہا تھا، جو اراکان میں ۱/۱۱ سکھ رجمنٹ کی کمان کر چکا تھا۔ اٹھائیسویں ایسٹ افریقن ڈویژن کو گنگا سے آگے بڑھنے کا حکم دیا گیا۔ حسب توقع دشمن نے مزاحمت کی، لیکن اس کے قدم اکھڑ گئے۔ اس نے بھاگتے ہوئے راستے میں بڑے بڑے درخت گرا کر ہماری پیش قدمی روکنے کی کوشش کی، مگر انہیں مشینوں اور ہاتھیوں کی مدد سے ہٹا دیا گیا اور پیش قدمی جاری رہی۔ ۲۲ جنوری کو رجمنٹ ٹمگلین پہنچ گئی۔ اب ۸۹ ویں بریگیڈ کے لیے راستہ صاف تھا، چنانچہ اس نے ۲۷ جنوری کو متعینہ تاریخ سے چار دن پہلے، پادک پر قبضہ کر لیا۔ دریں اثنا ۳۲ ویں

بریگیڈ بھی کوہیما سے چل پڑی تھی۔ میں نے طے کیا کہ اسے جھڑپوں میں استعمال نہ کیا جائے، بلکہ ایراوتی کو عبور کرنے کے لیے مکمل تربیت دی جائے۔ میں نے اس ضمن میں احکامات صادر کر دیے، چنانچہ کشتیاں حاصل کی گئیں، ان میں بیٹری سے چلنے والے انجن لگائے گئے اور ایک قریبی چھوٹے سے دریا پر تربیت شروع کر دی گئی۔

حالات نے ثابت کر دیا تھا کہ ہم جاپانیوں سے لڑنے اور ایراوتی کو عبور کرنے کے منصوبوں پر بیک وقت کام نہیں کر سکتے، لیکن ان کاموں کو ایک ہی وقت میں کیا جانا بھی اشد ضروری تھا۔ بہرحال دریا عبور کرنے کا منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیئے ایک علیحدہ گروپ بنایا گیا، جس کا جنگ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس گروپ میں ڈویژن ہیڈکوارٹر، ۳۲ ویں بریگیڈ، انجینئروں اور سراغ رساں عملے کے نمائندے شامل کیے گئے۔

یادک پر قبضہ ہو جانے کے بعد اب ہم بلندی سے وادیٔ ایراوتی کو اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔ جنگلوں سے نکل آنے کے بعد اب سامنے برما کا خشک، پتھریلا علاقہ تھا، ایراوتی کے سوا دُور دور تک پانی کا نام و نشان نہ تھا۔ بے برگ و گیاہ پہاڑیوں کا سلسلہ میلوں میں پھیلا ہوا تھا، البتہ ایراوتی کے کنارے ریت تھی، جس پر کہیں کہیں ناریل کے درخت کھڑے تھے۔ ہم دریا سے ۴۰ میل دُور تھے۔ اس کا پاٹ نظر تو آتا تھا، لیکن یہ معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ دشمن اس کے دوسرے کنارے پر کہاں چھپا ہوا ہے اور ۴۰ میل کا یہ فاصلہ طے کرنے کے لیے نہ جانے کس قدر خون ریزی ہونے والی تھی۔ ہم فضائی تصویروں اور نقشے پر نظریں جمائے کوئی مناسب مقام تلاش کر رہے تھے، جہاں سے دریا عبور کیا جا سکے۔ یہ ذہن میں رکھتے ہوئے کہ سترھویں ڈویژن کو بلاتاخیر میکٹیلا روانہ ہو جانا چاہیئے، قریب ترین راستہ پاکوکو کا نظر آتا تھا۔ اس میں ایک فائدہ یہ تھا کہ کچھ فاصلہ طے کرنے پر ایک پختہ سڑک تھی جو ایراوتی کو جاتی تھی۔ اس سڑک پر قبضہ کرنا نہایت ضروری تھا تاکہ ٹینکوں اور لاریوں کو بلاتاخیر گزرنے میں مدد ملے، لیکن اس راستے سے گزرنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ اور ہم مقررہ تاریخ تک دریا عبور نہ کر سکتے تھے۔

کافی سوچ بچار کے بعد فرینک میسروی نے فیصلہ کیا کہ نیانگو کے قریب دریا عبور کیا جائے۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، جہاں سے شمال مشرق، مشرق اور جنوب کی طرف راستے جاتے تھے۔ اس جگہ دریا کا پاٹ نسبتاً تنگ تھا اور کم سے کم عرصے میں دستے پار اتر سکتے تھے۔ نیانگو اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل تھا کہ وہ جاپانیوں کی شمال میں پندرھویں آرمی اور جنوب میں اٹھائیسویں آرمی کے درمیان واقع تھا، تاہم انہوں نے اس خلا کو پُر کرنے کے لیے عملی طور پر کچھ نہ کیا، جیسا کہ جاپانی کمانڈر جنرل ٹاناکا کی یادداشت سے معلوم ہوا، وہ اس صورتِ حال سے ناواقف نہ تھے۔ لیکن ہم نے اپنے منصوبوں کو اس قدر راز میں رکھا کہ وہ سخت الجھن میں پڑ گئے۔ جنرل ٹاناکا نے لکھا تھا، "ہم اس حیص بیص میں تھے کہ ہماری ڈویژن کا کون سا اگلا حصہ انڈین ڈویژن کے حملے کی زد میں آئے گا۔ ہمارا خیال تھا کہ اتحادی من موا اور پاکوکو کے مورچوں پر تقریباً ایک ایک ڈویژن سے حملہ کریں گے۔ ہم نے انڈین نیشنل آرمی کو، جو براہِ راست اٹھائیسویں آرمی کے تحت تھی، نیانگو کے مورچوں پر لگا رکھا تھا۔ تاہم اس کے اور اٹھائیسویں آرمی کے درمیان جو خلا تھا اُسے کسی طرح پُر نہ کیا جا سکتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ہمارا ڈویژن من مو کے جنوب مشرق اور پاکوکو کے مغرب میں تقریباً ایک سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاپانیوں کو من موا اور پاکوکو پر حملے کا خطرہ تھا۔ انہیں مزید دھوکے میں رکھنے کے لیے ہم نے ایک اور چال چلی۔ ۴۵ میل کے فاصلے پر سیکیو تھا، جو چاوک کے تیل کے ذخائر کے بِالمقابل تھا۔ جاپانی یہیں سے تیل حاصل کرتے تھے۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ہم اس پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں، ہماری اٹھائیسویں ایسٹ افریقن بریگیڈ اس سمت روانہ ہو گئی۔ ہم نے چاوک کی مشرقی سمت میں جھوٹ موٹ کے پیراشوٹ آتارے اور نشان لگے نقشے بھی پھینکے۔ دوسری طرف ساتویں ڈویژن پاکوکو کی سمت بڑھنے لگی۔ جاپانی ہمارے جال میں پھنس گئے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ ہم ان ہی دو مقامات پر دریا عبور کریں گے، لہٰذا انہوں نے وہاں اپنی

ساری طاقت جمع کر دی۔ ہم نے اس عرصے میں نیانگو کے سامنے پیچھے میں خفیہ طور پر مورچہ بندی شروع کر دی۔ اس مقام پر پہنچ کر انکشاف ہوا کہ ہم نے دریا کے پاٹ کے متعلق غلط اندازہ لگایا تھا۔ یہ کوئی پون میل سے دو میل کے درمیان تھا۔ گرمی میں یہ فاصلہ اور زیادہ ہو جاتا تھا۔ دریا ہر سال راستہ بدلتا تھا اور نقشے سے مختلف ہو جاتا۔ اس کے کنارے ریت کے بڑے بڑے تودے نمایاں ہو جاتے، جن میں کچھ تو میل میل بھر لمبے چوڑے ہوتے۔ اس وجہ سے کشتی رانی تقریباً ناممکن ہو جاتی۔ اب بھی ہمارے درمیان تقریباً ۸۰۰ گز تک پھیلی ہوئی ریت حائل تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم دشمن کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہ سکتے تھے، چنانچہ طے کیا گیا کہ دریا کو سیدھا عبور کرنے کے بجائے متوازی رُخ اختیار کیا جائے، لیکن اس طرح بھی خطرہ نہ ٹلتا تھا۔ دوسرے کنارے پر بے شمار چٹانیں تھیں، جن میں کئی تو سو سو فیٹ اونچی تھیں اس کے علاوہ اُس پاس بُدھ مذہب کے معابد "پگوڈا" بھی بہت تھے اور ان میں سے ہماری ساری فوج نظر آ سکتی تھی۔ چٹانوں کا ایک فائدہ یہ تھا کہ ان میں بڑے بڑے رخنے تھے، جو خشک ہو کر درّے سے بن گئے تھے۔ دریا کو عبور کر کے ان ہی درّوں میں سے ٹینکوں، لاریوں اور ٹٹوؤں کو گزارنا تھا۔ دن میں کسی قسم کی نقل و حرکت ممکن نہ تھی۔ چٹانوں اور پگوڈوں کے خطرے کے علاوہ ٹینکوں اور لاریوں کا گرد وغبار بھی دشمن کو خبردار کرنے کے لئے کافی تھا۔ ہمیں میچے اور کنہلا کی درمیانی سڑک پر بھی قبضہ کرنا تھا، کیوں کہ اسی سڑک پر ٹینکوں اور لاریوں کو گزرنا تھا۔ دن کے وقت یہ بھی ممکن نہ تھا۔ جاپانیوں نے کنہلا میں مورچے بنا رکھے تھے۔ اس کے علاوہ ایک مسئلہ مقامی باشندوں کا بھی تھا، جو ایراوتی تک کئی چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں دشمن کے ایجنٹوں کی موجودگی بعید از قیاس نہ تھی، جو اسے بروقت خبردار کر سکتے تھے۔ سارے دیہات خالی کرانا آسان کام نہ تھا اور نہ اتنے آدمیوں کو غیر معیّنہ وقت تک سامانِ خورد و نوش مہیا کرنا ہی ممکن تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد ہم نے طے کیا کہ کچھ دیہات خالی کرائے جائیں، باقی لوگوں کو ان کے مکانوں میں نظر بند کر

دیا جائے اور انہیں رات کو روشنی کرنے کی اجازت نہ ہو۔ ہم نے اسی پر عمل کیا۔

یکم فروری کو دریا عبور کرنے کی مکمل تیاریاں ہوگئیں۔ پاوک کے علاقے میں سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ ڈویژن ہیڈ کوارٹر پہنچ چکا تھا۔ ۸۹ ویں بریگیڈ پہاڑی کی بلندی سے ایراوتی پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔ سنیتے میں انجینئر فضائی راستہ بنانے میں مصروف تھے۔ اسی راستے سے دریا عبور کرنے والے دستوں کو خوراک و رسد مہیا کی جانی تھی۔ ۱۱۴ ویں بریگیڈ ٹیلین اور پاوک کے درمیان پھیل کر پاکوکو کی سمت بڑھ رہی تھی۔ دریا عبور کرنے میں چودہ دن رہ گئے تھے۔ اس موقعے پر جنرل ٹاناکا کی رپورٹ بہت دلچسپ ہے۔ اس نے لکھا تھا "جنوری کے اواخر میں ہماری فضائیہ کو رپورٹ ملی کہ ٹیلین اور پاکوکو کے درمیان بہت سی موٹر کاریں دوڑتی نظر آئی ہیں، چونکہ ایسی موٹر کاریں فوجی اہمیت کا سامان ڈھونے کے قابل نہیں ہوسکتیں، اس لیے ہم نے ان کی نقل و حرکت کو کوئی اہمیت نہیں دی، تاہم اگر ایسی مزید رپورٹیں موصول ہوتیں تو ہمارے لیے تشویش کی بات ہوتی، لیکن اس کے بعد کوئی رپورٹ نہیں ملی" اور ملتی بھی کیسے! ہماری فضائیہ نے کوئی رپورٹ جاپانی فضائیہ تک پہنچنے ہی نہ دی۔ جہاں تک ہمارا تعلق تھا، ہم نے وائرلیس کا استعمال قطعاً بند کر رکھا تھا۔ پیغام رسانی کے لیے ہر محاذ پر ایک مورچے سے دوسرے مورچے تک ٹیلی فون لائن قائم تھی۔ اس کے علاوہ دو ہلکے طیارے دن رات کمانڈروں اور اسٹاف افسروں کو صلاح مشورے کے لیے ایک مقام سے دوسرے مقام تک لاتے لے جاتے رہتے تھے۔

ہم کنہلا کو دشمن سے جلد از جلد خالی کرانا چاہتے تھے۔ ۵ فروری کو میجے سے آگے بڑھ کر ایک اونچی سطح پر مورچے بنا لیے گئے۔ ۴/۵ رائل گورکھا رائفلز نے میجر آئی ایم، براؤن کی کمان میں ایک بھرپور حملہ کیا۔ میجر براؤن جنگِ اراکان کا شہرت یافتہ کمانڈر تھا، جسے بعد میں ملٹری کراس بھی ملا۔ ہم دشمن کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب بھی ہوگئے تاہم اسلحہ کی کمی کی وجہ سے اپنے مورچوں پر واپس آنا پڑا۔ اس معرکے میں طرفین کو بہت زیادہ جانی نقصان ہوا۔ مشکل یہ تھی کہ دشمن اپنے مورچوں میں محفوظ تھا۔ میدانی علاقہ

ہونے کی وجہ سے ہماری نقل و حرکت اس سے چھپی نہ رہ سکتی تھی۔ ہمارا آگے بڑھنا خودکشی کرنے کے مترادف تھا۔ میں نے ہیڈکوارٹر سے ٹینک استعمال کرنے کی اجازت طلب کی۔ ہم بولا لیس پوزیشن ملکی ہم ٹینکوں کا انتظار کرنے لگے۔

۱۰ فروری کو ۱۱۶ رائل آرمرڈ کور کا ایک ٹینک سکویڈرن گورڈن ہائی لینڈرز آ پہنچا۔ ساتھ ہی ۱۱۴ ویں بریگیڈ کی تیسری بٹالین چودھویں پنجاب رجمنٹ بھی پہنچ گئی۔ ۴/۵ رائل گورکھا رائفلز نے ٹینکوں کی مدد سے تین طرف سے حملہ کیا اور چودھویں پنجاب رجمنٹ گھوم کر مغرب میں پہنچ گئی۔ دشمن نے بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن شام تک اسے کنہلا سے پسپا کر دیا گیا۔ اس موقعے پر گورکھا رائفلز کا کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل جے۔ ایچ ٹرنر کام آ گیا۔ اس اثنا میں تازہ دم ساؤتھ لنکا شائر رجمنٹ بھی پہنچ گئی۔ اس نے مڈغاسکر پر قبضہ کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا اور اسے بحری جنگ کا بھی تجربہ تھا۔ یہ رجمنٹ ۱۱۴ ویں بریگیڈ ہی کا حصہ تھی، لیکن اس کے سابقہ تجربے کی بنا پر میں نے اسے ۳۲ ویں بریگیڈ کے تحت کر دیا، تاکہ دریا عبور کرنے میں مدد دے۔

میں نے کشتیوں کا معائنہ کیا۔ ان میں سے بیشتر ناکارہ اور مرمّت طلب تھیں۔ سِنتے کا فضائی راستہ ابھی نامکمل تھا۔ اس کے بغیر دریا عبور کرنے کے لئے مناسب تعداد میں اسلحہ مہیا کیا نہ جا سکتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ۱۲، ۱۳ فروری سے پہلے دریا عبور کرنا دشوار ہے۔ ہم نے فوری طور پر کشتیوں کی مرمّت شروع کر دی۔ ضروری ساز و سامان سے لیس ہونے میں جو وقفہ تھا، اس میں ہم نے بحری ماہرین کی دو جماعتیں سِنتے بھیج دیں ان میں ایک "سی ریکونیسنس یونٹ" تھی، جس کا کام منصوبے کا قریبی جائزہ لینا تھا۔ دوسری "اسپیشل بوٹ سیکشن" تھی، جس کا کام دریا عبور کرنے کے بعد شروع ہوتا تھا۔ اس جماعت میں بحریہ کے آزمودہ کار لوگ تھے، جنہیں تاریکی میں لڑنے کی تربیت دی گئی تھی۔

گشتی یونٹ ۱۱/۱ سکھ رجمنٹ نے پیگین سے اطلاع دی کہ نیانگو کا جنوبی سرا دشمن سے خالی ہے۔ اس سے اُمید پیدا ہو گئی کہ ۳۲ ویں بریگیڈ وقتِ مقررہ پر دریا عبور کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اب ہم نے تیزی سے کام شروع کر دیا۔ سِنتے کا فضائی راستہ تقریباً مکمل ہو گیا تھا۔ ہمیں حملہ آور دستوں کو دُور دُور تک پھیلانا تھا تاکہ کسی نہ کسی مقام پر دریا کو

بآسانی عبور کیا جا سکے۔ ہم نے دریا کے دوسرے کنارے پر چار مقامات کی نشان دہی کی اور ان کا نام بی ون، بی ٹو، بی تھری اور بی فور رکھا۔ یہ چاروں مقامات تقریباً ۱۵ سو گز میں پھیلے ہوئے تھے۔ پہلا کام ۲۲ ویں بریگیڈ کو کنارے پر پہنچانا تھا۔ دوسرا فوری طور پر ایک پل تعمیر کرنا اور تیسرا نیانگو پر مکمل قبضہ کرنا تاکہ پل کو اتنا چوڑا کیا جا سکے کہ باقی سارے ڈویژن پار اُتر جائیں۔ اس کے لیے ٹھیک ٹھیک وقت مقرّر کرنا اس وقت ممکن نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ رات کی تاریکی میں ٹینکوں اور توپوں کی گھن گرج اور زوردار دھماکوں سے دشمن کو ہراساں کیا جائے اور اس دَوران میں دریا عبور کر لیا جائے، لیکن اسلحے کی کمی کا خدشہ تھا، لہٰذا بہتر یہی سمجھا گیا کہ خاموشی سے مہم سر کی جائے۔

طے کیا گیا کہ رات ہی کو ۱۱۶ رائل آرمرڈ کور اپنے ٹینک کنارے پر لے جائے۔ توپیں، مشین گنیں اور خودکار رائفلیں پوزیشن میں رکھی جائیں اور امریکی اور برطانوی فضائیہ کے چھ سکواڈرن پر مشتمل طیّارے پرواز کے لیے تیار رہیں۔ ہمیں دشمن کی پوزیشن کا قطعی علم نہ تھا، لیکن جنگ کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بے حد کمزور تھی، جیسا کہ جنرل ٹاناکا نے لکھا ہے، "ہماری دفاعی لائن بہت لمبی تھی۔ ہمیں اندازہ نہ تھا کہ اتحادی کس جگہ سے دریا عبور کریں گے"۔ یہ بات صحیح تھی۔ چاوک، پیچے اور پاکوکیں ہماری نقل و حرکت اس سرگرمی سے جاری تھی کہ اندازہ ہوتا تھا کہ ہم یہیں سے دریا عبور کریں گے۔

جنرل ٹاناکا نے اپنی ۳۳ ویں آرمی اور اٹھائیسویں آرمی کا درمیانی خلا پُر کرنے کے لیے ۱۱ فروری کو ۲۱۵ ویں رجمنٹ کی ایک بٹالین مائینگ یان سے نیانگو بھیج دی لیکن نہ معلوم وجوہ کی بناء پر ۱۴ فروری سے پہلے وہاں پہنچ نہ سکی۔ اتفاقاً اسی تاریخ کو ہمیں دریا عبور کرنا تھا۔ ہم نے اپنی ۳۳ ویں بریگیڈ میں پندرھویں پنجاب رجمنٹ (جس نے بعد میں وکٹوریہ کراس حاصل کیا)، فرسٹ گورکھا رائفلز اور برما رجمنٹ کو بھی شامل کر دیا۔ ساؤتھ لنکا شائر رجمنٹ کو ہراول دستہ بنایا گیا۔ بریگیڈ کی کمان بریگیڈیر جارج کولنگ وڈ کے سپرد تھی، جو پانچویں انڈین ڈویژن کی کمان کر چکا تھا اور بہت ہر دل عزیز کمانڈر تھا۔ اب ہم ہر روز طلوعِ آفتاب کا وقت نوٹ کرنے لگے۔ اس سے حساب لگایا گیا کہ ۱۴ فروری کو آفتاب ۶ بجے طلوع ہوگا۔ دو مقامات "بی" اور "سی" کی نشاندہی

کی گئی۔ ہراول دستے ساؤتھ لنکاشائر رجمنٹ کو "سی" پر پہنچنا تھا اور باقی دستوں کو "بی" پر جمع ہونا تھا۔ ۱۴ فروری کو لنکاشائر کی ایک کمپنی کو "سی" سے روانہ ہو کر ساڑھے پانچ بجے صبح دریا کے کنارے پہنچ کر کشتیوں میں سوار ہونا اور دوسرے کنارے پر پہنچتے ہی "بی فور" کے قریب چٹانوں پر قبضہ کر لینا تھا۔ اس کمپنی کے ساتھ اسپیشل بوٹ سیکشن کی ایک پارٹی کو بھی جانا تھا۔ جس کا کام بی ون، بی ٹو، بی تھری اور بی فور پر روشنی پھینکنا تھا، تاکہ باقی دستے ان کی سمت بڑھ سکیں۔ اس دوران میں ایک ہاروررڈ طیارے کو دریا پر پرواز کر کے اتنا شور پیدا کرنا تھا کہ کشتیوں کے انجنوں کی آواز اس میں دب جائے۔ اس کے بعد "بی" سے پندرہویں پنجاب رجمنٹ کو دو حصوں میں روانہ ہونا تھا۔ گورکھا اور برما رجمنٹوں کی روانگی کشتیاں مہیا ہونے پر منحصر تھی۔ مجھے اُمید تھی کہ صبح صادق سے پہلے ہی ساری کی ساری ۳۳ ویں بریگیڈ، ۹ ٹینکوں، ٹینک شکن توپوں، مشین گنوں، خودکار رائفلوں چند جیپ کاروں اور کچھ ٹٹوؤں سمیت دریا پار کر جائے گی۔

۱۱ فروری کی رات کو تمام سامان اور انتظامات کا آخری مرتبہ معائنہ کیا گیا۔ تمام راستوں کو اچھی طرح دیکھا بھالا گیا۔ کنہلا اور پیچھے سے آنے والے راستوں پر نشان لگائے گئے تاکہ تاریکی میں کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ ٹیلی فون لائن دیکھی گئی کہ درست ہے یا نہیں۔ کسی کو اجازت نہ تھی کہ ساڑھے چھے بجے شام سے پہلے دریا کے کنارے پھٹک سکے۔

۱۲ فروری کو میں نے ایک کانفرنس طلب کی، جس میں تمام بریگیڈوں، آرمز اینڈ ایڈمنسٹریٹیو سروسز، کور ہیڈ کوارٹرز اور امریکی فضائیہ کے نمائندوں نے شرکت کی ۱۳ فروری کو میں نے کمانڈروں اور اسٹاف افیسروں کی آخری کانفرنس بلائی۔ اس کے بعد توپیں آہستہ آہستہ روانہ کر دی گئیں۔ احتیاط برتی گئی کہ گرد و غبار نہ اُڑنے پائے۔ وقت نہایت سُست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ ہر شخص مضطرب تھا۔ ڈویژن ہیڈکوارٹر والے، جو دن رات منصوبے بنا رہے تھے، اپنی کاوشوں کا صلہ پانے کے منتظر تھے۔ رات ہوتے

ہی رپورٹ ملی کہ "بی" اور "سی" پر پوزیشن سنبھال لی گئی ہے۔ سارا کام منصوبے کے عین مطابق ہو رہا تھا۔ دفعتہً رپورٹ ملی کہ انجینئروں کی گاڑیاں، جن میں تمام ضروری سامان تھا، لاپتا ہیں۔ ہم پریشان ہو گئے۔ سارے کیے کرائے پر پانی پھرتا نظر آیا۔ تاریکی میں انہیں کہاں تلاش کیا جاتا۔ ہم ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے اور قدرت کے آگے بے بس تھے، لیکن اسے رحم آ ہی گیا۔ تین بجے اطلاع ملی کہ گاڑیاں مل گئی ہیں۔ اور مقررہ وقت پر اپنے مقام پر پہنچ جائیں گی۔ ٹھیک چار بجے سی ریکونینس یونٹ اور اسپیشل بوٹ سیکشن، جو دریا کا معائنہ کرنے گئے تھے، واپس آئے۔ انہوں نے بتایا کہ سب ٹھیک ٹھاک ہے، البتہ دریا میں دو جاپانی تیرتے نظر آئے تھے۔ جنہیں گولی مار دی گئی۔ کیا یہ ہمارے لیے انتباہ تھا؟ اس کا جواب بعد کے حالات نے دیا۔ ساڑھے پانچ بجے اطلاع ملی کہ ساؤتھ لنکا شائر رجمنٹ کی کمپنی بخیر و عافیت کنارے پر پہنچ گئی ہے اور اس نے احکامات کے تحت فوری طور پر پی فور کے قریب چٹانوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ اب ہارورڈ طیارے کو دریا پر پرواز کے لیے بھیج دیا گیا۔ دریا عبور کرنے کا مرحلہ شروع ہو گیا۔

میں اپنے خیمے میں بیٹھا مزید رپورٹوں کا منتظر تھا کہ اچانک میسروی داخل ہوا وہ دریا پر پرواز کر کے آ رہا تھا۔ اس نے جو کچھ بتایا، اس کے سنتے ہی میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ہماری تمام کشتیاں غلط راستے پر جا رہی تھیں۔ کچھ واپس آ رہی تھیں اور دوسرے کنارے سے بڑی زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ مجھے معاً دریا میں تیرتے ہوئے جاپانیوں کا خیال آیا اور میں بے تحاشا اٹھ کر بھاگا۔ جلدی سے طیارے میں بیٹھا۔ چند لمحوں بعد میں دریا پر پرواز کر رہا تھا۔ نیچے کا منظر دیکھ کر ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ کچھ کشتیاں واقعی واپس جا رہی تھیں، باقی تیزی سے نیانگو کی سمت بہہ رہی تھیں۔ بلاشبہ وہ موت کے منہ میں جا رہی تھیں۔ دشمن کی فائرنگ شدت سے جاری تھی۔ مجھ سے یہ اذیت ناک منظر دیکھا نہ گیا۔ میں نے پائلٹ کو پیچھے کی طرف پرواز کا حکم دیا۔ اچانک ایک زور کا دھماکا ہوا اور ہمارا طیارہ ڈگمگانے لگا۔ بجلی کی

طرح میرے ذہن میں خیال آیا کہ ہمیں نشانہ بنا لیا گیا ہے اور چند لمحوں بعد ہم دریا کی تہہ میں ہوں گے۔ موت میری نظروں کے سامنے رقصاں تھی، لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ طیارہ بدستور پرواز کر رہا تھا۔ نیچے جھانک کر دیکھا تو سارا معاملہ سمجھ میں آ گیا۔ ہم دو سو فیٹ کی بلندی پر اپنے ہی ٹینکوں پر پرواز کر رہے تھے جو دوسرے کنارے پر گولے پھینک رہے تھے۔ ایک گولہ ہمارے طیارے کے قریب پھٹا تھا جس کے دھماکے سے طیارہ ڈگمگا گیا تھا۔

طیارے سے اتر کر میں نے صورتِ حال کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ جوں ہی منصوبے کے مطابق ساؤتھ لنکا شائر کی باقی رجمنٹ کشتیوں میں سوار ہوئی تو پتا چلا کہ ان میں پانی بھر رہا ہے اور کئی کشتیوں کے انجن کام نہیں کر رہے ہیں۔ صرف چند کشتیاں ہی کارآمد ثابت ہوئیں، چنانچہ ان میں سارا سامان لادا گیا اور وہ روانہ ہوئیں۔ کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ دوسرے کنارے پر دشمن کا مکمل قبضہ ہے وہ بی ٹو ادر بی تھری پر مشین گنوں سے گولیوں کی بوچھاڑ کر رہا تھا۔ اسی اندھا دھند فائرنگ سے بہت سی کشتیاں بے قابو ہو گئیں۔ اور دریا کے دھارے پر بہہ نکلیں۔ پانی کی روانی اتنی تیز تھی کہ ان میں سے ایک کشتی بھی واپس نہ آ سکی تھی۔ البتہ زخمیوں سے بھری ہوئی کشتیاں دُور دُور جا کر ریت میں دھنس گئیں۔ ان زخمیوں کو امریکی فضائیہ کے طیاروں نے اٹھا لیا۔ کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل اے، میچل کی کشتی دریا کی تہہ میں جا لگی، لیکن وہ تیر کر واپس آنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی اثنا میں ہمارے ٹینکوں اور توپوں نے جوابی فائرنگ شروع کر دی اور امریکی فضائیہ کے طیارے باقی ماندہ کشتیوں کی حفاظت کرتے ہوئے انہیں واپس لے آئے ادُھر برطانوی طیاروں نے دشمن پر بم باری شروع کر دی۔

۸ بجے جارج کوننگ وڈ نے فیصلہ کیا، چونکہ ساؤتھ لنکا شائر رجمنٹ تقریباً تتر بتر ہو گئی ہے، اب ۱۵/۴ پنجاب رجمنٹ کو یہ مہم سر کرنے کے لئے بھیجا جائے۔ کشتیاں از سر نو جمع کی گئیں۔ ان میں انجن لگائے گئے۔ طیاروں، ٹینکوں اور اسلحہ کو دوبارہ

ترتیب دیا گیا۔ ۹ بجکر ۴۵ منٹ پر ۱۵/۴ پنجاب رجمنٹ "بی" سے روانہ ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی توپوں کے دہانے کھول دیے گئے، ٹینکوں نے بھاری بھاری گولے پھینکنے شروع کیے اور طیاروں نے پلٹ پلٹ کر بم برسائے۔ کشتیاں تیزی سے بڑھ رہی تھیں بالآخر پوری رجمنٹ اپنا ایک آدمی ضائع کیے بغیر دوسرے کنارے پر پہنچ گئی جہاں ساؤتھ لنکا شائر رجمنٹ کی کمپنی منتظر تھی۔ پنجاب رجمنٹ کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل ہوکا نزائے نے ساؤتھ لنکا شائر کی کمان بھی سنبھال لی اور چٹانوں کی آڑ میں مورچے بنا لیے۔ جاپانیوں کو اس کا علم نہ تھا کہ اتحادیوں کی ایک کمپنی ان کے سر پر کئی گھنٹوں سے بیٹھی ہے، ادھر ہماری کمپنی بھی پانچ گھنٹے تک دم سادھے رہی۔ اتنے میں پوری ۱۵/۴ رجمنٹ اور ۱/۴ گورکھا رجمنٹ دوسرے کنارے پر پہنچ چکی تھی۔ یہ مہم سر کر لی گئی، تاہم خدشہ تھا کہ دشمن رات کی تاریکی میں بھرپور حملہ کرے گا، لیکن یہ خدشہ غلط ثابت ہوا۔

اگلے روز شام تک پوری ۳۳ ویں بریگیڈ چھ ٹینکوں، نو ٹٹوؤں اور تین جیپ کاروں سمیت ایراوتی کے پار موجود تھی۔ میرا خیال تھا کہ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر آگے بڑھ جائیں، لیکن انجینئر گزشتہ چھتیس گھنٹوں سے کام کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ اس کے علاوہ مزید کمک اور رسد آنے کے لیے کئی دن درکار تھے۔ ٹام رائٹ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

۱۵ فروری کو دریائے ایراوتی پر بڑی گہما گہمی تھی۔ دشمن کے علاقے سے خالی کشتیاں تیزی سے آرہی تھیں اور آدمیوں، سامان اور ٹٹوؤں سے لد کر واپس جارہی تھیں۔ ہمارے انجینئر اس مہارت سے کشتیاں چلا رہے تھے، گویا وہ یہ کام برسوں سے کر رہے ہوں۔ دریائے ایراوتی کو عبور کرنے کا سہرا دراصل ان ہی انجینئروں کے سر ہے۔ انہوں نے جس پھرتی اور چابک دستی سے ناکارہ کشتیوں کو کارآمد بنایا، وہ قابلِ داد ہے۔ ۹۶ میں سے ۹۰ کشتیاں مرمت طلب تھیں۔ باقی بالکل ناکارہ ہو چکی تھیں۔ پانچ دنوں میں سو سے زیادہ نقائص دُور کیے گئے اور فرنٹوں نے چودہ گھنٹے روزانہ کام کیا۔ ۱۴ فروری کو دریا کے کنارے ایک چھوٹا سا کارخانہ بن گیا تھا، جہاں روزانہ اوسطاً

پچیس انجن قابلِ استعمال بنائے جاتے تھے۔ ۳۲ ویں بریگیڈ نے پُل کو چوڑا کرنے میں ایک لمحہ ضائع نہ کیا۔ اب وہ دو ہزار پانچ سو گز چوڑا بن چکا تھا۔ جاپانی دریا کے کنارے سے ہٹ کر شمال کی طرف پہاڑیوں میں جا چھپے تھے ان میں سرنگیں سی بنی تھیں، جہاں سے وہ ہماری فوج پر فائرنگ کرتے۔ طیاروں سے بم باری بھی ناکام ثابت ہو رہی تھی۔ برما رجمنٹ ٹینکوں میں ان کے قریب پہنچ گئی، لیکن انہوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ سرنگوں میں ان کا پیچھا کرنا موت کو دعوت دینا تھا۔ ہم نے تھک ہار کر سرنگوں کا منہ بند کر دیا۔ ۱۶ فروری کو برما رجمنٹ نے نیانگو پر مکمل قبضہ کر لیا۔ اس اثنا میں ایراوتی کا پل چھ ہزار گز چوڑا اور چار ہزار گز گہرا بن چکا تھا۔ ۱۷ فروری کو سترہویں ڈویژن نے دریا عبور کیا اور میکٹیلا کی طرف بڑھنے لگی۔ جاپانی قدم قدم پر مقابلہ کر رہے تھے، لیکن انہیں بھاری جانی نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑ رہا تھا۔ برما ان کے ہاتھ سے نکلتا جا رہا تھا۔ یہ خون ریزی مارچ تک جاری رہی۔ ایراوتی کے پُل کے راستے ہمیں تازہ دم کمک اور رسد برابر مل رہی تھی۔ ۱۱ اپریل کو برما پر ہمارا قبضہ ہو گیا۔ اتحادیوں کی یہ کامیابی ایراوتی کے پل کی مرہونِ منت تھی اور اس کا سہرا اُن انجینئروں اور سپاہیوں کے سر ہے، جو آج کل پاکستان کی فوج میں شامل ہیں۔

پرل ہاربر

۲۷ نومبر ۱۹۴۱ء کو امریکی بحریہ کے شعبۂ نقل و حرکت کے افسرِ اعلیٰ نے پرل ہاربر (فلپائن) میں مقیم تمام کمانڈروں کے نام ایک غیر معمولی پیغام ارسال کیا جس کا مضمون یہ تھا:۔

"اس مراسلے کو جنگ کی ایک تنبیہہ سمجھا جائے۔ جاپان کے ساتھ امریکہ کے حالیہ مذاکرات ناکامی پر ختم ہوئے ہیں۔ صورتِ حال سخت خطرناک ہے۔ آئندہ چند روز کے اندر اندر جاپان کی طرف سے حملے کی قوی توقع ہے۔"

اس "غیر معمولی" پیغام میں امریکہ اور جاپان کے مابین جن مذاکرات کی ناکامی کا ذکر کیا گیا تھا، وہ یہ تھے کہ امریکہ کے سیکرٹری آف سٹیٹ کورڈل ہل نے حکومتِ جاپان سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ چین اور ہند چینی سے اپنی فوجیں فوراً نکال لے —— امریکہ دس روز تک جاپان کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن ۶ دسمبر ۱۹۴۱ء کو جاپان کے وزیر خارجہ نے جاپانی سفیر متعینہ واشنگٹن کیچی سابرو کو اس مضمون کا برقیہ ارسال کیا:۔

۱۔ "امریکہ نے جو تجاویز حکومتِ جاپان کے سامنے رکھی تھیں، وہ افسوس کے ساتھ رد کر دی گئی ہیں، چنانچہ امریکہ کو اس فیصلے سے مطلع کرنے کے لیے ہم نے ایک "میمورنڈم" مرتب کیا ہے۔ جسے میں آپ کو ایک علیحدہ پیغام (بی ۹۰۲) کے ذریعے ارسال کر رہا ہوں۔

۲۔ یہ علیحدہ پیغام چونکہ طویل ہے۔ اس لیے میں اسے چودہ (۱۴) اجزا میں بھیجوں گا۔ اور میرا خیال ہے کہ اسے آپ کل تک وصول کر لیں گے۔ بہر حال صورت حالات سخت پیچیدہ ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔..........."

۳۔ جہاں تک اس "میمورنڈم" کو حکومتِ امریکہ کے پاس پہنچانے کے "وقت" کا تعلق ہے، تو میں ایک علیحدہ برقیے میں آپ کو اس سے مطلع کروں گا۔ البتہ اس عرصے میں آپ "میمورنڈم" کو مناسب الفاظ میں مرتب کر سکتے ہیں

جاپانی وزیر خارجہ کا جاپانی سفیر کے نام یہ پیغام، جاپان کے خفیہ سفارتی اشارات کے ذریعے ارسال کیا جا رہا تھا اور بیک وقت ماہرینِ خفیہ اشارات کے دو گروپ نہایت انہماک سے اس کا ترجمہ کر رہے تھے۔ ایک گروپ جاپانی سفارت خانے میں، اور دوسرا امریکہ کی بحریہ انٹیلی جنس کے دفتر میں مصروفِ کار تھا۔ جاپانیوں کو علم نہیں تھا کہ امریکہ کے ماہرین نے ان کے خفیہ پیغامات کو سمجھ لیا ہے۔

بروز ہفتہ چھ دسمبر کی دوپہر تک امریکہ کے سٹیٹ سیکرٹری کے پاس تیرہ اجزا پر مشتمل خفیہ جاپانی پیغام کا مراسلہ پہنچ گیا۔ اور چند منٹ کے اندر اندر یہ پیغام ایک سربمہر لفافے میں بند ہو کر وائٹ ہاؤس میں صدر فرینکلن روز ویلٹ کی میز پر رکھا تھا۔

دوسری جنگِ عظیم کے سیاہ بادل یورپ پر چھا رہے تھے۔ ہٹلر اپنی بے پناہ قوّت کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ لندن پر جرمن بمباری کر رہے تھے۔ اور دوسری طرف روسی فوجیں نازیوں کا سر توڑ مقابلہ کر رہی تھیں۔ تاہم بحرالکاہل میں ابھی تک امن و امان قائم تھا، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے جاپان اور امریکہ خم ٹھونک کر آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اگرچہ ظاہری طور پر دونوں ایک دوسرے کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کہ وہ "امن" کے خواہش مند ہیں۔ ۶ دسمبر ۱۹۴۱ء کو پرل ہاربر میں بلیک آؤٹ نہیں ہوا اور کیوں ہوتا؟ جبکہ امریکہ اور جاپان میں جنگ کا "باقاعدہ" اعلان نہیں ہوا تھا۔ پرل کی بندرگاہ جزیرہ اوہو میں واقع تھی اس کی شکل بالکل ایک سیب کی مانند تھی۔ اوہو کا جزیرہ جزائر ہوائی میں شمار ہوتا تھا۔ اس میں داخل ہونے کے لیے ہونولولو کے مشرق

میں سے آنا پڑتا تھا۔ پرل ہاربر میں امریکہ کا نہایت اہم بحری بیڑہ مقیم تھا۔ جس پر بحرالکاہل کی حفاظت اور امن کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔

اس روز بندرگاہ میں امریکہ کے نو جنگی اور بیس سے زائد تباہ کن جہاز موجود تھے۔ سرنگیں صاف کرنے اور نگرانی و گشت کرنے والے جہاز اس کے علاوہ تھے چند آب دوز کشتیاں بھی تھیں۔ اور اکثر جہاز ایسے تھے جو مرمت طلب تھے۔ جزیرہ فورڈ میں جہاں فضائی اڈہ قائم تھا، امریکہ کے لڑاکا جنگی طیارے قطاروں میں خاموش کھڑے تھے۔ ان دنوں یہ افواہیں پھیل رہی تھیں کہ ان جہازوں کو خراب کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ لہذا فوجی افسروں نے بہتر یہی سمجھا کہ ان جہازوں کو کھلے میدان میں چھوڑ دیا جائے تاکہ دشمن کے جاسوس کوئی حرکت نہ کر سکیں۔ جنگ کا خطرہ ابھی سامنے نہ آیا تھا، اس لیے لوگ مطمئن تھے۔ بندرگاہ پر صرف چند افسروں کی ڈیوٹی تھی اور اکثر سپاہی یا افسر ہفتہ وار تعطیل منانے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ ہونولولو کے شراب خانوں میں خوب رونق تھی۔ آفیسر اپنے اپنے بال بچوں کے ہمراہ کلبوں یا گھروں میں کھانا کھا رہے تھے۔ نوجوان اپنی محبوباؤں کو ساتھ لیے سیر و تفریح میں مصروف تھے۔ غرضیکہ ہر فرد کسی نہ کسی شغل میں لگا ہوا تھا۔ امریکہ کا تباہ کن جہاز "وارڈ" اس رات گشت پر تھا۔ اگلے روز یعنی ۷ دسمبر کو صبح چار بجے جبکہ "وارڈ" بندرگاہ میں واپس آ رہا تھا تو دفعتہً اسے سرنگ صاف کرنے والے جہاز "کونڈور" سے ایک اہم پیغام موصول ہوا۔ لیفٹیننٹ کمانڈر اوٹربرج اس رات "وارڈ" میں ڈیوٹی پر حاضر تھا جب اسے بتایا گیا کہ:-

"کونڈور سے پیغام ملا ہے کہ اس نے بندرگاہ کے قریب سمندر میں ایک عجیب و غریب شئے دیکھی ہے، اور خیال ہے کہ یہ کوئی آب دوز کشتی تھی ——"

یہ سنتے ہی کمانڈر اپنی نشست سے اچھل کر کھڑا ہو گیا اور اس نے حکم دیا۔

"فوراً جنرل کوارٹرز کو مطلع کر دیا جائے"

اس حکم کے ساتھ ہی جہاز میں ایک ہل چل سی مچ گئی اور سپاہی اپنے اپنے مورچوں پر تیار ہو گئے اور جہاز برق رفتاری سے اُدھر روانہ ہوا جدھر "کونڈور" گیا تھا۔ کا ما

ایک گھنٹے تک "وارڈ" کا عملہ اس پُر اسرار آب دوز کشتی کو تلاش کرتا رہا۔ لیکن کوئی سراغ نہ ملا۔ آخر جہاز کا کپتان اپنی نیند پوری کرنے کے لیے نچلی منزل میں چلا گیا صبح چھ بجکر ۳۷ منٹ پر اسے "وارڈ" کے ایک آفیسر نے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ اور جب وہ بیدار ہوا تو اسے بتایا گیا کہ ایک آب دوز کشتی جہاز "آنٹرز" کے قریب دکھائی دی ہے۔

کپتان نے خود اس کشتی کو دیکھا اور توپوں کے دہانے اس کی طرف پھیر دیئے۔ جانے کے احکامات جاری کر دیئے۔ جہاز اس کشتی سے تقریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر پہنچ گیا اور پھر صبح پونے سات بجے کے قریب "وارڈ" کی ایک توپ نے پہلا فائر کیا۔ یہ بحر الکاہل میں جنگ برپا ہونے کی گویا ابتدا تھی۔ گولہ آب دوز کشتی پر جاکر پھٹا یکے بعد دیگرے وارڈ کی طرف سے مزید فائر ہوئے اور کشتی کے پرخچے اڑ گئے۔ کپتان نے فوراً اس کامیابی کی اطلاع پرل میں بحری راڈر سٹیشن کو دی۔ راڈر سٹیشن پر صرف دو فوجی افسروں کی ڈیوٹی تھی راڈر مشین کا ماڈل بھی نیا تھا اور حال ہی میں وہاں نصب کیا گیا تھا اور یہ ڈیڑھ سو میل کے فاصلے تک جہازوں کا سراغ لگا سکتا تھا۔ صبح سات بجے جب راڈر کے انچارج پرائیویٹ لوکرڈ نے راڈر کی سکرین کا بٹن دبایا تو اس میں ایک بجلی سی کوندتی دکھائی دی۔ جس کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھا کہ ہوائی جہازوں کا ایک زبردست بیڑہ جزیرہ اوہو کی جانب چلا آرہا ہے۔ لوکرڈ نے جب پہلی بار راڈر کی سکرین کو دیکھا تھا تو اس وقت جہاز شمال کی طرف ایک سو تیس میل کے فاصلے پر تھے۔ ان جہازوں کی آمد سے خبردار ہو کر دوسرے پرائیویٹ افسر ایلیٹ نے فوجی مرکز اطلاعات سے رابطہ قائم کیا اور انہیں بتایا۔

"شمال کی جانب بے شمار جہازوں کا ایک بیڑہ جزیرے کی طرف پرواز کر رہا ہے ......"

لطف کی بات یہ کہ مرکز اطلاعات میں بھی صرف چند لوگ ڈیوٹی پر تھے اور بقیہ ناشتے کے لئے باہر گئے ہوئے تھے۔ مرکز کے انچارج نے جب یہ خبر سنی تو اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا اس کا خیال تھا کہ یہ جہاز امریکہ کے ہیں۔"

سات بج کر پندرہ منٹ پر لوکرڈ نے پھر راڈر کو کھولا تو پتا چلا کہ جہاز اب ساحل سے صرف ۹۲ میل کے فاصلے پر ہیں۔ اس کے اندازے کے مطابق کم از کم پچاس ہوائی جہاز تھے۔ اس نے دوبارہ مرکزِ اطلاعات کو بتایا کہ ساڑھے سات بجے یہ جہاز ساحل سے صرف ۴۷ میل کے فاصلے پر تھے اور نو منٹ بعد یہ فاصلہ گھٹ کر ۲۲ میل رہ گیا تھا۔ فوجی مرکزِ اطلاعات راڈر والوں کی اس "خواہ مخواہ" گھبراہٹ سے اکتا گیا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے سے "اوپر" والوں کو بھی کوئی اطلاع دینی مناسب نہ سمجھی۔ اور سات بج کر ۵۵ منٹ پر جہازوں کا بیڑا پرل ہاربر کی بندرگاہ پر ایک قیامت کو اپنے جلو میں لیے نمودار ہو چکا تھا۔ پہلا بم ادھر پر گرا۔ ان بے ضرر جہازوں کے پروں پر جاپانی شاہی فضائیہ کا سُرخ دائرہ بنا ہوا تھا اور ان کی دموں پر طلوع ہوتے ہوئے سورج کی تصویر تھی۔

پرل ہاربر پہنچ کر طیاروں نے فورڈ آئی لینڈ پر غوطہ لگایا اور ان کے پیٹ سے بم اور تارپیڈو نکل کر زمین پر آنے لگے۔ اور چشم زدن میں دھماکہ خیز زلزلوں کے ساتھ امریکہ کے جنگی طیاروں کے پرخچے اڑ چکے تھے۔ یہاں سے مڑ کر جاپانی طیاروں نے امریکی بحریہ کے جہازوں کی طرف حملے کا رُخ کیا۔ فورڈ آئی لینڈ کے ساحل کے ساتھ ساتھ امریکہ کے کئی مشہور جنگی جہاز کھڑے تھے۔ جن میں نیواڈا، کیلیفورنیا، اوکلاہوما اور ویسٹ ورجینیا کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جاپانی بمبار طیاروں نے ان جہازوں کے عین سروں پر پہنچ کر اپنے تارپیڈو چھوڑ دیئے۔ جہاز نیواڈا پر اس وقت بحریہ کا بینڈ صبح کا نغمہ بجا رہا تھا۔ آٹھ بج رہے تھے کہ پہلا بم اس جہاز پر گرا۔ اس وقت تک پرل ہاربر کے لوگوں اور نہ جہازوں کے عملے کو پتا چلا کہ یہ طیارے امریکہ کے نہیں ہیں۔ جہاز ایری زونا کے بوائلروں پر ایک بم گرا۔ اور ٹنکیاں پھٹ گئیں اور تیل نے فوراً آگ پکڑ لی اور جلتا ہوا تیل بندرگاہ کے اردگرد پھیلنے لگا۔

ایک ریڈیو آپریٹر تعجب سے کہنے لگا:

"ان امریکی طیاروں کو کیا سوجھی ہے کہ ہم پر بمباری کی مشق کر رہے ہیں؟"

"خدا جانے کس بدمعاش نے ان طیاروں میں نقلی بموں کی بجائے اصلی بم رکھ دیئے

ہیں۔ اور ان کم بخت پائلٹوں کو علم ہی نہیں کہ یہ بم اصلی ہیں۔ ان کی مشق ہو رہی ہے اور ہماری جان پر بن رہی ہے۔"، دوسرے نے تبصرہ کیا۔

لیکن ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ یہ نہ مشق تھی اور نہ ڈرل ہو رہی تھی۔ یہ دونوں چیزیں تو اس سے پیشتر خفیہ طور پر جاپان میں ہو چکی تھیں جاپانی مدتوں سے ان تیاریوں میں مصروف تھے۔ اور اب ان مشقوں کو اصلی صورت میں استعمال کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ دفعتہً "جنگی جہاز" "اوتا"، میں دو تارپیڈو پھٹے۔ اور اس میں آگ لگ گئی۔ اس کے ذریعے دوسرے جہازوں "ریلچ"، اور "ہیلنا"، نے بھی آگ پکڑلی۔ اس حشر کے باوجود بھی لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ جنگ کی مصنوعی مشق ہو رہی ہے۔ لیکن ہے خطرناک۔ جہاز اوکلا ہوما پر یکے بعد دیگرے کئی بم گرے۔ ان دنوں میں یہ ایک تربیتی جہاز کی حیثیت میں استعمال کیا جا رہا تھا۔ اور اس پر ایک ہزار سے زائد افراد سوار تھے۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ چھ، جو تارپیڈو جاپانی طیاروں سے برآمد ہوتی، وہ سیدھی اس جہاز پر آن کر پھٹتی۔ دھوئیں کے بادلوں نے ہر شے کو ڈھانپ لیا تھا۔ روشنی کی کوئی کرن نظر نہ آتی تھی۔ جہاز میں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ "امریکی طیارے" کیوں اس جہاز پر بم باری کر رہے ہیں! سمندر کا پانی ابل رہا تھا اور جہاز میں متعدد شگاف پڑ گئے تھے۔ پانی تیزی سے جہاز میں داخل ہونے لگا۔ اور جہاز غرق ہونے کی تیاری کرنے لگا۔ پہلے وہ آہستہ آہستہ ایک طرف کو جھکا اور پھر تیزی سے پانی میں بیٹھنے لگا۔ ڈوبتے ہوئے جہاز میں ایک کہرام مچ رہا تھا۔ ہر شخص بدحواس ہو کر بھاگ نکلنے کی کوشش میں تھا۔ لیکن بہت کم افراد بچ سکے۔

ساحل پر بے شمار افراد یہ "جنگی مشق"، دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ ان میں فوجی آفیسر بھی تھے۔ لیکن جلد ہی جاپانی جہازوں نے مشین گنوں سے ان پر گولیاں برسانی شروع کر دیں اور ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ ایڈمرلز، کپتان، کمانڈرز، ملاح سپاہی سب کے سب تتر بتر ہو گئے۔ کوئی سائیکل پر بھاگا، کوئی پیدل اور کوئی موٹر پر—— امریکی بحریہ کے چند جہازوں نے جاپانی طیاروں پر مشین گنوں سے گولیاں برسائیں لیکن ان کا یہ جوابی حملہ غیر منظم ہونے کے باعث جاپانیوں کو قطعاً کوئی نقصان

نہ پہنچا سکا۔ صرف دو جاپانی طیاروں کے انجن بے کار ہوئے اور ان میں آگ لگ گئی۔ اسی دوران جہاز نیو واڈا کی طرف سے بھی حملے کا جواب دیا گیا۔ لیکن ایک ہی جاپانی تارپیڈو نے جہاز کا کام تمام کر دیا۔ اور جہاز غرق ہو گیا۔ اسی طرح مرمّت طلب جہاز، ویسٹ ورجینیا زونا کے ساتھ کھڑا تھا۔ ایک بھاری بم کی زد میں آ گیا۔ اور نہ صرف خود ڈوبا بلکہ اپنے ساتھ دونوں جہازوں ایری زونا اور ویسٹ ورجینیا کو بھی لے ڈوبا۔ اس کے بعد جہاز کیلیفورنیا کے غرق ہونے کی باری آئی۔ ایری زونا کی تباہی کے ساتھ ایک ہزار افراد بھی لقمۂ اجل بنے۔ جہاز پر جتنے افراد سوار تھے، ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا۔

ساڑھے آٹھ بجے تک، گویا آدھ گھنٹے کی جنگ میں امریکی بحریہ کے تین عظیم الشان تباہ کن جہاز غرق ہو چکے تھے۔ اور بقیہ غرق ہونے کے انتظار میں تھے۔ پونے نو بجے جاپانی بمبار طیاروں نے ایک بار پھر منظم ہو کر حملہ کیا۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ بعض جہازوں میں ابھی زندگی کے آثار موجود ہیں پہلے وار میں انہوں نے "ٹینسی"

"کیسین،، اور "ڈانز" تین تباہ کن جہازوں پر شدت سے بمباری کی۔ پھر "آمرگ لالا،، کی باری آئی۔ اور اسے شدید نقصان پہنچا۔ ہونالولو کی باری ابھی نہیں آئی تھی وہاں عورتیں اور بچے ہزارہا کی تعداد میں جمع تھے۔ اور جاپانی جہازوں کو ہاتھ ہلا ہلا کر شاباش دے رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسا منظاہرہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ لوگوں کی اکثریت جاپانی افراد پر مشتمل تھی۔ جاپانی طیارے جب پرل ہاربر کو تباہ کر چکے تو ان کا رخ ہونالولو کی طرف ہوا۔ اور آناً فاناً میں پانچ سو مکانات اور دکانیں ملبے کا ایک عظیم ڈھیر بن چکی تھیں۔ اور آگ کے شعلے آسمان کی خبر لا رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہر طرف موت کی سی بھیانک خاموشی چھا گئی۔ اور وہی علاقہ جو چند لمحے پیشتر بموں کے دھماکوں اور تارپیڈو کی گرج سے لرز رہا تھا، خاموش ہو گیا تھا۔ حملہ آور طیارے اپنے پیچھے ہزارہا لاشیں، بیسیوں جلتے ہوئے جہاز اور مکانات کے ملبے چھوڑ کر جدھر سے آئے تھے ادھر واپس چلے گئے۔ اور دو گھنٹے کے اندر اندر دنیا نے قیامت کا ہلکا سا نمونہ دیکھ لیا۔

آخری اندازے کے مطابق امریکی بحریہ کے اٹھارہ جہاز غرق ہوئے۔ اور کئی جہاز جو غرق ہونے سے بچ گئے تھے اب ناقابلِ استعمال حالت میں تھے ہوائی اڈے پر جتنے طیارے کھڑے تھے، ان میں سے کوئی بھی محفوظ نہ تھا۔ ایک سو اٹھاسی طیارے تباہ ہوئے، دو ہزار آٹھ سو ملّاح ہلاک ہوئے نصف سے زائد تو اسی وقت مر گئے تھے۔ جب "ایری زونا" دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔ ایک سو کے قریب بحری فوجی سپاہی اور ۶۸ شہری بھی اس جنگ میں مارے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ اچانک حملے کے باعث امریکی تباہ کن جہاز زیادہ مدافعت نہ کر سکے، لیکن پھر بھی انہوں نے ۳۵۲ حملہ آور جاپانی طیاروں میں سے ۲۹ طیاروں کو مار گرایا۔ لیکن جاپانیوں کے لیے اس نقصان کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ انہوں نے امریکہ کے بحری اور فضائی بیڑوں کو مکمل طور پر تباہ کر دیا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر امریکی بحریہ کو اس قدر شدید شکست کا سامنا کیوں کرنا پڑا جبکہ اسے ایک روز قبل ہی یہ علم ہو گیا تھا کہ جاپانیوں کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ اور جب حملہ ہوا تب بھی امریکی آفیسر جاپانی طیاروں کو امریکی طیارے اور جنگ کو ایک مصنوعی مشق سمجھتے رہے؟ اور اسی سوچ بچار میں پرل ہاربر کی قیمتی بندرگاہ تباہ ہو گئی۔ اس کا ذمہ دار کون تھا؟ بعد میں جب واقعات کا تجزیہ کیا گیا تو یہ انکشاف ہوا کہ اگر امریکی فوجی آفیسر اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھتے تو ان کے پاس کم از کم پانچ ایسے سنہری مواقع تھے جن کو اگر وہ استعمال کرتے تو اس عظیم نقصان سے محفوظ رہتے۔ لیکن انسان آخر انسان ہے۔ اس سے بھول چوک ہو جاتی ہے۔ لیکن بعض اوقات معمولی سی خطائیں زبردست نقصان کی بنیاد بن جاتی ہیں۔ پرل ہاربر میں بھی ایسی ہی چند غلطیاں کی گئیں اور پانچوں کے پانچوں مواقع ضائع کر دیے گئے۔

سب سے پہلا موقع حملے سے ایک روز پیشتر شام کو ساڑھے چھ بجے امریکیوں کو قدرت نے مہیا کیا تھا جب کہ جاپانی طیارے پرل ہاربر سے قریباً پانچ سو میل کے فاصلے پر تھے۔ شام کا وقت تھا۔ سورج غروب ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ بحریہ کا

انٹیلی جنس آفیسر لیفٹیننٹ کرنل جارج بک نل گھبراہٹ کے عالم میں لیفٹیننٹ جنرل والٹر شارٹ، کمانڈر جنرل کے پاس ایک انتہائی دلچسپ پیغام لے کر آیا۔ فیڈرل بیورو آف انوسٹی گیشن (ایف، بی، آئی) کے ارکان نے ٹوکیو اور ہونالولو کے درمیان ٹیلیفون پر ایک کال سنی تھی۔ ٹوکیو سے بولنے والے نے دراصل ہونالولو کے جاسوس سے امریکی جہازوں، سرچ لائٹ، طیاروں اور موسم کے بارے میں معلومات دریافت کی تھیں ——— لیکن یہ تمام گفتگو خفیہ اشارات میں اس طرح ہوئی تھی کہ امریکی ٹیلیفون آپریٹروں کو حیرت ہونے لگی کہ اس گفتگو کا آخر مقصد کیا ہے؟

ٹوکیو سے پوچھا گیا ——— "سناؤ ہونالولو میں موسم بہار کیسا ہے؟ پھول کون کون سے اُگے ہوئے ہیں" ؟ اور ہونالولو سے بولنے والے نے جواب دیا تھا ——— "سارے سال میں صرف چند ہی پھول اُگے ہیں۔ بس دو تین قسمیں ہیں۔ ...."

اسی قسم کی گفتگو تھی ——— دونوں آفیسر کافی دیر تک مغز ماری کرتے رہے کہ ٹوکیو سے کسی شخص نے ہونالولو محض اس لیے فون کیا تھا کہ وہ پھولوں کے بارے میں معلومات چاہتا ہے؟ اور اگر اس کے پسِ پردہ کوئی سازش ہے تو یہ انتہائی بے پروائی کی علامت ہے۔ کیونکہ ایسے اشارات تو فوراً ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اس بات کو آج بیس برس گزر چکے، لیکن اب بھی امریکی فوجی افسروں میں ٹوکیو کی اس پراسرار ٹیلیفون کال پر اکثر بحث ہوتی ہے۔ بہرحال جنرل شارٹ نے ایک گھنٹے تک اپنے سٹاف کے آدمیوں سے بحث مباحثہ کرنے کے بعد ایک قطعی النسانی فیصلہ صادر کیا۔

اس نے کہا اس میں کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوتی۔ محض ہمارا وہم ہے۔

دوسرا موقع اگلے روز صبح تین بج کر ۴۲ منٹ پر ملا۔ جبکہ جاپانی طیارے پرل ہاربر سے ۲،۵ میل دور تھے اس وقت امریکہ کے سرنگ صاف کرنے والے جہاز کونڈور نے پرل ہاربر کے باہر ایک آب دوز کشتی دیکھی تھی۔ اس نے فوراً گشت کرنے والے تباہ کن جہاز "وارڈ" کو اطلاع دی۔ وارڈ فوراً اس کشتی کی تلاش میں نکلا۔

لیکن ایک گھنٹے کی تلاش کے باوجود اس کا سراغ نہ لگا سکا۔

"کونڈور" سے ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ اس نے فوراً یہ کشتی دیکھے جانے کی اطلاع ہیڈکوارٹر کو نہیں دی۔ کیونکہ اس کے سپیکر کا خیال تھا کہ شاید اسے وہم ہوا ہے۔ کیونکہ ایک گھنٹے کی تلاش کے باوجود "وارڈ" والوں کو اس کا پتا نہیں چلا تھا۔ ادھر "وارڈ" نے بھی ہیڈکوارٹرز کو اطلاع نہیں دی۔ اس لئے کہ "کونڈور" نے بھی نہیں دی تھی —— اور اس کی رائے میں یہ کام تو کونڈور ہی کا تھا کہ وہ اطلاع کرتا چونکہ اسی نے پہلے پہل کشتی دیکھی تھی۔ اسی طرح بحریہ کے ریڈیو سٹیشن نے بھی ہیڈکوارٹرز کو مطلع نہیں کیا چونکہ اس کے خیال میں "وارڈ" اور "کونڈور" نے بھی اطلاع نہیں دی تھی اور بہرحال یہ کام تو ان دونوں جہازوں کا تھا —— اور اس طرح یہ موقع بھی ضائع گیا۔

صبح ساڑھے چھ بجے تیسرا موقع ملا۔ جبکہ جاپانی طیاروں کا بیڑا ۱۸۰ میل دور تھا۔ اور پرل ہاربر کے باہر "وارڈ" نے ایک عجیب سی آبدوز کشتی کا مستول دیکھا۔ وارڈ نے اس کا تعاقب کیا اور پھر فائرنگ شروع کر دی۔ اور اسے غرق کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وارڈ کی مدد بحریہ کے ایک ہوائی جہاز نے بھی کی۔ جب یہ کشتی غرق ہو گئی تو "وارڈ" اور طیارے کے آپریٹروں نے ساحل کو اطلاع دی کہ ممنوعہ سمندر میں ایک آبدوز کشتی کو غرق کر دیا گیا ہے۔

ساحلی آفیسروں کے لیئے یہ اطلاع حیرت انگیز تھی۔ اِدھر اُدھر ٹیلیفون کھڑکنے لگے کہ آخر اس حرکت کا مقصد کیا ہے؟ ایسا کیوں ہوا؟ کیا یہ سچ ہے؟ کیا یہ غلط ہے؟ انہوں نے فیصلہ کیا کہ شاید یہ کوئی امریکی آبدوز کشتی ہو گی جسے غلطی سے غرق کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے فوراً "وارڈ" کو حکم بھیجا کہ وہ مزید کوئی اقدام نہ کرے۔ بلکہ حالات کا رخ دیکھتا رہے۔

چوتھا موقع صبح سات بجے ملا جبکہ جاپانی طیارے بندرگاہ سے ۱۲۷ میل دور تھے۔ اوپانا راڈر سٹیشن پر فوجی پرائیویٹ آفیسروں نے سکرین پر بجلی کی زبردست لہریں دیکھیں —— یہ لہریں اتنی طاقتور تھیں کہ پہلے کبھی محسوس نہیں کی گئی تھیں۔

وہ سمجھے کہ شاید مشین میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے یا یہ ٹوٹ گئی ہے، لیکن انہیں جلد ہی محسوس ہو گیا ہے کہ یہ بات نہیں تھی —— بلکہ طیاروں کا ایک زبردست بیڑہ ہے جو تیزی سے جزائر ہونالولو کی طرف پرواز کر رہا ہے۔ انہوں نے فوراً فوجی مرکز اطلاعات کو فون کیا۔ اور وہاں ایک نوجوان لیفٹیننٹ ڈیوٹی پر تھا اور جسے زندگی میں پہلی مرتبہ راڈر مشین سے واسطہ پڑا تھا۔ اور اس کو قطعاً اس کام کا تجربہ نہ تھا۔ اس کے افسرانِ اعلیٰ اس روز رخصت پر تھے اور اس کے ماتحت افراد ناشتا کرنے باہر گئے ہوئے تھے۔ لہٰذا یہ نازک معاملہ ایک ناتجربہ کار نوجوان کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔ جو ایک معمولی سپاہی کی مانند بے یار و مددگار تھا، لیکن اسے یاد آیا کہ جب وہ صبح چار بجے اپنی کار میں ڈیوٹی پر آ رہا تھا تو اس نے کار کے ریڈیو پر ہوائی موسیقی کے ریکارڈ سنے تھے اور تب اسے یاد آیا کہ جہاز جب کیلیے فورنیا سے گزر کر اس طرف آ رہے تھے تو پھر بھی تمام رات ریڈیو سے ہوائی موسیقی کے ریکارڈ نشر ہوئے تھے۔ پس اس نے فیصلہ کر لیا کہ یہ امریکی جہاز ہیں۔ چنانچہ اس نے فوراً راڈر اسٹیشن کے آفیسروں سے کہا۔

"ان طیاروں کے متعلق آپ فکر نہ کریں۔ یہ امریکی طیارے ہیں۔"

چنانچہ راڈر والے اطمینان سے ان طیاروں کی رفتار نوٹ کرتے رہے۔ سوا سات بجے وہ ۹۲ میل دور تھے ۷-۲۵ پر ۶۲ میل اور آخر ۷-۳۹ پر طیاروں کا رابطہ راڈر سٹیشن سے ٹوٹ گیا۔ چونکہ وہ اتنے نزدیک آ گئے تھے کہ مشین انہیں گرفت میں نہیں لے سکتی تھی۔ عین اس وقت جب جاپانی طیارے پرل ہاربر پر منڈلا رہے تھے ہونالولو کے تار گھر سے پیغام رساں ایک لڑکا باہر نکلا۔ جس کے پاس کمانڈنگ جنرل کے نام ایک "کمرشل تار" تھا۔ اور یہ تار ڈیڑھ گھنٹہ پیشتر واشنگٹن میں جنرل جارج مارشل نے تحریر کیا تھا۔ چونکہ جنرل مارشل کو اسی وقت یہ معلوم ہوا تھا کہ جاپان نے امریکہ سے کیئے گئے تمام وعدے اور معاہدے توڑ دیے ہیں اور سفارتی تعلقات بھی منقطع کر لیے ہیں اور اس فیصلے سے امریکہ کے سٹیٹ سیکرٹری

کو مطلع کرنے کے لئے واشنگٹن ٹائم کے مطابق ایک بجے کا وقت مقرر کیا گیا ہے اور حساب لگایا گیا تو علم ہوا کہ جب واشنگٹن میں دوپہر کا ایک بجے گا تو پرل ہاربر میں صبح کے ساڑھے سات بجیں گے۔ چنانچہ جنرل مارشل نے پہلے سوچا کہ وہاں "وارننگ" بھیجی جائے۔ اس نے فوراً کاغذ پر پیغام تحریر کیا، لیکن اپنی میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھانے کی زحمت گوارا نہ کی، حالانکہ ٹیلی فون سے ہونالولو تک براہِ راست رابطہ قائم تھا۔ اور یہ ایک انسانی خطا تھی جو اس سے سرزد ہوئی۔ اس نے خدشہ محسوس کیا کہ ٹیلی فون پر گفتگو دشمن کے کانوں تک پہنچ جائے گی لہٰذا یہ انتہائی اہم پیغام ریڈیو کے ذریعے بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا اس روز فضائی حالت بڑی ابتر تھی، اور اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ یہ پیغام فضائی لہروں کی گڑبڑ کی نذر ہو جائے گا۔

اور اس خدشے سے پیغام کو محفوظ رکھنے کے لیے مواصلاتی افسروں نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے "تجارتی تار" کے طور پر بھیج دیا جائے۔ اور اس طرح یہ نہایت اہم تار جسے چند منٹ کے اندر اندر ہونالولو پہنچنا چاہیئے تھا، ذرا سی غفلت سے ۱۲ گھنٹے بعد ہونالولو پہنچا حتیٰ کہ ان لوگوں نے تار کے لفافے پر بھی "بہت ضروری" کے الفاظ تحریر کرنے مناسب نہیں سمجھے۔

چنانچہ تار گھر سے جب پیغام رساں لڑکا باہر نکلا تو صبح کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ چند منٹ تک تو وہ گلیوں میں کھڑے ہوئے لڑکوں سے گپ شپ ہانکتا رہا اور پھر جونہی وہ تار سنبھال کر اپنی سائیکل پر چلنے کے لیے تیار ہوا تو اس کی نظر جاپانی طیاروں کے ایک زبردست بیڑے پر پڑی جو پرل ہاربر کو تباہ کرنے کے لیے چلے آ رہے تھے۔ اور ابھی یہ تار مرکز میں نہ پہنچا تھا کہ طیاروں نے آگ اور دھوئیں کا کھیل شروع کر دیا۔

ایک حادثہ

یہ نومبر ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے۔ اتحادیوں کا ایک باربردار طیارہ گرین لینڈ کے برفانی علاقے میں گر گیا۔ وائرلیس پر خطرے کا ایک کمزور سا اشارہ موصول ہوا اور ایک ہوائی دستہ اس کی تلاش میں اڑا۔ کپتان ارمانڈ مانٹی ورد کو وائرلیس کے ذریعے مطلع کیا گیا کہ وہ بھی اپنا فلائنگ فورٹرس طیارہ لے کر اس بدقسمت طیارے کی تلاش میں حصّہ لے۔ تین دن تک ان طیاروں نے چپّہ چپّہ چھان مارا، لیکن گم شدہ طیارے کا کوئی سراغ نہ ملا۔

گرین لینڈ کا یہ علاقہ بالکل ویران ہے اور چاروں طرف برف ہی برف پھیلی ہوئی ہے۔ ہر رخ سے یہ خطّہ سمندر کی طرف ڈھلوان ہے، اس لیے گلیشیر سمندر کی طرف کھسکتے رہتے ہیں اور اسی وجہ سے سمندر کی سطح پر بڑی بڑی مہیب دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ ان دراڑوں پر برف کی ہلکی سی تہ جم جائے تو پھر یہ بے حد خطرناک ہو جاتی ہیں۔ جونہی اس نازک حصّے پر کسی کا پیر پڑتا، سطح ٹوٹتی اور وہ اتھاہ گہرائی میں غائب ہو جاتا۔ یہ دراڑیں گلیشیر کی مسلسل حرکت کی وجہ سے بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔

جب طیارہ گرا تو اس علاقے میں دودھیا رنگ کی دبیز کہر پھیلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے زمین کے نشیب و فراز نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایسی حالت میں بدنصیب طیارے کا کیا پتا چلتا۔ فلائنگ فورٹرس طیارے کا پائلٹ اس کہر آلود فضا سے بلندی

پر اپنے جہاز کو بڑے اطمینان سے اڑا رہا تھا۔ اوپر صاف نیلا آسمان تھا اور نیچے سفید کہر ایک جمے ہوئے سمندر کی طرح نظر آتی تھی۔ پائلٹ نے زمین کو اچھی طرح دیکھنے کے لیے طیارہ اور نیچے کیا، لیکن وہ اس کہر کی وجہ سے صحیح بلندی کا اندازہ نہ لگا سکا۔ اس وسیع میدان میں کہیں کہیں برفانی تودے سطح زمین سے سر اٹھائے کھڑے تھے۔

یکایک جہاز کو زبردست دھچکا لگا۔ اس کا بایاں بازو ایک تودے سے ٹکرا گیا اور گڑگڑاہٹ کی سی آواز آئی۔ لیفٹیننٹ بل اوہارا نیوی گیٹر اپنی نشست سے اچھل کر گر پڑا اور سارجنٹ پال کھڑکی کے شیشے سے ٹکرا کر باہر برف پر جا گرا۔ اس کی دونوں کلائیاں ٹوٹ گئیں اور وہ نیم بے ہوش ہو گیا۔ اس کے قریب ہی سارجنٹ اے۔ سی۔ ربلیسٹ چیت پڑا تھا۔ وہ پلاسٹک کی چھت کو توڑتا ہوا باہر آن گرا۔ ایک اور ہوا باز ریڈیو کے شکستہ کمپارٹمنٹ سے گھسٹتا ہوا نکلا، لیکن باہر کا منظر دیکھ کر اس کے ہوش اُڑ گئے۔ طیارہ جس تودے سے ٹکرایا تھا، اس کے قریب ہی ایک عمیق دَرہ اپنا منہ کھولے ہوئے جہاز کو نگلنے کے لیے تیار تھا۔ طیارے کی دم کے پاس ایک اور دراڑ پھیلتی جا رہی تھی اور طیارہ آہستہ آہستہ درّے کی طرف پھسل رہا تھا۔

اس خوفناک ٹکر کے بعد عملے کے افراد کو جب ہوش آیا تو سب سے پہلے انہوں نے اپنے دو زخمی ساتھیوں کو اٹھایا اور ٹوٹے ہوئے جہاز کے اندر لے آئے تاکہ سرد ہوا اور برف سے بچاؤ ہو سکے۔ انہوں نے راشن اور کمبل جو باہر برف پر بکھر گئے تھے، جلدی جلدی سمیٹے۔ اس عجلت میں لیفٹیننٹ او ہارا نے خیال نہیں کیا کہ برف اس کے بوٹوں کے اندر داخل ہو گئی ہے۔ اس چھوٹی سی بھول کی قیمت اسے بڑی مہنگی پڑی۔

وائرلیس سیٹ ٹوٹ چکا تھا۔ اب ان کے پاس اسٹوو تھا اور نہ روشنی کا سامان۔ موسم بے انتہا خراب ——— قطب شمالی کے اس خطّے سے یہ سب ناواقف تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ جس جگہ یہ حادثہ ہوا ہے، وہ جگہ ہے کون سی اور وہاں سے

قریبی امدادی کیمپ کتنی دُور ہے؟

"یہ تجربہ میرے اور تمہارے لیے بالکل نیا ہے"، کپتان مانٹی ورد نے کہا، "قانون کے مطابق میں تمہارا انچارج ہوں، لیکن تم لوگ مجھے اپنی رائے دے سکتے ہو تاکہ ہم بچاؤ کے طریقے سوچ سکیں ——— اب سب کو مل کر کام کرنا ہے، ورنہ زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا۔"

سب سے پہلے انہیں منجمد کر دینے والی ہواؤں سے بچنا تھا۔ انہوں نے ترپال کے ٹکڑوں سے جہاز کے ٹوٹے ہوئے حصّے اچھی طرح ڈھک دیے۔ پیراشوٹ اپنے جسموں پر اچھی طرح لپیٹ لیے تاکہ جسم گرم رہ سکیں، لیکن پھر بھی برف کے باریک ذرّات جہاز کے ہر سوراخ اور درز سے اُڑ اُڑ کر اندر آ رہے تھے۔ فضا میں اس قدر دُھند تھی کہ بمشکل پانچ گز کے فاصلے تک نگاہ جاتی تھی۔ ایسی صورت میں تلاش کرنے والے طیّارے انہیں پا ہی نہیں سکتے تھے۔ یہ لوگ تین روز تک امدادی پارٹی کا انتظار کرتے رہے اور اس دوران برف سے گلتی ہوئی انگلیوں سے وائرلیس سیٹ کی مرمّت کرتے رہے۔

جب موسم کسی قدر صاف ہوا تو انہوں نے اِرد گِرد کا جائزہ لیا۔ پوزیشن بڑی مایوس کُن تھی۔ طیّارہ برف میں دھنس چکا تھا، اس لیے فی الحال اس کے پھسل کر نزدیکی غار میں گر جانے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ ان کے چاروں طرف برفانی سطح پر ناقابلِ عبور دراڑیں پھیلی ہوئی تھیں اور جہاں تک نظر جاتی، برف کا ایک بے کراں سمندر نظر آتا تھا۔ ایسی خطرناک جگہ پر امدادی طیّارے کے اترنے کی کوئی اُمید نہ تھی اور کسی پھسلنے والی گاڑی کے وہاں تک آنے کے امکانات بھی کم تھے۔ لمبی چوڑی اتھاہ دراڑیں چاروں طرف منہ پھاڑے انہیں نگلنے کے لئے تیار تھیں اور یہ سب اس جال میں پھنس کر بے بس اور مجبور ہو چکے تھے۔

کپتان اور ہارا نے حساب لگایا کہ وہ نزدیکی بچاؤ کے کیمپ سے تقریباً پچیس میل دُور ہیں۔ تلاشِ بسیار اور جستجو کے بعد انہیں ایک طرف سے مخدوش سا راستہ

ملاجوان ورائٹ مل کی نرد سے باہر تھا۔ کپتان اوہارا اور لیفٹیننٹ اسپنسر نے فیصلہ کیا کہ کسی نہ کسی طرح اس طرف سے نکل کر پیدل ہی بچاؤ کے کیمپ تک پہنچنا چاہیئے، ورنہ سب کے سب ٹھٹھر کر مرجائیں گے۔ انہوں نے اپنا سفر شروع ہی کیا تھا کہ ایک اور حادثہ پیش آیا۔

اوہارا آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کے عقب میں اسپنسر تھا۔ وہ طیارے سے صرف سوگز دُور گئے ہوں گے کہ اسپنسر کہنے لگا، "میرے خیال میں یہ برف ــــــ" اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اوہارا نے پلٹ کر دیکھا، اسپنسر غائب تھا اور اس کی جگہ ایک عمیق گڑھا منہ پھاڑے نظر آیا۔ اوہارا کا جسم دہشت سے سُن ہوگیا۔

اس نے پیٹ کے بل کھسک کر اس گڑھے میں جھانکا۔ نیلگوں برف اس کے اندر دُور تک نظر آئی۔ وہ قطعی نااُمید ہوگیا، کیوں کہ اسپنسر کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ دیر تک گڑھے میں تکتا رہا۔ یکایک گہرائی میں اسے یوں نظر آیا کہ اسپنسر ایک چٹان سے ٹکرا کر رُک گیا ہے اور ہاتھ پیر پھیلائے پڑا ہے۔ اوہارا نے دوسرے افراد کو مدد کے لیے پکارا۔ انہوں نے پیراشوٹ کی رسیّوں سے ایک مضبوط رسّا بنایا اور اسے اس گہرے کنوئیں میں لٹکا دیا۔ بڑی احتیاط سے آہستہ آہستہ کھسک کر اسپنسر نے رسّے کا ایک پھندا اپنی کلائی میں باندھا۔ اس کے بعد دوسرا پھندا اپنی کمر میں باندھا۔ ساتھیوں نے اسے کھینچنا شروع کیا اور ایک ایک فٹ کر کے وہ اسے تقریباً سو فیٹ اوپر کھینچ لائے اب ایک اور مصیبت آن پڑی۔ اس گہرے کنویں کا منہ چھوٹا تھا۔ برف کی ایک چٹان آگے جھکی ہوئی تھی۔ اسپنسر کو کھینچنے کے دوران برف کی چٹان رسّے سے کٹ گئی اور اب اسپنسر عین اس چٹان کے نیچے آکر رُک گیا۔ اسے مزید اوپر نہیں کھینچا جا سکتا تھا، کیوں کہ سر پر لٹکی ہوئی برف کی چٹان آڑے آتی تھی۔ جلد ہی جلد ہی سب نے مشورہ کیا اسپنسر کو تھوڑا اور نیچے لٹکا دیا جائے تاکہ وہ چٹان سے کسی

قدر دُور ہو جائے۔ ایک رسّی میں چھرا باندھ کر اسپنسر کے پاس پہنچایا گیا۔ اس چھرے کی مدد سے اسپنسر نے آہستہ آہستہ وہ چٹان کاٹی جو اس کے اوپر آنے کا راستہ روکے ہوئے تھی اور آخر ساتھیوں نے اسے باہر کھینچ لیا۔

اب یہ پارٹی تھکی ہاری پھر طیارے پر واپس آگئی۔ برفانی طوفان دوبارہ اپنے عروج پر آگیا۔ اوہارا کا پیر برف سے زیادہ متاثر ہو کر سخت ہو گیا۔ مانٹی ورد کئی گھنٹے تک اس کے پیر کو اپنے سینے سے لگائے رہا تاکہ گرمی سے آرام پہنچے۔ کسی قدر آرام تو ملا، لیکن اوہارا چلنے پھرنے کے ناقابل ہو گیا۔ اس دوران ایک بات قابلِ تسکین ضرور ہوئی کہ ریڈیو آپریٹر نے شکستہ ریڈیو کو اس قابل بنا دیا کہ اس سے "خطرے" کا سگنل بھیجا جا سکے اور تباہ حال طیارے کی پوزیشن بتائی جا سکے۔ انہوں نے بم سائٹ کیس سے ایک اسٹوو بھی بنا لیا جو زیادہ مفید تو نہ تھا؛ تاہم ان کی منجمد خوراک کو حرارت پہنچا کر کھانے کے لائق ضرور بنا دیتا تھا۔

تاریک اور بھیانک راتیں گزرتی گئیں۔ یہ سب ایک دوسرے سے چپکے لاشوں کی مانند پڑے رہے۔ طوفانی ہواؤں کے دباؤ سے طیارے کی کیلیں ٹوٹنے کی وحشت ناک آوازیں آتی رہتیں۔ رفتہ رفتہ طیارے کا پچھلا دھڑ اگلے حصّے سے علیحدہ ہو کر گڑھے کی طرف پھسلنے لگا۔ انہوں نے لسے رسیوں اور تار سے باندھا، لیکن نیچے سے برف کی سطح حرکت میں تھی۔ اس لیے کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ اس موقع پر ریڈیو سگنل آنے شروع ہو گئے۔ ان کے پژمردہ چہروں پر اطمینان کی جھلک آئی کہ باہر کی دنیا نے ان کا پیغام سُن لیا ہے۔ اور اب توقع ہے کہ امدادی پارٹی جلد آجائے گی۔

حادثے کے چودہ روز بعد انہیں ایک طیّارہ دکھائی دیا۔ یہ لوگ خوشی سے دیوانے ہو گئے اور باہر نکل کر ہاتھ ہلانے اور چیخنے چلّانے لگے تاکہ کسی طرح جہاز والے انہیں دیکھ لیں۔ انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ اس وقت ایک سو ستّر میل فی گھنٹے کی رفتار سے طوفان آنے والا تھا۔ طیّارے نے انہیں دیکھ لیا اور پیراشوٹ

کے ذریعے عام اشیا کی چیزوں کے بنڈل نیچے گرائے۔ اس دوران طوفان زوروں پر آگیا اور سارے کے سارے پیراشوٹ اڑکر عمیق دروں میں غائب ہو گئے انہیں بڑی مایوسی ہوئی صرف چند چیزیں جو بغیر پیراشوٹ کے گرائی گئی تھیں، وہی مل سکیں۔ ان میں سے ایک چیز بہت کار آمد تھی اور یہ آئل اسٹو تھا، لیکن اس میں جلانے کے لیے مناسب ایندھن ان کے پاس نہ تھا، چنانچہ دوسری بار پٹرول کا ٹین اوپر سے گرایا گیا۔ بدقسمتی سے نیچے گرتے ہی کنستر ٹوٹ گیا اور سارا پٹرول ضائع ہو گیا۔ پھر بھی یہ لوگ پُراعتماد تھے کہ اب امدادی پارٹی کو اطلاع مل چکی ہے اور وہ جلد ہی انہیں کسی نہ کسی طرح بچائے گی۔ کاش انہیں اندازہ ہوتا کہ ابھی انہیں مہینوں سختیاں جھیلنی پڑیں گی، پھر کہیں اس برفانی قید سے چھٹکارا ملے گا۔

امدادی کیمپ سے کتوں کی ایک برف گاڑی روانہ کی گئی، لیکن اسے واپس ہو جانا پڑا۔ جگہ جگہ برف اتنی کچی تھی کہ گاڑی کے دھنس جانے کا خدشہ تھا۔ اب دو آدمی موٹر سلیج لے کر روانہ ہوئے۔ یہ پہلے آدمی تھے جنہوں نے موسم سرما میں اس برفانی علاقے میں موٹر سلیج استعمال کی۔ ان کے بڑھنے کی رفتار بہت کم تھی۔ لیفٹیننٹ مکس ڈمارسٹ قطب شمالی کی مہم کا تجربہ کار افسر تھا۔ وہ "اسکی" پر آگے آگے چلتا رہا تاکہ اطمینان کر سکے کہ برف کی تہ موٹر سلیج کا بوجھ سنبھالنے کے قابل ہے یا نہیں۔ پیچھے پیچھے اسٹاف سارجنٹ ٹٹلے موٹر سلیج سنبھال سنبھال کر لاتا رہا۔ اس طرح بڑھتے بڑھتے وہ تباہ شدہ طیارے کے قریب ایک میل تک آ گئے۔ یہاں سے آگے موٹر سلیج لے جانے کا راستہ نہ تھا، لہٰذا وہ اپنی اپنی اسکی پر آگے بڑھے اور طیارے تک پہنچ گئے۔ عملے نے ان کا پرجوش استقبال کیا ـــــ بڑی خوشیاں منائی گئیں اور اس رات شاندار ضیافت ہوئی۔ پھر ایک مرتبہ انہیں یقین ہو گیا کہ مصیبت کے ایام ختم ہوا ہی چاہتے ہیں، لیکن تقدیر کھڑی ہنس رہی تھی۔

دوسری صبح لیفٹیننٹ ڈمارسٹ اپنی اسکی پر واپس ہوا تاکہ موٹر سلیج سے مزید امدادی سامان لے آئے۔ ایک جگہ اس نے اپنا راستہ تبدیل کرنا چاہا تاکہ مختصر راستے

سے سطح تک جلد پہنچ جائے۔ واسکی، نے راستہ بدلا ہی تھا کہ دوسرے لمحے واسکی، اور لیفٹیننٹ ڈمارسٹ دونوں نظروں سے غائب ہو گئے۔ برف کی کم زور تہ ٹوٹ گئی اور بدنصیب ڈمارسٹ ایک عمیق دراڑ میں گر گیا۔ فوراً ہی سارجنٹ ٹٹلے جائے حادثہ پر پہنچا۔ اس درزے میں جھانک کر دیکھنے سے کئی سو فیٹ نیچے گہرائی میں واسکی، کا ایک حصہ نظر آیا، لیکن غریب ڈمارسٹ کا کچھ پتا نہ تھا۔ بڑی آوازیں دیں، لیکن کوئی جواب نہ آیا۔

اسی روز ایک اڑن کشتی اس خطے پر اُتری اور عملے کے دو زخمی جوانوں کو لے کر اُڑ گئی۔ پھر نہ یہ اڑن کشتی اپنے مستقر پر پہنچی اور نہ اس کے عملے کا کوئی سراغ ملا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اُڑن کشتی دُھند کی وجہ سے ایک پہاڑی سے ٹکرا کر تباہ ہو گئی تھی۔

اس کے بعد پھر قطب شمالی کی طوفانی ہواؤں کا زور شروع ہوا۔ طوفان کی غضب ناکی سے ایک موٹر سلیج بھی برف میں دھنس گئی۔ دن گزرتے گئے اور موسم خراب تر ہوتا گیا۔ اس جگہ ٹٹلے سمیت کُل سات آدمی بچے تھے۔ موسم کی مسلسل خرابی سے یہ اندیشہ ہو چلا تھا۔ کہ شاید انہیں پورا موسم سرما اسی جگہ کاٹنا پڑے گا۔ ایسی حالت میں بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

ٹٹلے نے طیارے کے عملے کو اسکیمو اِگلو (برف کے مکان جو برف کی چٹانوں سے بنائے جاتے ہیں) بنانے سکھائے۔ انہوں نے سخت برف کی بڑی بڑی چٹانیں کاٹیں اور طیارے کے ٹوٹے ہوئے ڈھانچے کے اندر اِگلو بنایا تاکہ برفانی ہواؤں سے بچاؤ ہو سکے اور طویل عرصے تک خراب موسم سے محفوظ رہ سکیں۔ بیسٹ نے باورچی کی ڈیوٹی سنبھالی۔ مانٹی وردا اور کو پائلٹ اسپنسر نے سامان کے ان بنڈلوں کو ڈھونڈنے کی ذمے داری لی، جو امدادی طیارے سے پھینکا گیا تھا اور طوفان کی وجہ سے گم ہو گیا تھا۔ اوہارا اپاہج ہو چکا تھا تاہم اس نے اپنے ذمے چائے اور چینی صاف کرنے کا کام لے لیا۔ یہ چائے اور چینی پیراشوٹ سے پھینکتے وقت بنڈل پھٹ جانے سے خلط ملط ہو چکی تھی اور جب تک اسے صاف نہ کیا جاتا استعمال نہ کی جا سکتی تھی۔

اس دوران اسپنا جس کی کلائی ٹوٹ گئی تھی، کسی قدر اچھا ہو گیا۔ اسسٹنٹ انجینیر، ویڈل اپنے شکستہ ریڈیو کی مرمّت میں لگا رہتا تھا۔ آخر کار وہ ساحلی دستے سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ گفتگو سے پتہ چلا کہ امداد کی ہر ممکن کوشش موسم کی خرابی کی وجہ سے ناکام ہو چکی ہے۔

دو ہفتے اور گزر گئے۔ اوہارا کا پیر خراب ہوتا گیا۔ سب جانتے تھے کہ اگر علاج میں مزید تاخیر ہوئی تو انجام کیا ہوگا۔

دسمبر کا مہینہ آیا اور ایک روز مطلع بالکل صاف اور پرسکون ہو گیا۔ ٹٹلے نے تجویز پیش کی کہ اوہارا کو وہ اپنی موٹر سلیج میں لے کر امدادی کیمپ پہنچانا چاہتا ہے تاکہ جلد سے جلد علاج ہو سکے۔ موسم خوش گوار تھا۔ سب نے یہ تجویز پسند کی۔ اوہارا کو اس کے سلیپنگ بیگ میں اچھی طرح لپیٹ کر بڑے آرام سے سلیج میں لٹا دیا گیا۔ اسپنسر برف میں پھسلنے والے جوتے پہن کر آگے آگے بڑھا تاکہ چھپے ہوئے درزوں اور دراڑوں کی نشان دہی کر سکے۔ ٹٹلے نے سلیج اسٹارٹ کی۔ ویڈل، سلیج کے عین عقب میں چلتا رہا۔ ان تمام احتیاطوں کے باوجود وہ دو میل سے زیادہ آگے نہ جا سکے۔

ایک جگہ زمین کسی قدر ابھری ہوئی تھی اور راستے میں برف کا چھوٹا سا ٹیلہ بن گیا تھا۔ ٹٹلے نے اس ٹیلے کو سلیج سے دھکا دیا۔ اتنے میں ویڈل بھی ان کے قریب آ گیا۔ اچانک ویڈل کے قدموں کے نیچے برف کی تہ ٹوٹی۔ ویڈل نے گرتے گرتے سلیج کو پکڑنا چاہا، لیکن ہاتھوں میں پہنے ہوئے سموری دستانوں کی وجہ سے گرفت مضبوط نہ کر سکا اور پھسل کر گہرے غار میں گر گیا۔ اس کے حلق سے ایک دل خراش چیخ نکلی اور پھر اوپر سے منوں برف پھسل کر اس دراڑ میں آہستہ آہستہ گرنے لگی۔ ٹٹلے نے گھبرا کر سلیج کو فوراً ہی دوسری طرف موڑ لیا۔ یہ لوگ ایک گہری دراڑ کے اوپر آ ٹھہرے تھے۔ اتفاق سے ویڈل کے پاؤں کے نیچے سطح بے حد کم زور تھی، اس لیے ٹوٹ گئی۔ اور وہ اس دراڑ میں گر کر دوسرے ہی لمحے نظروں

سے غائب ہوگیا۔ ٹٹلے نے دہشت زدہ نگاہوں سے دراڑ میں جھانکنا شروع کیا، آوازیں لگائیں، لیکن ویڈل اتھاہ گہرائی میں دفن ہو چکا تھا۔

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ سفر جاری رکھا جائے۔ ان کے دل اس جانکاہ حادثے سے بے حد ملول تھے۔ وہ چند میل اور آگے بڑھے کہ سلیج کی موٹر فیل ہو گئی۔ سردی کی وجہ سے موٹر میں لبریکیٹنگ آئل جم گیا اور اس نے ایک پائپ پھاڑ دیا۔ مجبور ہو کر انہوں نے اپنا سفر ملتوی کیا اور عارضی قیام کی تیاری کرنے لگے۔ اتنے میں شدید برف باری شروع ہو گئی۔ ان کی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ وہ وہاں ساٹھ روز تک مزید سختیاں جھیلیں۔

اس دوران بچاؤ کے کیمپ سے کیپٹن کینتھ ٹرنر ایک طیارہ لے کر اڑا تاکہ مزید سامان محصور عملے کو پہنچایا جا سکے۔ جب وہ سامان گرا کر واپس آنے لگا تو اُسے یہ ناکارہ سلیج دکھائی دی۔ کچھ بچا ہوا سامان اس نے یہاں بھی پھینکا۔

یہ موسم سرما قطب شمالی کی تاریخ کا سرد ترین موسم گزرا ہے۔ جوں ہی موسم سازگار ہوتا کیپٹن ٹرنر فوراً خورد و نوش اور دیگر ضروری سامان ان کے پاس پھینک جاتا اور ان کی ہمّت بڑھانے کے لیے طرح طرح کے پیغامات بھی پہنچاتا رہتا۔ اس وقتی امداد سے ان کے حوصلے پست نہ ہوئے۔ امدادی کیمپ والے اس کوشش میں لگے رہے کہ کسی طرح ان لوگوں کو بچایا جائے۔ طرح طرح کی تدبیریں کرتے لیکن موسم کی خرابی اور دشوار گزار علاقے کی وجہ سے ان کی کوئی پیش نہ جاتی اور ہر اسکیم فیل ہو جاتی تھی۔

آخر ناروے کے مشہور مہم باز کرنل برنٹ بالچن اپنی اُڑن کشتی ناکارہ سلیج کے پاس اُتارنے میں کامیاب ہو گئے۔ موسم اس قدر سرد تھا کہ اڑن کشتی کے اترتے ہی اس پر برف کی تہ جم گئی۔ عملے نے بڑی مشکل سے برف صاف کی اور پھر مستقل اس طیارے کو حرکت دیتے رہے تاکہ برف پھر نہ جم جائے۔ اتنے عرصے میں ایک پارٹی سلیج میں روانہ ہوئی اور راوہارا، ٹٹلے اور اسپنسر کو اس طیارے پر لے آئی۔ فوراً ہی انہیں امدادی کیمپ

پہنچایا گیا۔ بدقسمت ادہارا کا پیر اتنا خراب ہو چکا تھا کہ اُسے کاٹنا پڑا، البتہ اسپنسر اور ٹٹلے کی صحت پر اس سختی کا کوئی اثر نہ پڑا۔

اس عرصے میں مانٹ وررد کے ہاتھ سردی سے ناکارہ ہو گئے۔ اسپینا اور بلیسٹ بہتر حالت میں تھے، لیکن ان کی برفانی قید ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ ان کے نیچے سے برف کھسک رہی ہے اور عنقریب وہ اور ان کا کیمپ اس عمیق گڑھے میں گرنے ہی والے ہیں، مگر انہوں نے زندہ رہنے کی جدّوجہد کم نہ کی۔ کپتان ٹرنر نے چونتیس بار اس علاقے پر اڑان کی۔ فروری کے بائیس دن اتنا سخت طوفان رہا کہ ان کی مدد کے لیے کپتان ٹرنر نہ آسکے۔ ان دنوں میں ان کے پاس موم بتّیاں بھی ختم ہو گئیں۔ یہ اپنا منجمد کھانا بغلوں کے نیچے دبا لیتے تاکہ جسم کی گرمی سے وہ اتنا پگھل جائے کہ اسے کھایا جا سکے۔ ایسی مسلسل تکلیف سے بلیسٹ کی دماغی حالت خراب ہو گئی۔

آخر کار رسیلائی کا طیارہ پھر آیا۔ ضرورت کا سامان اور دوستوں عزیزوں کے خطوط کا انبار اس نے پیراشوٹ سے گرایا۔ ان خطوط نے بلیسٹ کی دماغی حالت بڑی حد تک درست کر دی۔

امدادی کیمپ کے لوگ ان ناکامیوں سے مایوس نہیں ہوئے۔ وہ بڑھ چڑھ کر کوشش کرتے رہے۔ ایک دوسری برف گاڑی طیارے سے اس جگہ اتاری گئی۔ جہاں موٹر سلیج خراب ہو گئی تھی۔ دو راتیں سخت سردی میں گزارنے کے بعد بہزار دِقّت بچتے بچاتے آخر کار یہ جائے حادثہ پر پہنچ ہی گئی۔

اور پھر یہ لوگ وہاں سے نکال لیے گئے اور اس طرح برفستان کے قیدی ایک سو تیس دن کی بھیانک قید کاٹنے کے بعد اپنے اپنے مستقر پر زندہ سلامت پہنچ سکے، لیکن اس کے بعد ان میں پرواز کرنے کی ہمت نہ رہی۔
